جولائی 2025

گھر کے ہر فرد کے لیے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

جولائی 2025

قیمت 200 روپے

www.pklibrary.net

ناہید سلطانہ اختر، عفت گل اعزاز و دردانہ نوشین خان کی دلکش تحریریں

غزالہ عزیز کے ناولٹ کا مسحور کن اختتام

اداریہ

مجھے کچھ کہنا ہے — مدیرہ 07

سلسلے وار ناول

اک دیا ہے ہاتھوں — نگہت سیما 10

حوصلہ شرط وفا ٹھہرا — بشریٰ مسرور 140

افسانے

سوالیہ نشان — دُردانہ نوشین خان 31

کردار — مسکان نور 37

چلر جنگ — شمع تفسیر 73

نقب زن — خوشبو بلوچ 77

خسارہ — رخسار احمد 113

اک رشتہ بھائی کا — عظمیٰ زہریٰ 134

اپنے گھر کی چاہ — عفت گل اعزاز 161

ملکہ اور شہزادیاں — مریم شہزاد 170

منی ناول

ساحل — اسما اشرف منہاس 48

ناولٹ

زندگی گلزار ہے — غزالہ عزیز 84

دادی، دادی — ناہید سلطانہ اختر 117

خصوصی مضامین

شمع ہدایت — اختر شجاعت 172

آہ...... سائرہ رضا — نزہت اصغر 179

سروے — شائستہ زریں 183

گھر آنگن کے تارے — بنتِ زیب 188

کچھ تم بھی کہو.... — نزہت اصغر 196

Digest Library.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول ● مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن ● مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

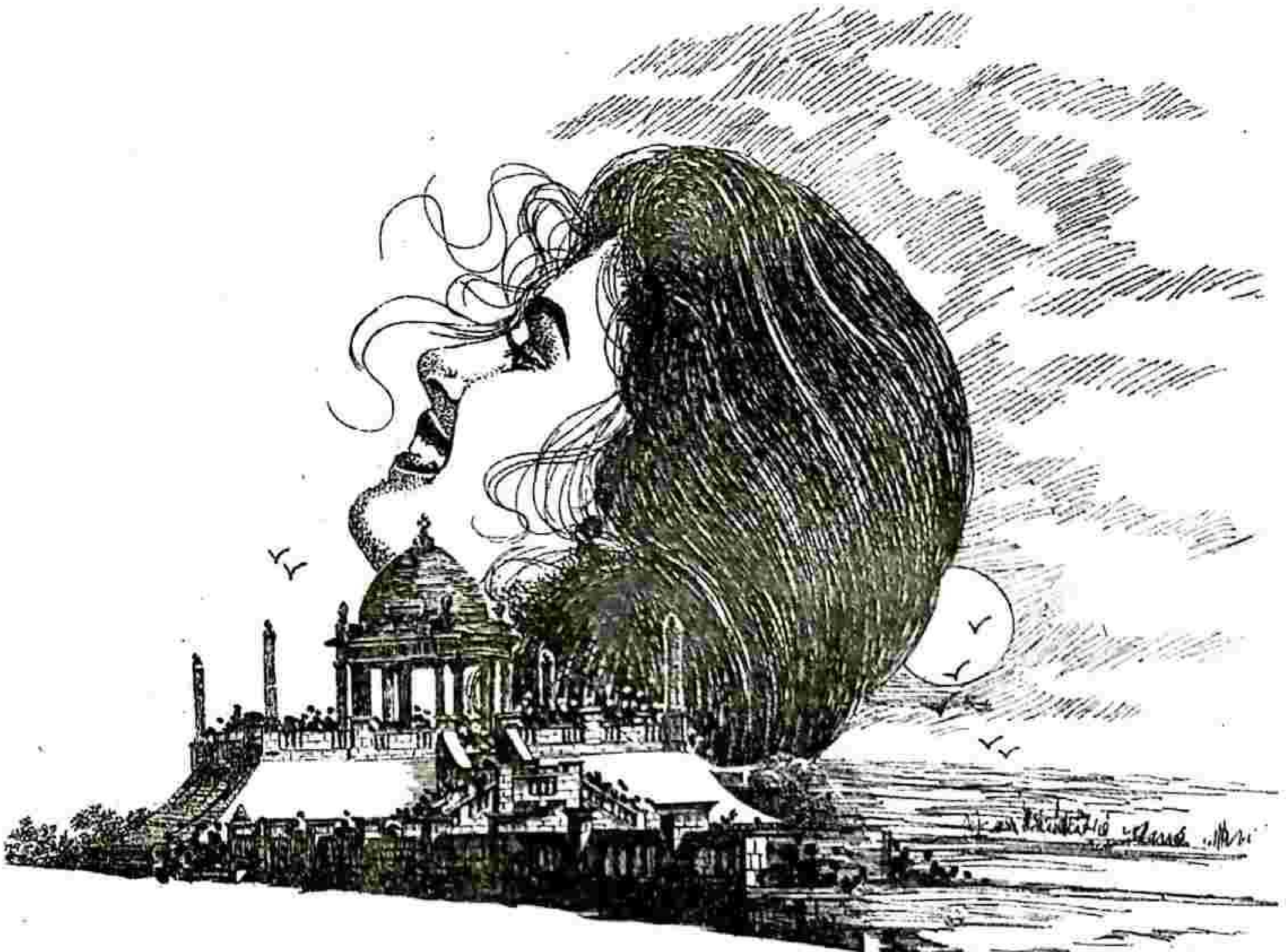

مستقل عنوانات

دین کی باتیں	ادارہ	08	خوش ذائقہ	شگفتہ یاسمین	214
بہنوں کی محفل	مدیرہ	198	بزمِ پاکیزہ	پاکیزہ بہنیں	216
پاکیزہ ڈائری	امہ حماد	208	روحانی مشورے	ادارہ	218
میں اکثر گنگناتی ہوں	صغریٰ زیدی	212	حسن نکھار کے آیئے	مہ جبیں	220

ہومیو کلینک 222

Digest Novels Lovers Group

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: **(021)35804200 ,35802552,** E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مجھے کچھ کہنا ہے!

Digest Lovers Group

قارئینِ کرام...... السلام علیکم

جولائی 2025ء کا ماہنامہ پاکیزہ لیے حاضر ہیں۔

نئے اسلامی سال کا سورج طلوع ہو چکا ہے جو ہمیں اُس لازوال قربانی اور عظیم واقعے کی یاد دلاتا ہے کہ جب معرکہ حق و باطل وقوع پزیر ہوا اور خیر و شر میں واضح امتیاز قیامت تک کے لیے آشکار ہو گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب دینِ الٰہی میں تحریف کی جا رہی تھی۔ حق و باطل کی پہچان مٹائی جا رہی تھی اس کڑے وقت میں اللہ پاک کے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیارے نواسے حضرت امام حسین علیہ السلام نے کربلا کے ریگ زار میں اپنے جانثار اصحاب اور خانوادے کے ہمراہ جام شہادتِ نوش فرما کر اسلام کا پرچم سر بلند رکھا۔ اس عظیم قربانی کو تا قیامت یاد رکھا جائے گا اور یہ معرکہ حق و باطل میں پہچان کا پیمانہ بن گیا۔

اسلامی سال کا آغاز اور اختتام ایثار و قربانی کے اسباق دہراتا نظر آتا ہے اور یہی درسِ انسانیت بھی ہے۔

عام زندگی میں ہم اسلامی قواعد و ضوابط اور تعلیمات کو عملی طور پر شامل کر لیں تو تمام طبقات یکساں مالی اور معاشی طور پر آگے بڑھیں اور محرومیوں کی دلدل میں نہ دھنسیں۔

اللہ پاک ہم سب کا حامی و ناصر ہو...... آمین!

مدیرہ

نزہت اصغر

القرآن الکریم

اسے موسیٰ نے کہا کیا میں تیرے پیچھے، پیچھے اس شرط پر چلوں کہ جو رہنمائی کا علم تجھے سکھایا گیا ہے تو اس میں سے کچھ مجھے بھی سکھا دے۔(۶۶) اس نے کہا یقیناً تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکے گا،(۶۷) اور تو اس چیز پر کیسے صبر کرے گا جو تمہارے احاطہ علمی میں نہیں ہے۔(۶۸) اس نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو تم مجھے صبر کرنے والا پاؤ گے، اور میں تمہارے کسی امر کی نافرمانی نہ کروں گا۔(۶۹) اس نے کہا پھر اگر تجھے میرے پیچھے، پیچھے چلنا ہے تو تم مجھ سے کسی چیز کے بارے میں سوال نہ کرنا جب تک کہ میں خود ہی تجھ سے اس کا ذکر نہ کروں۔(۷۰) پھر دونوں چل پڑے یہاں تک کہ جب وہ دونوں ایک کشتی میں سوار ہوئے تو اس نے اس میں سوراخ کر دیا .... اس نے کہا کیا تو نے اس میں سوراخ اس لیے کیا ہے کہ تو اس کے سواروں کو غرق کر دے (اگر ایسا ہے تو) یقیناً تو نے ایک عجیب کام کیا ہے۔(۷۱) اس نے کہا کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ یقیناً تو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ کر سکے گا۔(۷۲) اس نے کہا کہ جو فرو گزاشتہ مجھ سے ہو گئی ہے اس پر مجھے گرفت نہ کر، اور نہ میرے کام میں مجھ پر سختی کر۔ پھر دونوں چل پڑے(۷۳) یہاں تک کہ جب وہ دونوں ایک لڑکے کو ملے تو اس (خضر) نے اسے قتل کر دیا۔ اس (موسیٰ) نے کہا کہ کیا تو نے ایک پاکیزہ جان کو بغیر کسی جان کے بدلے قتل کر دیا۔ (اگر یہ بے گناہ قتل ہے تو) یقیناً تو نے ایک عجیب بات کی ہے۔(۷۴) (خضر نے) کہا کیا میں نے تمہیں نہیں کہا تھا کہ یقیناً تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔(۷۵) (موسیٰ نے) کہا اگر میں اس کے بعد تم سے کسی چیز کے بارے میں سوال کروں تو تم مجھے (اپنے) ساتھ نہ رکھنا یقیناً میری طرف سے تم معذرت (کی انتہا) کو پہنچ چکے۔(۷۶) پھر وہ دونوں (آگے) چلے گئے یہاں تک کہ جب وہ (ایک) بستی والوں کے پاس پہنچے تو اس کے رہنے والوں سے انہوں نے کھانا مانگا مگر انہوں نے ان دونوں کو مہمان رکھنے سے انکار کر دیا پس انہوں نے اس (بستی) میں ایک دیوار پائی جو گرا ہی چاہتی تھی تو اس (خضر) نے اسے کھڑا کر دیا اس (موسیٰ) نے کہا اگر تم چاہتے تو اس پر کچھ اجرت لے لیتے اس (خضر) نے کہا یہ میرے درمیان اور تمہارے درمیان جدائی ہے۔ لو میں تمہیں ان باتوں کی حقیقت بتائے دیتا ہوں جن پر کہ تم صبر نہ کر سکے۔(۷۸) وہ جو کشتی تھی پس وہ چند مسکین لوگوں کی تھی جو دریا میں (اپنی روزی حاصل کرنے کے لیے) کام کرتے تھے پس میں نے ارادہ کر لیا کہ اسے عیب دار کر دوں اور (یہ اس وجہ سے کیا کہ) ان کے پیچھے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو جبراً چھین لیا کرتا تھا۔(۷۹) اور وہ لڑکا سو اس کے ماں، باپ دونوں ایماندار تھے پس میں ڈرا کہ وہ ان دونوں کو سرکشی اور کفر میں نہ پھنسا دے۔(۸۰) سو ہم نے ارادہ کیا کہ ان دونوں کا پروردگار انہیں پاکیزگی میں اس سے اچھا اور رحمت (مہربانی) میں زیادہ قریب (لڑکا) انہیں بدل دے(۸۱) اور رہی دیوار پس وہ شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان دونوں کے لیے خزانہ (دبا ہوا) اور ان دونوں کا باپ ایک نیک مرد تھا سو تمہارے پروردگار نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی اور عقل و تمیز کو پہنچ جائیں اور وہ خود اپنا خزانہ نکال لیں یہ تیرے پروردگار کی طرف سے رحمت ہے اور میں نے یہ (سب کچھ) اپنے امر سے نہیں کیا۔ یہ ان باتوں کی حقیقت ہے جن پر تم صبر نہیں کر سکے۔(۸۲)

(پارہ ۱۵، ۱۶، سورۃ کہف ۱۸، آیات ۶۶ تا ۸۲)

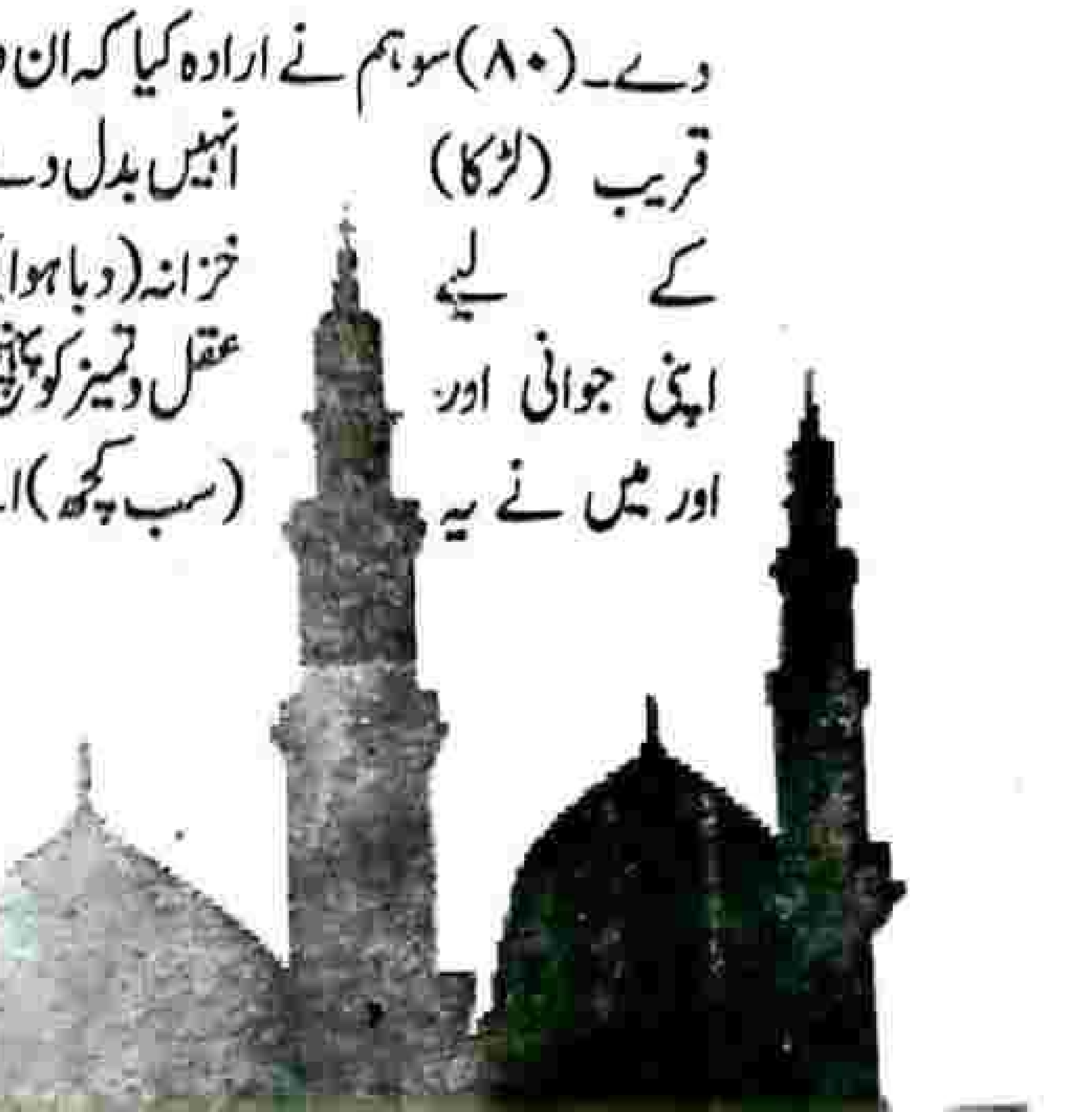

مفاہیم احادیث

عفوودرگزراور

احادیث نبوی ﷺ

Digest Novels Lovers group

☆عفوو درگزر خدا کو بہت پسند ہے۔ رب العزت تو اپنے گناہ گار بندوں کو بھی معاف فرما دیتا ہے بشرطیکہ وہ صدقِ دل سے توبہ کریں اور آئندہ گناہ کی تکرار نہ کریں مگر عام زندگی میں ہم دیکھتے ہیں انسان یہاں (نعوذ باللہ) خدا سے بھی مقابلے پر اتر آتا کہ وہ مقابل کو ہرگز معاف نہیں کرتا اگرچہ زیادتی کا بدلہ صرف اتنی زیادتی کہ جتنی اس کے ساتھ کی گئی ہو مگر معاف کرنا افضل ترین عمل ہے۔ خدا بندے کے عیبوں کی پردہ پوشی فرماتا ہے اور گناہوں کو درگزر کردیتا ہے مگر ہم عاصی بندے کسی کا معمولی قصور بھی بخشنے کو تیار نہیں ہوتے...... کیا یہی ایک مسلمان کا شیوہ ہونا چاہیے......؟ اس بارے میں ہم آیات قرآنی اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح رہنمائی لے سکتے ہیں۔

☆اگر تم کھلم کھلا نیکی کردیا چھپا کر برائی کو معاف کردو تو اللہ بھی معاف کرنے والا قدرت والا ہے......اور (سورۂ حم عسق میں) فرمایا یا برائی کا بدلہ برائی ہے، اس جتنی پھر جو کوئی معاف کردے اور بھلائی کرے اس کو اللہ تعالیٰ ثواب دے دے گا۔

☆اور اللہ تعالیٰ نے (سورۂ نوح میں) فرمایا اپنے مالک سے بخشش مانگو وہ بڑا بخشنے والا ہے تم ایسا کرو گے تو رب کریم آسمان کے دہانے تم پر کھول دے گا اور مال، بیٹے تم کو سرفراز کرے گا اور باغ عطا فرمادے گا اور نہریں عنایت کرے گا اور (سورۂ آل عمران میں) فرمایا بہشت ان لوگوں کے لیے بھی تیار کی گئی ہے جن سے کوئی بے حیائی کا کام ہوجاتا ہے...... یا کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے تو اللہ کو یاد کرکے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں (گناہ پر شرمندہ ہوتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے) اور اللہ کے سوا ہے کون جو گناہوں کو بخشے اور وہ اپنے (برے) کام پر جان بوجھ کر ہٹ نہیں کرتے یعنی اڑے نہیں رہتے۔

(بخاری شریف)

سلسلے وار ناول

قسط نمبر 3

اک دیا ہے ہاتھوں پر

نگہت سیما

Digest Novels Lovers Group

خواب دیکھنا کسے اچھا نہیں لگتا ہر آنکھ خواب دیکھتی ہے ہر انسان کی زندگی میں ایسا موسم ضرور آتا ہے جب ہوائیں پاؤں میں جھانجریں ڈال کر ٹھمک ٹھمک چلتی ہیں تو خواب خودبخود آنکھوں کی دہلیز پر اتر آتے ہیں لیکن ہر آنکھ میں اترنے والا خواب تعبیر نہیں پاتا۔ کچھ خواب بے تعبیر بھی رہ جاتے ہیں۔ کچی عمروں کے وہ خواب جو بے سمت کردیتے ہیں اور منزل کے اختتام پر میٹھے پانی کا چشمہ نہیں ریت کا سراب ہوتا ہے اور زخمی ہاتھوں میں ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں... خشک ہونٹوں پر پیاس کی طلب... اور ویران آنکھوں میں مسافتوں کی تھکن... یہ صرف خوابوں کی کہانی نہیں ہے، یہ انسان کے منفی رویوں کی کہانی بھی ہے جو دلوں کے شفاف آئینوں کو دھندلا کردیتے ہیں اور یہ محبتوں کی کہانی بھی ہے۔ سچی، خالص اور بے ریا محبتیں جو قربانی اور ایثار کا سبق دیتی ہیں اور دلوں کے سیاہ آبگینے اجال دیتی ہیں۔

وہ پارکنگ میں اپنی گاڑی کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے جبکہ سلمان حیدر ان سے دانستہ کچھ اور پیچھے رہ گیا تھا۔

''ہمارا بچہ ایسا کیوں ہے خورشید، اتنا ایگریسو، اس کے اندر یہ اتنا تشدد اتنی نفرت کہاں سے آ گئی۔ ہم نے تو جب سے وہ پیدا ہوا ہے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا ہے۔ ہر ماں، باپ کی طرح ہم نے اسے بہت محبت دی ہے۔ بلکہ شاید عام والدین سے زیادہ۔'' عطیہ حیدر نے دلگرفتگی سے کہتے ہوئے خورشید حیدر کی طرف دیکھا۔ آنکھوں کی سطح نم ہو رہی تھی۔

خورشید حیدر نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر سلمان حیدر کو دیکھنے لگے جو بے پروائی سے ادھر اُدھر دیکھتا گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔ پھر وہ چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ وہ کیوں رکا ہے۔ کیونکہ پہلی بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر اسی طرح کرتا تھا۔ ڈرائیور گاڑی کا دروازہ کھولے مؤدب کھڑا تھا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے خورشید حیدر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئے۔ دروازہ بند کرنے کے بعد ڈرائیور جوزف نے پچھلا دروازہ کھولا تو عطیہ حیدر نے ایک نظر کچھ فاصلے پر کھڑے سلمان حیدر پر ڈالی اور پھر گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ ان کے بیٹھنے کے بعد سلمان حیدر نے قدم گاڑی کی طرف بڑھائے۔ جوزف اسی طرح سر جھکائے مؤدب کھڑا تھا۔

''تھینک یو مسٹر جوزف......'' گاڑی میں بیٹھنے کے بعد سلمان، جوزف کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''ویلکم......''

جوزف نے ہلکا سا سر خم کیا اور چکر کاٹ کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ایک ہفتہ پہلے ان کا ذاتی ڈرائیور گلریز پاکستان چھٹی پر چلا گیا تھا تو خورشید حیدر نے جوزف کو گلریز کے واپس آنے تک ہائر کیا تھا۔ جوزف ایک مہذب اور تعلیم یافتہ سیاہ فام تھا۔ کچھ عرصہ پہلے وہ ان کی کمپنی میں ہی ملازم تھا پھر کسی ذاتی وجہ سے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب دوبارہ ملازمت کے لیے آیا تو خورشید حیدر نے اسے اپنی ذاتی گاڑی کے لیے رکھ لیا اور وعدہ کیا تھا کہ گلریز کے واپس آ جانے کے بعد وہ اسے کمپنی میں ایڈجسٹ کر لیں گے۔ اسے ہیوی گاڑیاں ڈرائیو کرنے کا تجربہ تھا اور کمپنی میں بھی وہ ڈرائیور کے طور پر ملازم تھا۔ ہمیشہ کی طرح سلمان دروازے کے ساتھ جڑ کر بیٹھا تھا اور گاڑی کے پارکنگ ایریا سے نکل کر مین روڈ پر آتے ہی وہ کھڑکی کے شیشے سے ناک ٹکا کر باہر دیکھنے لگا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی کرتا تھا۔ ان سے یوں فاصلہ رکھ کر بیٹھتا جیسے وہ کوئی اچھوت ہوں اور سارا وقت وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا۔ آنکھوں کے کونے میں ٹھہرے ہوئے آنسو کو انہوں نے انگلی کی پور سے پونچھا اور گود میں رکھے اپنے پرس کو دیکھنے لگیں۔

''وہ لڑکی زونا جسے سلمان نے مارا تھا۔ خدانخواستہ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو...... میرا بیٹا نو سال کی عمر میں قاتل بن جاتا۔'' انہوں نے جھرجھری سی لی اور کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا وہ یوں ہی کھڑکی سے چہرہ ٹکائے باہر دیکھ رہا تھا۔ ''یا اللہ تیرا شکر ہے اس بچی کو کچھ نہیں ہوا۔ پتا نہیں اس کے اندر اتنا غصہ کیوں ہے، پتا نہیں کس پر چلا گیا ہے۔'' اس کی دادی، خورشید حیدر! اور وہ خود بہت نرم مزاج تھیں۔ ''شاید اپنے دادا پر۔'' انہوں نے اپنے سسر کو نہیں دیکھا تھا وہ ان کی شادی سے ایک سال پہلے وفات پا گئے تھے۔ رحیمہ سلطان انہیں اکثر اپنے شوہر کے متعلق بتاتی رہتی تھیں لیکن یہ کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ غصے کے تیز تھے یا سخت مزاج تھے یا پھر تحمل مزاج۔

''اوہ نو......'' انگریزی زبان کا بر الفظ استعمال کیا۔

سلمان کے لبوں سے نکلا تو انہوں نے چونک کر اسے دیکھا تھوڑا سا سر بلند کر کے دیکھنے کی کوشش کی کہ سلمان نے کیا دیکھا تھا لیکن گاڑی آگے بڑھ چکی تھی البتہ خورشید حیدر نے فٹ پاتھ پر باپ کا ہاتھ پکڑے کھڑے.... سلمان کے ہم عمر بچے کو دیکھا تھا۔ باپ، بیٹا دونوں ہی بہت خوب صورت تھے اور دونوں میں اتنی مشابہت تھی کہ انہوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یقیناً وہ باپ بیٹا ہی ہوں گے۔ سلمان نے کیا انہیں دیکھ کر یہ ردِعمل دیا تھا۔

انہوں نے حیران ہو کر سوچا کیونکہ ان کے علاوہ تو وہاں اور کوئی نہیں تھا نہ سمجھ آنے والے انداز میں سر جھٹک کر انہوں نے ذرا سی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ اب پھر کھڑکی سے چہرہ ٹکا چکا تھا۔ ان کی نظریں عطیہ حیدر سے ملیں اور وہ کچھ کہتے، کہتے رک کر پھر سامنے دیکھنے لگے۔ پھر گھر تک کے راستے میں خاموشی رہی۔ جوزف نے گاڑی گھر کے باہر ہی روک دی اور نیچے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا۔ سلمان کی آنکھوں میں ذرا سی دیر کے لیے حیرت نمودار ہوئی۔ اور اس نے سیٹ پر بیٹھے، بیٹھے خورشید حیدر کو مخاطب کیا۔

''ڈیڈ..... کیا آپ گھر کے اندر چل کر بتائیں گے کہ آپ مجھے اچانک اسکول سے کیوں لے آئے، کیا مس گارڈن نے آپ کو کال کی تھی؟''

''اس وقت مجھے آفس جانا ہے کچھ انویسٹرز کے ساتھ میری ضروری میٹنگ ہے۔ واپس آ کر ہم اس پر بات کریں گے۔ او کے.....'' انہوں نے مڑ کر سلمان کی طرف دیکھا۔

''او کے.....'' وہ اپنا بیگ اٹھا کر گاڑی سے نکلا..... باہر کھڑے جوزف کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''تھینک یو مسٹر جوزف.....''

جوزف نے حسبِ عادت ویلکم کہتے ہوئے سر خم کیا۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا وہ تیز، تیز چلتا ہوا اندر چلا گیا۔ اندر قدم رکھتے ہوئے اس نے مڑ کر مسز حیدر کی طرف دیکھا تھا جو گاڑی سے اتر کر جوزف سے کچھ کہہ رہی تھیں..... جوزف کی طرف دیکھتے ہوئے جو نرمی اور ملائمت اس کی آنکھوں میں نظر آئی تھی وہ اب مفقود تھی۔ سپاٹ اور سرد مہر۔۔ سی نظر ان پر ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا۔ عطیہ حیدر نے اسے تیز، تیز جاتے ہوئے دیکھا اور پھر دو قدم بڑھا کر گاڑی کی کھڑکی پر ہاتھ رکھتے ہوئے ملتجی نظروں سے خورشید حیدر کی طرف دیکھا۔

''آپ جلدی آیئے گا پلیز..... میں اندازہ نہیں کر سکتی۔۔ وہ یہ جان کر کہ اسے اسکول سے نکال دیا گیا ہے کیا ردِعمل ظاہر کرے گا یاد ہے آپ کو جب مسز ظفر کی شکایت پر میں نے اس سے باز پرس کی تھی تو یہ کتنا ہائپر ہو گیا تھا اور چیزیں اٹھا، اٹھا کر پھینکنے لگا تھا۔ اب بھی اگر..... نہیں، میں اسے اکیلے ہینڈل نہیں کر سکوں گی۔''

''تم اس سے کچھ مت کہنا، وہ پوچھے بھی تو ٹال دینا۔ میں جلد آنے کی کوشش کروں گا اور طریقے سے اسے بتاؤں گا۔'' تسلی کے انداز میں وہ مسکرائے۔

''تھینک یو..... میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیسے اسے بتاؤں گی کہ.....''

''وہ میرا بھی بیٹا ہے عطی..... اور مجھے بھی بہت پیارا ہے۔ پریشان مت ہونا..... اپنا خیال رکھنا۔''

ایک محبت بھری تسلی آمیز نظر اس پر ڈال کر انہوں نے جوزف کو چلنے کے لیے کہا۔ شادی کے چودہ سال گزر جانے کے بعد بھی وہ عطیہ کے روزِ اول کی طرح دیوانے تھے۔ وہ ان سے محبت ہی نہیں کرتے تھے ان کی عزت اور قدر بھی کرتے تھے۔ آج تک کبھی انہوں نے ان سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ لیکن یہ سلمان حیدر، ایک گہری سانس لے کر وہ ہولے، ہولے گیٹ کی طرف بڑھیں۔ اندر قدم رکھتے ہوئے انہوں نے دونوں اطراف دیکھا۔

''سلمان بابا اندر گھر میں چلے گئے ہیں۔''

چوکیدار بہادر خان سمجھ گیا تھا کہ وہ سلمان کو دیکھ رہی تھیں بہادر خان کا تعلق مردان سے تھا اور خورشید حیدر اسے پاکستان سے لائے تھے۔

''وہ مانوش میڈم آئی تھیں۔ آپ سے ملنا چاہتی تھیں میں نے بتا دیا کہ آپ گھر پر نہیں ہیں۔''

گیٹ بند کرتے ہوئے بہادر خان نے بتایا تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

''کیوں..... کیوں آئی تھی؟''

”بولتی تھی ملنا ہے......ضروری بات کرنی ہے۔“
بہادر خان بہت چھوٹی عمر میں کراچی آ گیا تھا اس لیے اس کی زبان بہت صاف تھی۔
”خان چاچا آپ کو پتا ہے ناں صاحب نے منع کیا ہے وہ نہ تو گھر کے اندر آئے گی نہ سلمان سے ملے گی......اب آئے تو پوچھ لیں کہ کیا کام ہے جو بھی بات ہے آپ کو بتا دے۔شاید کسی مدد کی ضرورت ہو۔“
مانوش، سلمان کی فلپائنی آیا تھی۔لیکن تین چار ماہ پہلے خورشید حیدر نے اسے فارغ کر دیا تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔سلمان بڑا ہو گیا ہے۔اسے اب کسی کیئر ٹیکر کی ضرورت نہیں......انہیں اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ سلمان کے بگاڑ میں کچھ ہاتھ مانوش کا بھی ہے۔ڈاکٹر ماریا کا بھی خیال تھا کہ سلمان کے اردگرد کوئی ایسا شخص ہے جو اس کے ذہن کو زہر آلود کر رہا ہے اور یہ بات ڈاکٹر ماریا نے اس کے دوسرے سیشن کے بعد کہی تھی۔
”مسٹر حیدر آپ ایسے کسی شخص کو سلمان کے پاس سے ہٹا دیں۔“ اور مانوش کے علاوہ کوئی اور سلمان کے قریب نہیں تھا۔ریٹا اور اینا......صفائی، دھلائی اور دوسرے کام کر کے چلی جاتی تھیں۔ان کی شادی سے پہلے ایک شیف جس کا تعلق ترکی سے تھا۔کچن دیکھتا تھا لیکن جب وہ اپنے وطن واپس چلا گیا تو عطیہ نے منع کر دیا کہ اب کسی اور کو ہائر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کوکنگ وہ خود کریں گی۔تو اچھی طرح سوچنے کے بعد خورشید حیدر نے مانوش سے معذرت کر لی تھی کہ اب وہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے......اور کوشش کی تھی کہ جانے سے پہلے وہ سلمان سے نہ مل سکے اور اس کوشش میں وہ کامیاب بھی ہو گئے تھے سلمان کو یہی بتایا گیا تھا کہ مانوش کو اپنے وطن واپس جانا تھا اس لیے جاب چھوڑ گئی ہے۔سلمان نے اس روز کھانا نہیں کھایا تھا۔اور دو تین روز بے حد خاموش رہا تھا۔ورنہ انہیں ڈر تھا کہ اگر اسے علم ہوا کہ مانوش کو انہوں نے خود جاب سے نکالا ہے تو نہ جانے کتنا شدید ردِّ عمل ہو اس کا......ان دنوں وہ اتنا ہی چڑچڑا اور غصیلا ہو رہا تھا۔سو مانوش سے بات کرنے سے پہلے انہوں نے عطیہ اور سلمان کو مسز ظفر کی فیملی کے ساتھ گھومنے کے لیے لندن بھجوا دیا تھا۔
کبھی، کبھی وہ سوچتیں کہ انہوں نے مانوش کے ساتھ زیادتی تو نہیں کر دی۔وہ غیر قانونی طریقے سے آئی تھی اور ایک ریسٹورنٹ میں بہت قلیل تنخواہ پر کام کرتی تھی۔اس طرح غیر قانونی طریقے سے بارڈر کراس کر کے آنے والے مردوں اور عورتوں کو اول تو کہیں جاب ملتی ہی نہیں تھی اور اگر کہیں مل بھی جاتی تو بہت معمولی سی تنخواہ پر......مانوش کے پاس رہنے کو کوئی ٹھکانا نہیں تھا وہ رات کو اسی ریسٹورنٹ کی بیس منٹ میں سوتی تھی۔ان دنوں سلمان کی نینی جو پاکستانی تھی واپس پاکستان چلی گئی تھی اور انہوں نے آیا کے لیے دفتر میں نام درج کروایا ہوا تھا ایک خاتون آئی تھی لیکن وہ انہیں پسند نہیں آئی تھی ۔پاکستانی خاتون اگرچہ دو ماہ کے لیے گئی تھی لیکن ان کا ارادہ اسے دوبارہ رکھنے کا نہیں تھا کیونکہ رحیمہ سلطان نے نوٹ کیا تھا کہ اس کا رویہ سلمان کے ساتھ اچھا نہیں تھا......کھردرے لہجے میں بولتی بلاوجہ ڈانٹ دیتی۔ٹھنڈا دودھ پینے کو دے دیتی تھی ۔بعض اوقات فیڈر دھوئے بغیر اس میں دودھ ڈال دیتی تھی۔
پوچھو تو مکر جاتی تھی۔حالانکہ وہ کوئی چالیس، پینتالیس سال کی مدبر سی خاتون تھی۔سلمان تین سال کا تھا تو اِدھر اُدھر بھاگتا پھرتا۔وہ اس کے پیچھے بھاگ، بھاگ کر تھک جاتی تھیں کہ ان دنوں ان کی اپنی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی کہ وہ پھر ایک بار ماں بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔ایسے میں جب خورشید حیدر، مانوش کو لے کر آئے تو انہیں اس کا آنا بہت غنیمت لگا تھا۔رحیمہ سلطان کو بھی ہر لحاظ سے مناسب لگی تھی کیونکہ اس نے بتایا تھا کہ ریسٹورنٹ میں کام کرنے سے پہلے وہ بے بی سٹنگ کرتی تھی۔خورشید حیدر اتفاق سے اس رات اسی ریسٹورنٹ کے پاس سے گزر رہے تھے جہاں مانوش کام کرتی تھی۔غیر قانونی تارکینِ وطن کی گرفتاری کے لیے اس روز اس

ریسٹورنٹ پر چھاپا پڑا تھا شاید کسی نے شکایت کی تھی کہ غیر قانونی طور پر ملک میں آنے والے اس ریسٹورنٹ میں کام کرتے ہیں۔ ریسٹورنٹ کے سکھ مالک نے ایسے سب ملازمین کو چھاپے سے پہلے ہی نکال دیا تھا۔ وہ پکڑے جانے کے خوف سے بھاگتے ہوئے ان کی گاڑی سے آٹکرائی تھی۔ یوں اس کی کہانی سن کر خورشید حیدر اسے ساتھ لے آئے تھے۔ رحیمہ سلطان نے کئی ہفتوں تک اس کی نگرانی کی تھی اور مطمئن ہوگئی تھیں کہ اس نے سلمان کو بہت اچھی طرح سنبھال لیا تھا۔ سلمان بھی جلد ہی اس سے مانوس ہوگیا تھا۔

رحیمہ سلطان جب تک زندہ رہیں مانوش کی خود نگرانی کرتی تھیں۔ سلمان کے سب کام اپنے سامنے کرواتی تھیں۔ سلمان چار سال کا تھا جب ان کا انتقال ہوگیا۔ اور سلمان جو پہلے زیادہ وقت دادی کے ساتھ گزارتا تھا اب مانوش کے ساتھ گزارنے لگا کہ عطیہ خود غم سے نڈھال تھیں کہ رحیمہ سلطان کی وفات سے دو ماہ پہلے اللہ نے انہیں پھر بیٹے کی نعمت سے سرفراز کیا تھا لیکن وہ صرف چار دن کی زندگی لے کر آیا تھا۔ جب نرس نے اسے ان کی گود میں ڈالا تھا تو وہ مبہوت سی ہوکر اسے دیکھنے لگی تھیں وہ اتنا خوب صورت تھا جیسے چمکتا چاند ان کی گود میں اتر آیا ہو۔

''یہ بالکل اپنے باپ جیسا ہے۔'' رحیمہ سلطانہ نے اس کی پیشانی چومی تھی۔

''جب میرا خورشید پیدا ہوا تھا تو ایسا ہی تھا۔ خورشید کے دادا نے اس کے کان میں اذان دی تھی اور کہا تھا۔ ''میرے گھر تو مانو سورج اتر آیا ہے۔'' تو یوں خورشید کی دادی نے اس کا نام خورشید رکھ دیا۔''

جب نرس اسے فیڈ کے لیے لاتی تھی تو وہ نظر بھر کر اسے دیکھتی بھی نہیں تھیں کہ کہیں نظر نہیں لگ جائے پھر بھی اسے نظر لگ گئی تھی اور صرف چار دن بعد وہ دنیا سے چلا گیا تھا۔ ان کے آنسو تھمتے ہی نہیں تھے۔

''آپ کیوں روتی ہیں مام؟'' چار سالہ سلمان نے پوچھا تھا۔

''اللہ نے تمہارا بھائی بھیجا تھا۔ اتنا پیارا سا بڑا ہوتا تو تمہارے ساتھ کھیلتا۔ تمہارا دوست ہوتا وہ۔ لیکن پھر اللہ میاں نے اسے واپس لے لیا۔'' انہوں نے اسے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا تھا اور اس نے اپنے منے، منے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے تھے۔

''آپ روئیں نہیں۔ اللہ میاں سے دعا کروں گا تو وہ اور بھائی بھیج دے گا۔''

تب سلمان ان کے پاس آتا اور ان کی گود میں بیٹھ جاتا تھا لیکن اب وہ ان کی طرف دیکھتا ہی نہیں تھا۔ ان کی آنکھیں نم ہوئیں۔

''بیگم صاحبہ۔'' بہادر خان کے بلانے پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

''ریٹا میم کا پیغام آیا تھا وہ آج نہیں آسکیں گی، کل آئیں گی۔'' انہوں نے سر ہلایا اور رہائشی حصے کی طرف بڑھ گئیں۔ ریٹا ہفتے میں دو دن صفائی کے لیے آتی تھی۔

سٹنگ روم میں آکر انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ سلمان اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ وہ نڈھال سی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔ اینا استری کرنے والے کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے سٹنگ میں آئی تو عطیہ حیدر کو یوں آنکھیں بند کیے دیکھ کر ٹھٹکی۔

''آپ ٹھیک ہیں میم؟''

''ہاں......'' عطیہ حیدر نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

''سلمان بابا کے کپڑے میں دھونے کے لیے لے آئی ہوں۔ اور کپڑے ہیں دھونے والے۔'' اس نے پوچھا تو انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اینا ڈیوڈ تمہیں زحمت تو ہوگی لیکن ایک کپ کافی بنا دو پلیز......'' یوں تو اینا صرف کپڑے دھوتی اور استری

Digest Novels Group

کرتی تھی لیکن جب انہیں ضرورت ہوتی تو وہ کچن وغیرہ کے کاموں میں اس کی مدد لے لیا کرتی تھیں اور اس کے لیے اضافی چارجز ادا کر دیا کرتی تھیں۔ یہاں پاکستان والا حساب تو تھا نہیں کہ برتن دھونے والی ماسی ہو یا صفائی والی اگر کوئی اضافی کام کرنا ہو تو کر جاتی تھی یہاں تو فی گھنٹا کے حساب سے پےمنٹ ہوتی تھی۔

اینا نے بازو پر رکھے ہوئے کپڑے دوسرے صوفے پر رکھے اور ہلکا سا سر خم کیا۔

''اوکے میم......''

''سلمان کیا کر رہا تھا اینا؟'' انہیں ایک دم خیال آیا تھا پوچھنے کا۔

''اپنے ٹوائیز کے ساتھ کھیل رہے تھے۔'' اینا بتا کر کچن کی طرف چلی گئی تو انہوں نے ایک اطمینان بھری سانس لی کہ وہ غصے میں نہیں تھا۔ اکثر وہ ناراض یا غصے میں ہوتا تو چیزیں توڑ پھوڑ دیتا تھا۔ انہوں نے کتنی دعاؤں اور منتوں کے بعد اسے پایا تھا۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ان کی تین اولادیں ہوئی تھیں۔ پہلا بیٹا ابنارمل تھا جب وہ تقریباً ساڑھے تین سال کا تھا تو انہیں پھر سے خوشخبری ملی تھی لیکن وہ خوفزدہ ہو گئی تھیں۔

''خورشید ہمارا بچہ اگر پھر ایسا ہی ہوا ابنارمل تو...... ہمیں مزید بچے پیدا نہیں کرنے چاہئیں۔''

''میرے اور تمہارے خاندان میں دور، دور تک کسی کے ہاں کوئی ابنارمل بچہ نہیں ہے۔ ہمارا آفی اگر ذہنی طور پر معذور ہے تو یہ اللہ کی طرف سے ہے، ہماری آزمائش ہے ان شاء اللہ ہمارا ہونے والا بچہ بالکل نارمل ہوگا۔''

خورشید حیدر کی خواہش تھی کہ ان کے کم از کم چار بچے ضرور ہوں۔ وہ اکلوتے تھے اور انہیں ہمیشہ بہن، بھائیوں کی کمی بہت محسوس ہوتی تھی۔

''ڈاکٹروں کی باتوں کو لے کر زیادہ پریشان مت ہو۔ ہمارا تو کزن میرج والا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ شادی سے پہلے تو ہم ایک دوسرے کے خاندانوں کو جانتے تک نہیں تھے۔ اللہ بہتر کرے گا۔''

یہ صحیح تھا کہ وہ شادی سے پہلے خورشید حیدر کے نام سے واقف تک نہیں تھیں۔ رحیمہ سلطان نے انہیں ایک شادی کی تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ راولپنڈی اپنی ایک دوست کی شادی میں شرکت کے لیے...... گئی ہوئی تھیں۔ نازش ان کی بہت گہری دوست تھی۔ اور وہ خود انہیں اپنی شادی کا دعوت نامہ دینے آئی تھی۔ راولپنڈی شفٹ ہونے سے پہلے وہ ان کے بالکل ساتھ والے گھر میں رہتی تھی۔ بچپن سے میٹرک تک ان کا ہر وقت کا ساتھ رہا تھا۔ ایک ہی اسکول میں تعلیم بھی حاصل کی تھی پھر بھی اماں نے انہیں راولپنڈی جانے کی اجازت مشکل سے ہی دی تھی۔ وہ بھی بڑے بھائی کی سفارش پر......

''اماں عطو کوئی بچی تو نہیں ہے اب نازو اس کی سہیلی ہے اور اس کے خاندان کے ساتھ برسوں کا ساتھ رہا ہے ہمارا...... میں لے جاؤں گا اسے۔ رخصتی کے فوراً بعد واپس آ جائیں گے۔ چند گھنٹوں کی بات ہے۔'' دعوت تو سارے گھر کی ہی تھی۔ یوں وہ بھائی جان کے ساتھ نازش کی شادی میں شریک ہوئی تھی اور رحیمہ سلطان جو کراچی سے نازش کی شادی میں شرکت کے لیے آئی ہوئی تھیں انہوں نے پہلی نظر میں ہی اسے دیکھ کر اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا تھا۔ نازش کی والدہ رحیمہ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ اور یوں رحیمہ سلطان، نازش کے ولیمے کے دو دن بعد ہی اس کی والدہ کے ساتھ ان کے گھر اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آ گئیں۔ ان کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا جبکہ رحیمہ سلطان کا تعلق بہت امیر گھرانے سے تھا، اس لیے ان کی اماں نے سہولت سے انکار کر دیا۔

''ہمارا آپ کا کوئی جوڑ نہیں ہے بہن...... پھر میری بیٹی......'' انہوں نے بات کاٹ دی تھی۔

''ہمیں کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نازو نے سب بتا دیا ہے مجھے...... میرا بیٹا کیا ہے، کیسا ہے یہ آپ خود اس سے مل کر دیکھ لیں۔ مجھے اپنے بیٹے کے لیے اس کے جیسی ہی بیوی چاہیے تھی۔ سال بھر سے میں لڑکیاں دیکھ

digest.library.com

رہی تھی۔کوئی نظر میں جچتی ہی نہیں تھی لیکن عطیہ بیٹی تو پہلی نظر میں دل میں سما گئی۔بس آپ انکار نہ کیجیے گا۔یہ نازو کی والدہ میری خالہ زاد بہن ہے۔آپ کے ساتھ ان کا برسوں کا تعلق ہے۔ہمارے متعلق ہر طرح کی تسلی کر لیں۔ کراچی آئیں، میرے بیٹے سے ملیں، ہمارا گھر بار دیکھیں اور سوچ سمجھ کر جواب دیں۔''

پہلے تو اماں متذبذب تھیں لیکن جب وہ اور بھائی جان ان کے بے حد اصرار پر خورشید حیدر سے ملے تو اماں اس رشتے کے لیے مان چکی تھیں۔رحیمہ سلطان نے خورشید حیدر کو راولپنڈی ہی بلوا لیا تھا وہ سمجھتی تھیں کہ ان کے لیے کراچی جانا شاید آسان نہ ہو۔لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔

''مجھے شادی نہیں کرنی اب...... عمر بھر نہیں۔''انہوں نے رو،رو کر برا حال کر لیا تھا۔

''کیوں نہیں کرنی شادی۔کیا عمر بھر بھائی، بھابی کی غلامی کرو گی...... باپ کا سایہ سر پر نہیں ہے۔میں جانے کب تک ہوں۔بھائی بھابی اچھے ہیں مان لیا لیکن کب تک اچھے رہیں گے۔عورت سر اٹھا کر صرف اپنے شوہر کے گھر ہی جی سکتی ہے۔بہن، بھائیوں کے گھر میں تو سر جھکا کر ہی جینا پڑتا ہے اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ یہاں ہی تمہاری شادی کر دوں گی۔تمہارا بھائی ایک دو دن تک کراچی جا کر خود بھی ان کے متعلق معلومات لے گا۔اس کا کوئی جاننے والا ہے وہاں اس کے پاس ہی جائے گا۔یہاں اگر بات نہ بنی تو بھی میں تمہاری شادی کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ تمہاری بھابی کے تیور میں دیکھ رہی ہوں، تمہارے بھائی کی وجہ سے وہ خاموش ہے لیکن ہمیشہ خاموش نہیں رہے گی۔''اماں جب کوئی فیصلہ کر لیتی تھیں تو اس پر قائم رہتی تھیں۔ان کا رونا دھونا انکار کرنا کسی کام نہیں آیا تھا بھائی جان کے اوکے کرنے کے بعد انہوں نے ہاں کہلوا دی تھی۔میٹرک کے بعد جب وہ مزید پڑھنا چاہتی تھیں تب بھی اماں نے اپنی مرضی چلائی تھی اور میٹرک کے بعد انہیں گھر بٹھا لیا تھا۔اور اب بھی انہوں نے ان کی ایک نہیں سنی تھی، رخصتی سے ایک دن پہلے تک وہ ان کو قائل کرنے کی کوشش کرتی رہی تھیں۔

''وہ اتنے امیر لوگ ہیں اماں، سوچیں تو آخر انہوں نے مجھے ہی کیوں اپنے بیٹے کے لیے چنا ہے۔وہاں کراچی میں خوب صورت لڑکیاں..نہیں ہیں جو وہ مجھ جیسی ایک......''

''بس بھی کر دے اب عطو اللہ نے تیرا نصیب لکھا تھا بس......''اماں تو جیسے ان کی باتیں سن، سن کر بیزار ہو چکی تھیں۔اور وہ دل میں بہت سارے خوف اور وسوسے لیے خورشید حیدر کے سنگ کراچی آ گئی تھیں ان کا نکاح تو بہت سادگی سے ہوا تھا لیکن ولیمہ بہت دھوم دھام سے ہوا۔

خورشید حیدر بے حد نفیس انسان تھے۔کئی دن وہ منتظر رہیں کہ بس اب کوئی انکشاف ہوتا ہے کہ خورشید حیدر شرابی ہیں..یا یہ کہ انہوں نے وہاں یو کے میں بھی شادی کر رکھی ہے وغیرہ، وغیرہ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا اور خورشید حیدر ڈیڑھ ماہ بعد واپس مانچسٹر چلے گئے۔البتہ وہ تقریباً ایک سال رحیمہ سلطان کے ساتھ پاکستان میں رہی تھیں۔اس ایک سال کے دوران ایک بار وہ وزٹ ویزے پر مانچسٹر آئی تھیں۔خورشید حیدر انہیں خود لینے آئے تھے۔کاغذات تیار ہونے تک کا باقی وقت انہوں نے کچھ کراچی میں اور کچھ ماں کے ساتھ ان کے آبائی گاؤں میں گزارہ تھا۔اور رحیمہ سلطان نے ایک بار ان کے پوچھنے پر کہ آخر انہوں نے اپنے بیٹے کی شادی اپنے ہی جیسے خاندان میں کیوں نہیں کی بتایا تھا کہ''ہمارے ہاں شادیاں ہمیشہ خاندان میں ہی ہوتی تھیں۔حسن، خوب صورتی کچھ نہیں دیکھا جاتا۔ بس آپس میں رشتے طے کر دیے جاتے تھے کبھی کسی نے اعتراض بھی نہیں کیا۔میرا رشتہ بھی بچپن میں ہی میرے تایا زاد سے طے کر دیا تھا۔اور تایا زاد بہن کا میرے بھائی سے۔ایک بار میں نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ بھائی کا بھابی کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں بنتا، ہم بھائی کی شادی کہیں باہر سے کر لیتے ہیں۔میں نے دو تین سہیلیوں کے نام بھی اماں کو بتائے تھے لیکن اماں نے جواب دیا تھا کہ ہم اپنے خاندان کی لڑکیوں کو رد کر دیں گے تو ہماری کو جی (بدصورت)

بیٹیوں کو باہر سے کون لے گا۔ تب مجھے علم نہیں تھا کہ میرا رشتہ خاندان کے سب سے خوب صورت سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لڑکے سے طے ہو چکا ہے۔ میں جو معمولی شکل صورت کی عام سی لڑکی تھی۔ صرف دس جماعت پاس اور سلطان حیدر انجینئر پاکستان سے اور پھر باہر سے بھی تعلیم حاصل کی۔ میں ان کے قابل نہیں تھی۔ ان کے ساتھ چلتی ہوئی اچھی نہیں لگتی تھی۔ لیکن ہماری شادی ہوگئی تھی کہ ہمارے خاندان میں برسوں سے ایسے ہی شادیاں ہو رہی تھیں اور سب خوش، خوش زندگی گزار دیتے تھے۔ میرا بھائی بھی اپنی بیوی کے ساتھ اچھی پُرسکون زندگی گزار رہا تھا۔ حالانکہ شکل صورت کے معاملے میں وہ مجھ سے بھی گئی گزری تھی۔ لیکن باقی سب خوبیاں جو ہمارے خاندان کی لڑکیوں میں ہوتی تھیں وہ اس میں تھیں۔ گھڑ، سلیقہ شعار، شوہر اور اس سے وابستہ سب رشتوں کا خیال اور احساس رکھنے والی خدمت گزار...... یہ سب خوبیاں مجھ میں بھی تھیں لیکن میں سلطان کے دل تک رسائی حاصل نہیں کر سکی تھی۔ شادی کے ابتدائی چند ماہ کے بعد انہوں نے مجھے منہ ہی نہیں لگایا۔ ہر وقت بیزار اور ناراض رہتے کہیں جانا ہوتا تو مجھے کہتے۔

”میرے ساتھ، ساتھ نہ چلا کرو لوگ مجھے عجیب ترس کھاتی نظروں سے دیکھتے ہیں۔“

”تو جب آپ انہیں اتنی ناپسند تھیں تو وہ شادی ہی نہ کرتے۔ انکار کر دیتے۔ مرد تھے انکار کر سکتے تھے۔“ عطیہ حیدر کو حیرت ہوئی تھی اور رحیمہ سلطان تو اچھی خاصی گریس فل لگتی تھیں۔ کیسی سحر انگیز آنکھیں تھیں ان کی۔

”مرد بھی مجبور ہو جاتا ہے بیٹی...... وہ انکار کیسے کر سکتے تھے۔ ان کی بہن میرے بھائی کی بیوی تھی۔“ رحیمہ سلطان کی آنکھوں میں اپنے متعلق بتاتے ہوئے اذیت سی تھی۔

”یہ سچ ہے کہ میرا اور سلطان کا کوئی جوڑ نہیں تھا لیکن انہیں میرے ساتھ رشتہ نبھانا تھا ہر صورت وہ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی مانچسٹر آ گئے۔ انہوں نے اعلیٰ تعلیم یہاں سے ہی حاصل کی تھی اور یہاں ہی جاب کر لی تھی۔ وہ چاہتے تو اپنی من پسند لڑکی سے شادی کر کے یہاں اپنی مرضی کی زندگی گزار سکتے تھے لیکن یہاں بھی وہ مجھے اپنے ساتھ لانے کے لیے خاندانی دباؤ کی وجہ سے مجبور تھے۔ زیادہ دباؤ تو خود اُن کے اپنے ماں، باپ کی طرف سے تھا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کی بیٹی کی خوشیاں میری ذات سے وابستہ ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے سلطان سے ہمدردی تھی۔ ترس آتا تھا ان پر...... انہوں نے ایک نا آسودہ زندگی گزاری۔ کبھی میں نے انہیں خوش نہیں دیکھا...... انہوں نے خوشی اور آسودگی باہر ڈھونڈنی شروع کر دی تھی۔ لیکن باہر سے ملنے والی خوشی عارضی ہوتی ہے۔ انہوں نے میرے ساتھ صرف رشتہ نبھایا۔ بیوی نہیں سمجھا، میں ہمیشہ ان کے لیے صرف ایک کیئر ٹیکر رہی ان کے گھر اور ان کے بچے کی دیکھ بھال کرنے والی...... وہ اکثر راتیں باہر گزارتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے ان کے ساتھ ظلم ہوا ہے، وہ مجھ سے بہتر لڑکی ڈیزرو کرتے تھے۔ اگر ان کی شریک حیات ان کے جوڑ کی ہوتی تو شاید وہ اپنی خوشیاں تلاش کرنے کے لیے باہر نہیں بھٹکتے...... خورشید ہمارا اکلوتا بیٹا ہے۔ سلطان مزید اولاد نہیں چاہتے تھے انہیں ڈر تھا کہ اگر مزید بچے ہوئے تو وہ کہیں مجھ پر نہ چلے جائیں کہ وہ حسن پرست تھے۔ خورشید کی پیدائش پر جس طرح انہوں نے اسے دیکھنے کے بعد خوشی کا اظہار کیا تھا اور شکر ادا کیا تھا کہ وہ مجھ پر نہیں گیا اُسی روز مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں کبھی ان کے دل میں اپنی جگہ نہیں بنا سکوں گی۔ اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اپنے بیٹے کی شادی میں کسی ایسی لڑکی سے کروں گی جو اس کے جوڑ کی ہو اس کے ساتھ چلتے ہوئے اسے شرمندگی نہ ہو۔ میں نے خورشید کی بہت اچھی تربیت کی ہے، عورت کی عزت اور قدر کرنا سکھایا ہے۔ وہ شکل صورت میں بالکل اپنے باپ کی کاپی ہے لیکن عادات و مزاج میں بالکل مختلف ہے۔ پھر بھی میں چاہتی تھی کہ اس کی بیوی، ایسی ہو کہ وہ اس کے ساتھ ایک مطمئن اور خوشگوار زندگی گزارے۔ اپنے باپ کی طرح سکون اور خوشی کی تمنا میں اسے باہر نہ بھٹکنا پڑے اور یہ سلطان کی بھی خواہش تھی مرنے سے کچھ عرصہ پہلے انہوں نے کہا تھا کہ ضروری نہیں کہ خورشید کی شادی خاندان میں ہی ہو۔

digest library.com

اس کی شادی اس کی پسند سے ایسی لڑکی سے کرتا جو اس کے برابر کی ہو۔ ایک ناپسندیدہ عورت کے ساتھ زندگی گزارنا کسی اذیت سے کم نہیں ......'' تو میں نے جو چند لڑکیاں دیکھیں وہ میرے دل میں نہیں اتریں...... کہیں حسن تھا تو ناز و ادا اور تکبر نے اس حسن کو گہنا رکھا تھا کہیں دولت مند گھرانا تھا تو شکل واجبی سی مختصر یہ کہ تم پہلی نظر میں ہی میرے دل میں اتر گئیں اور میں نے دل میں کہا۔ ہاں بس یہ ہی وہ لڑکی ہے جو میرے خورشید کے سنگ سجے گی۔ حسنِ صورت تو تھا ہی حسنِ سیرت کا بھی نازش سے تمہارے متعلق جان کر پتا چل گیا تھا۔''

''کافی میم......'' اینا نے کافی کا کپ ٹیبل پر رکھا تو وہ چونکیں۔

''تھینک یو اینا۔''

Jiggy Novels Lovers Group

اینا نے ہلکا سا سر خم کیا اور صوفے پر پڑے کپڑے اٹھا کر لانڈری میں چلی گئی۔ رحیمہ سلطان کی یادوں سے ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے اپنی آنکھیں پونچھیں اور کافی کا کپ اٹھایا۔

رحیمہ بہت اچھی ساس تھیں ماں جیسی اور سلمان میں تو ان کی جان تھی۔ ''وہ ہوتیں تو شاید سلمان ایسا نہیں ہوتا جیسا ہو گیا ہے وہ سب ہینڈل کر لیتیں وہ اسے سمجھا لیتیں انہیں سمجھانا آتا تھا دلاسا دینے کا ہنر جانتی تھیں۔'' سلمان کی پیدائش سے چار ماہ پہلے جب آفاق کو خورشید حیدر نے ایک ادارے میں چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو وہ بہت روئی تھیں۔

''وہ ہمارا بیٹا ہے خورشید...... اگر وہ ذہنی معذور ہے تو کیا ہوا...... وہ ہمیں پہچانتا ہے، وہ کتنا بھی رو رہا ہو میری گود میں آتا ہے تو وہ پُرسکون ہو جاتا ہے میں بہت دیر اسے نظر نہیں آؤں تو چیخنے لگتا ہے وہاں اجنبی صورتیں دیکھے گا تو روئے گا بہت۔'' تب رحیمہ نے ہی انہیں سمجھایا تھا۔

''صرف کچھ عرصے کی بات ہے۔ اس پرائیویٹ ادارے میں بہت اچھی دیکھ بھال کی جاتی ہے پھر خورشید اسے ہفتے میں دو، تین بار ملنے جایا کرے گا، تم بہت اسٹریس لیتی ہو، ایسی حالت میں ڈاکٹر نے اسٹریس لینے سے منع کیا ہے۔ خیر خیریت سے تم فارغ ہو جاؤ تو اسے واپس لے آئیں گے، میں نے خود خورشید کے ساتھ جا کر تسلی کی ہے۔ وہاں موجود سارا عملہ بہت ذمے دار ہے، اگر وہ بہت زیادہ پیسہ لیتے ہیں تو خیال بھی رکھتے ہیں۔'' انہوں نے کچھ اس طرح سمجھایا تھا کہ وہ سنبھل گئی تھیں۔ اور آج انہیں رحیمہ کی بے حد ضرورت تھی۔ اماں بھی اس کی شادی کے سال بھر بعد ہی دنیا سے چلی گئی تھیں۔

''کاش آنٹی آپ اتنی جلدی ہمیں چھوڑ کر نہ جاتیں۔'' ایک سرد آہ بھر کر انہوں نے کافی کا کپ ہونٹوں سے لگایا۔ اینا نے کافی اچھی بنائی تھی۔

''آج میں اینا کو روک لوں گی اور لنچ کی تیاری میں اس کی مدد لوں گی۔ آج میں سلمان کی پسند کا لنچ بناؤں گی۔'' انہوں نے ایک گھونٹ بھرا۔ تب ہی اوپر سے کچھ ٹوٹنے کی آواز آئی جیسے کانچ کے ٹکڑے فرش پر گرے ہوں۔ پھر ایک زوردار آواز اور فرش پر چھناکے کی آواز......

''کیا سلمان نے گلاس فرش پر پھینکا ہے...... تو کیا وہ سمجھ گیا ہے کہ اسے اسکول سے نکال دیا گیا ہے یقیناً اس نے اندازہ لگا لیا ہوگا۔'' وہ کافی کا کپ ٹیبل پر رکھ کر تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔ ایک اور آواز......

''سلمان...... سلمان......'' وہ اسے آواز دیتی ہوئی اوپر پہنچیں۔ سیڑھیاں ایک وسیع لاؤنج میں ختم ہوتی تھیں۔ لاؤنج میں قدم رکھتے ہی انہوں نے دیکھا۔ سلمان لاؤنج کی دائیں دیوار پر لگے فل سائز آئینے کے سامنے کھڑا تھا۔ لکڑی کے نقشین فریم میں جڑا یہ خوب صورت آئینہ خورشید نے ایک انٹیک شاپ سے لیا تھا سلمان کے ہاتھ میں پیتل کا بھاری گلدان تھا جو کارنر میں سجا ہوا تھا اور اس سے وہ آئینے پر ضربیں لگا رہا تھا اور آئینے کی کرچیاں ٹوٹ، ٹوٹ کر فرش پر گر رہی تھیں۔

''سلمان میری جان......'' وہ زمین پر گری کرچیوں کی پروا کیے بغیر تیزی سے اس کی طرف بڑھیں اور اسے

اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

☆☆☆

ساری رات خوب بارش برسنے کے بعد اس وقت آسمان بالکل صاف تھا۔ انشال، امینہ کے ساتھ چھوٹے سے باورچی خانے میں کھڑی تھی۔ امینہ آج آلو والے پراٹھے بنا رہی تھیں۔ احمد شاہ برآمدے میں بیٹھے حدیث کی کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ آج جمعہ تھا اور مدرسے میں چھٹی تھی۔ امینہ نے چمٹے سے پراٹھا اتار کر چنگیر میں رکھا تو انشال نے دوسرا پراٹھا انہیں دیا وہ پراٹھے بیل کر امینہ کو دے رہی تھی۔

''یہ پراٹھا بن جائے تو تم لے جاؤ..... کھانا شروع کر دو ٹھنڈے ہو جائیں گے، میں گرم، گرم ساتھ، ساتھ دے جاؤں گی۔''

''اماں پریزے ہر بار کہتی ہے کہ میں اس کے گھر آؤں۔ اس بار میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ آؤں گی۔'' انشال نے پیڑا اٹھایا اور بیلنے لگی۔ امینہ نے چار پراٹھے بنا کر رکھے ہوئے تھے۔

''وہ کہتی ہے کل کا سارا دن ہم اس کے ساتھ گزاریں، سبینہ اور ایک دوست اور بھی آئے گی۔ سوموار کو تو یونیورسٹی کھل جائے گی۔ شام کو وہ خود مجھے چھوڑ جائے گی اپنی گاڑی میں۔''

''کیوں..... وہاں ہاسٹل میں یونی میں دن رات اکٹھی ہی ہوتی ہو..... پھر گھر میں جا کر پورا دن گزارنے کی کیا ضرورت ہے۔'' امینہ نے پراٹھا پلٹتے ہوئے حیرت سے اسے دیکھا۔

''اماں وہاں اکٹھے رہنا اور بات ہے وہاں تو بس اماں اپنی پڑھائی میں لگے رہتے ہیں ناں..... یہاں اس کے گھر میں سب مل کر انجوائے کریں گے۔ اتنے خوب صورت مناظر ہیں..... اتنی پیاری جگہ ہے اور اس کا گھر بھی بہت خوب صورت ہے۔ اس نے سب کو تصویریں دکھائی تھیں تو سب ہی نے اسے کہا تھا کہ کسی ویک اینڈ پر وہ رتی گلی آئیں گی۔ تو اب سب کا پروگرام بن گیا ہے... کل آنے کا تو پری نے مجھے کہا ہے کہ مجھے بھی ہر صورت آنا ہے تو میں چلی جاؤں ناں کل..... اگر بابا مدرسے جاتے ہوئے مجھے لے جائیں تو ٹھیک ورنہ پری گاڑی بھیج دے گی۔''

اس نے اجازت طلب نظروں سے امینہ کی طرف دیکھا۔

''آج تم پری کے ساتھ پورا دن گزارو گی اور کل تمہارا دل چاہے گا کہ کوئی ایک دن سبینہ کے ساتھ اس کے گھر جا کر گزارو۔'' امینہ نے دوسرا پراٹھا اتار کر چنگیر میں رکھا اور بیلا ہوا پراٹھا خود ہی اٹھا کر توے پر ڈالا۔

''نہیں تو.....'' وہ ہنس پڑی۔

''سبین کا گھر یہاں کہاں ہے، میں بھلا کسی دوسرے ملک میں کیسے جا سکتی ہوں..... بتایا تو تھا میں نے آپ کو اس کے پاپا، ماما، بھائی سب باہر ہوتے ہیں، شاید فرانس میں اس لیے کی ماما نے اسے یہاں نانو کے گھر بھیج دیا تھا جب وہ کوئی بارہ، تیرہ سال کی تھی۔ اس کے نانا جان فوت ہو چکے ہیں اور نانو چونکہ بیمار رہنے لگی تھیں اور ماموں کی جاب کسی دوسرے شہر میں ہے تو وہ نانو کو اپنے ساتھ لے گئے اور سبو ہاسٹل آ گئی کیونکہ اس کا ایڈمشن ہو چکا تھا۔ اور وہ یہاں ہی پڑھنا چاہتی تھی۔ ابھی تو وہ اپنی پھپھو کی طرف چلی گئی تھی وہ اسلام آباد میں ہی رہتی ہیں جوائنٹ فیملی سسٹم ہے ان کا اس لیے مستقل ان کے گھر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لیے ہاسٹل آنا پڑا اسے۔''

''تمہارے بابا اجازت نہیں دیں گے۔ تم یہ پراٹھے لے جاؤ ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ یہ ادھر ہی تیار کر کے رکھی ہے، وہ بھی لے جاؤ۔ یہ پراٹھا بھی بس تیار ہی ہونے والا ہے۔ میں بھی آ رہی ہوں۔'' امینہ نے پاس پڑے گھی دان سے گھی نکال کر پراٹھے پر ڈالا۔

''بابا سے تو میں اجازت لے لوں گی آپ اپنی بات کریں۔'' وہ جانتی تھی یہ سارے تحفظات اماں کو ہوتے

تھے بابا کو نہیں......

"بابا کبھی بھی منع نہیں کریں گے مجھے۔" اسے یقین تھا۔

"تو پھر اپنے بابا سے ہی پوچھ لو۔ مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو۔" انہوں نے پراٹھا پلٹا۔

"آپ کی اجازت بھی تو ضروری ہے پیاری اماں......" اس نے چنگیر اور دہی کا پیالہ اٹھایا۔ اور ٹرے میں رکھا جہاں چھوٹے باؤل اور پلیٹیں پہلے ہی سے رکھی ہوئی تھیں۔

"تو مجھے پسند نہیں ہے کہ تم سارا دن اجنبی لوگوں کے گھر رہو۔ وہاں اس کے گھر میں صرف وہ اکیلی تو نہیں رہتی ہوگی اس کے ماں، باپ، بہن، بھائی بھی تو ہوں گے۔"

"اس کے گھر میں صرف اس کے ڈیڈی اور ممی ہیں......اور ایک دادو ہیں۔ ایک ہی بھائی ہے جو لاہور میں اپنی ہاؤس جاب کر رہا ہے......خیر اب آپ بھی آجائیں تیسرا پراٹھا بھی تیار ہو گیا ہے۔"

"ہاں آرہی ہوں، چائے کا پانی رکھ کر......" امینہ نے پراٹھا چنگیر میں رکھا تو وہ پراٹھے اور دہی لے کر چلی گئی۔

"اوہ آلو کے پراٹھے۔" اس نے چنگیر اور دہی کا باؤل احمد شاہ کے سامنے پڑی ٹیبل پر رکھا تو انہوں نے ہاتھ میں پکڑی کتاب پاس رکھتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"جی بابا، آلو کے پراٹھے اور وہ بھی اماں کے ہاتھ کے۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"تمہاری اماں کے ہاتھ کے تو روز ہی کھاتا ہوں، میں نے سمجھا آج ہماری بیٹی کے ہاتھ کے کھانے کو ملیں گے۔" انہوں نے ایک پراٹھا اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھا۔ اور دہی جس میں سبز دھنیا اور سفید زیرہ اور سبز مرچ ڈال کر امینہ نے رائتہ بنایا ہوا تھا تھوڑا سا چھوٹے باؤل میں ڈالا۔

"سوری بابا، میں آج بھی فجر کے بعد سو گئی تھی اٹھی تو اماں سب کچھ تیار کر چکی تھیں۔ چلیں دوپہر کا اور رات کا کھانا سب میں بناؤں گی۔" وہ شرمندہ ہوئی۔

"آپ بتائیں کیا بناؤں......؟"

"میری بیٹی جو بھی پکائے گی مجھے پسند آئے گا۔"

"ڈھنگ سے ایک چیز بھی پکا نہیں پاتی آپ کی بیٹی۔" امینہ نے سادہ دہی اور چینی کا جار ٹیبل پر رکھا۔

"اب ایسا بھی نہ کہیں، پھپو اور دادو نے اچھے خاصے کھانے پکانا سکھا دیے تھے مجھے۔"

اس نے دہی کا پیالہ اپنے سامنے رکھا۔ وہ آلو والی روٹی میٹھی دہی یا لسی کے ساتھ کھاتی تھی۔ اور امینہ کو یاد رہتا تھا کوئی اور بھی تو تھا جو آلو والے پراٹھوں کے ساتھ میٹھی لسی بنواتا تھا۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی اور وہ سنجیدگی سے سر جھکائے چھوٹے، چھوٹے نوالے توڑ کر منہ میں رکھنے لگیں انہوں نے انشال کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ احمد شاہ نے بغور انہیں دیکھا اور پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"بابا......" بہت رغبت سے پراٹھے کے نوالے میٹھی دہی میں ڈبو ڈبو کر کھاتے ہوئے انشال نے احمد شاہ کی طرف دیکھا۔

"وہ میری دوست ہے ناں پریزے......"

"ہاں، ہاں کیا ہوا اسے؟" احمد شاہ نے پوچھا۔

"اسے کچھ نہیں ہوا بابا......اس کا فون آیا تھا رات کو کہہ رہی تھی کہ کل کا دن میں اس کے ساتھ اس کے گھر پر گزاروں......ہماری دوسری روم میٹ اور پری کی ایک اور دوست بھی آرہی ہے اسلام آباد سے۔ سب فرینڈز مل کر انجوائے کریں گے۔ بقول اس کے موج مستی......" امینہ کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑیں۔

''کیا میں چلی جاؤں بابا...... پری کہتی ہے جب ہم بوڑھے ہو جائیں گے اپنی، اپنی زندگیوں میں مگن، تو کبھی، کبھی جب یادوں کی البم کھولیں گے تو یہ دن جو ہم تینوں اکٹھا گزاریں گے، ایک خوب صورت یاد کی طرح یادوں کی اس البم میں محفوظ یہ دن تب ہمیں کتنی خوشی دے گا۔''

''اچھا پری ایسا کہتی ہے۔'' احمد شاہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''جی بابا، وہ کہتی ہے۔ خوب صورت لمحوں اور چھوٹی، چھوٹی خوشیوں کو کسی انمول خزانے کی طرح یادوں کی البم میں محفوظ کر لینا چاہیے اور جب کبھی بہت دکھی اور افسردہ ہوں تو یادوں کی اس البم کو کھول کر دیکھ لیا کریں تو کچھ دیر کے لیے دکھ اور غم بھول جائیں گے۔''

''ٹھیک ہی تو کہتی ہے تمہاری سہیلی...... ماضی کی خوشگوار یادیں حال کے دکھوں کو وقتی طور پر ہی سہی بھلا دیتی ہیں۔ میں بھی کبھی، کبھی یادوں کی البم کھول کر بیٹھ جاتا ہوں تو کوئی خوشگوار یاد ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آتی ہے۔'' کئی یادوں نے احمد شاہ کے دل پر دستک دی تھی۔

''کبھی ہمیں بھی تو اپنی ان خوشگوار یادوں میں شامل کریں ورنہ مجھے تو لگتا ہے جیسے آپ کی اور اماں کی زندگی میں کوئی خوشگوار یاد ہے ہی نہیں، آپ دونوں ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں سنجیدہ اور کچھ، کچھ دنیا سے ناراض سے۔'' اس نے کن انکھیوں سے امینہ کی طرف دیکھا جو سنجیدہ سی سر جھکائے پراٹھا کھا رہی تھیں۔

''ویسے آپ لوگ دنیا اور لوگوں سے اتنے خفا، خفا اور ناراض سے کیوں لگتے ہیں؟''

''یہ تو تم اپنی ماں جان سے پوچھو وہ ہی خفا رہتی ہیں دنیا سے میں تو کسی سے خفا نہیں اور ہمیشہ اللہ کی رضا پر شاکر رہتا ہوں۔'' امینہ نے ایک خشمگیں سی نظر ان پر ڈالی لیکن کہا کچھ نہیں۔

''اور میرے پاس بھی یادوں کا انمول خزانہ ہے۔''

''مثلاً......'' انشال نے اشتیاق سے ان کی طرف دیکھا۔

''مثلاً چاچا خیرو کے گھر میں لگی بیری پر پتھر مار کر بیر گرانا اور چاچا خیرو کے آجانے پر بھاگ جانا۔ قاری صاحب کی مار سے بچنے کے لیے بالن والی کوٹھری میں چھپ جانا۔ ماسے نور دین کے کھیت سے مولیاں نکال کر نہر کے پانی میں دھو کر وہاں ہی بیٹھ کر کھانا۔'' احمد شاہ لقمہ ہاتھ میں پکڑے، پکڑے اپنے بچپن کی یادوں میں کھو گئے تھے۔

''آپ بھی کس کی باتوں میں آ گئے...... ناشتا کر لیں پہلے پھر یادوں کو کھنگالتے رہیے گا۔'' امینہ کے لہجے میں بیزاری سی تھی۔

''جو حکم بیگم صاحبہ کا۔''

ہمیشہ خاموش اور اپنے آپ میں مگن رہنے والے احمد شاہ کے مزاج میں بھی خوشگواریت آ گئی تھی۔

''تو بابا......'' انشال کو یک دم خیال آیا کہ پری کے گھر جانے کی اجازت تو رہ ہی گئی۔

''میں کل چلی جاؤں پری کی طرف صبح مدرسے جاتے ہوئے۔ آپ مجھے لے جایئے گا اگر کوئی مسئلہ نہ ہو تو واپسی پر میں اس کے ساتھ آ جاؤں گی۔ ویسے اس نے کہا تھا کہ آنے میں اگر کوئی پرابلم ہو تو وہ خود ڈرائیور کے ساتھ آ کر لے جائے گی۔''

''ٹھیک ہے صبح مدرسے جاتے ہوئے تمہیں ساتھ لے جاؤں گا۔ ویسے تمہاری یونیورسٹی کب کھل رہی ہے؟''

''سوموار کو پری مجھے پک کر لے گی یا پھر پہلے کی طرح مری تک آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی اور وہاں سے پری کے ساتھ۔'' امینہ نے ایک دم سر اٹھا کر احمد شاہ کی طرف دیکھا۔

digestlibrary.com

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ چوبیس گھنٹے تو اسلام آباد میں ایک ساتھ ہی ہوتی ہیں پھر ایک دن ساتھ spend کرنے کا کیا مطلب ہے۔''
''ضروری تو نہیں ہے امینہ کہ ہر کام کے پیچھے کوئی مطلب ہی ہو۔ کچھ کام صرف دل کی خوشی کے لیے بھی تو کیے جاتے ہیں۔ بچیوں کا دل چاہ رہا ہے گھومنے پھرنے اور پڑھائی کی ٹینشن سے آزاد ہو کر ایک ساتھ کچھ وقت گزارنے کا تو اس میں بھلا کیا حرج ہے۔ رتی گلی کا علاقہ بہت خوب صورت ہے۔ گھومنے پھرنے لوگ آتے ہیں وہاں۔ میں صبح لے جاؤں گا ساتھ اور واپسی پر بھی خود ہی لے آؤں گا۔'' تسلی دیتا لہجہ بھی امینہ کو مطمئن نہ کر سکا تھا۔
''بات لانے لے جانے کی نہیں ہے، مجھے نہیں پسند کسی غیر کے گھر صبح سے شام تک گزارنا۔ پری اس کی سہیلی ہے ٹھیک ہے لیکن پتا نہیں اس کے گھر والے کیسے اور کس طرح کے لوگ ہیں ہمیں کیا پتا؟''
''اچھے معزز لوگ ہیں وہاں رتی گلی میں دو تین بار کرنل صاحب سے ملاقات ہوئی ہے۔ بڑا نام ہے ان کا۔''
''بڑا نام ہے تو کیا ہمارے لیے تو اجنبی اور غیر ہی ہیں ناں......'' وہ ناراض سی اٹھ کھڑی ہوئیں۔
''بیٹھ جاؤ امینہ آرام سے ناشتا کرو......'' احمد شاہ کے لہجے میں ہلکا سا تحکم تھا۔
''پانی ابل رہا ہوگا چائے بنا لاؤں......''
''چائے تو آج ہم اپنی انشی کے ہاتھ کی پئیں گے۔'' وہ انشال کی طرف دیکھ کر مسکرائے جس نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔
''جی بابا......'' وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔
''پراٹھا ختم کر لو پھر بنا لینا چائے۔''
امینہ بیٹھ گئی تھیں اور انشال کی پلیٹ دیکھ رہی تھیں جس میں تقریباً آدھا پراٹھا باقی تھا۔
''میں بس کھا چکی۔'' وہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔
''تم کس بے دردی سے اپنی بیٹی کا دل توڑ دیتی ہو امینہ......دیکھا تھا اس کی طرف کیسے بجھ سی گئی تھیں اس کی آنکھیں۔'' احمد شاہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔
''میں ماں ہوں اس کی، دس بار بھی اس کا دل توڑوں گی تو کچھ دیر بعد وہ سب کچھ بھلا کر پہلے جیسی ہی ہو جائے گی لیکن اگر کسی اور کی وجہ سے اس کا دل ٹوٹا تو پھر کبھی جڑ نہیں سکے گا اور میں اپنی بیٹی کو اس دائمی تکلیف سے بچانا چاہتی ہوں۔'' امینہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا لقمہ منہ میں ڈالا اور اس کی پلیٹ میں بچا ہوا پراٹھا اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھا۔
''امینہ......'' احمد شاہ نے ایک گہری سانس لی۔
''اپنے رویے میں تھوڑی سی لچک پیدا کرو، پہلے بھی کئی بار تمہیں سمجھایا ہے۔ بعض اوقات اتنی زیادہ سختی بغاوت پیدا کرتی ہے۔ اپنی بیٹی پر اعتبار کرنا سیکھو۔ ہماری انشی بہت سمجھدار ہے۔ اپنا برا بھلا خوب اچھی طرح سمجھتی ہے۔ کئی سالوں سے وہ ہاسٹل میں رہ رہی ہے۔ کیا کبھی ہمیں اس سے کوئی شکایت ہوئی۔ ایک بار تم نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ کسی ڈے اسکالر فرینڈ کے گھر نہیں جائے گی تو کیا وہ کبھی کسی سہیلی کے گھر گئی......ہم وہاں اس کی نگرانی نہیں کر رہے وہ چاہے تو ہمارے علم میں لائے بغیر کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اب وہ پندرہ، سولہ سال کی نادان اور ناسمجھ لڑکی نہیں ہے۔ یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے۔''
''ہاں وہ پندرہ، سولہ سال کی ناسمجھ لڑکی نہیں ہے لیکن میں نے دیکھا ہے چالیس، پچاس سال کی عمر کی عورت کو بھی محبت کے جال میں پھنستے ہوئے......جب مرد محبت کے چند لفظ کسی عورت کی جھولی میں ڈالتا ہے ناں تو عورت

Digest Novels Lovers group

چاہے اٹھارہ سال کی ہو جائے تیس یا چالیس کی پگھل کر موم ہو جاتی ہے۔ مرد کی محبت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ عورت اس محبت کے سامنے آگے دیکھتی ہے نہ پیچھے اس کی ساری ذہانت ساری سمجھداری محبت کے چند بولوں کی نذر ہو جاتی ہے۔''

امینہ نے جیسے ان کی بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی ان کا اپنا ہی نقطۂ نظر اور اپنی ہی سوچ تھی۔

''مجھے علم نہیں تھا کہ میری بیوی نے محبت پر اتنی ریسرچ کر رکھی ہے۔'' احمد شاہ کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ہم تو آج تک محبت کے دو بولوں سے کسی کا دل نہ پگھلا سکے۔'' پھر یک دم ہی ان کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ دل کے اندر کہیں کوئی کسک سی جاگی تھی۔

''ہو سکتا ہے تم صحیح کہہ رہی ہو امینہ لیکن بچیوں کی یہ ہی چھوٹی، چھوٹی خوشیاں ہوتی ہیں۔ اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر ہنس کھیل لے گی۔ گھومے پھرے گی اور پھر کون سا دو تین دن کے لیے جا رہی ہے۔ پہلی بار تو اس نے کہیں جانے کی اجازت مانگی ہے۔ شام کو میں خود لیتا ہوا آ جاؤں گا۔ جب سے آئی ہے کیسے چہکتی پھر رہی تھی اور اب کیسی چپ سی ہو کر رہ گئی ہے۔ تمہیں اپنی تربیت پر اعتبار نہیں ہے کیا؟''

''مجھے اپنی تربیت پر اعتبار ہے لیکن زمانے پر اعتبار نہیں ہے۔ ہماری انشی بہت سادہ اور معصوم ہے۔ بے شک وہ ماسٹر کر رہی ہے لیکن ہے تو ایک لڑکی ہی ناں اور آپ کو تو پتا ہے میں کتنی وہمی ہوں...... آپ چاہتے تھے کہ اس کے پاس کوئی ڈگری ہو۔ ورنہ میں تو کبھی اسے اپنے گھر کی چار دیواری سے باہر بھی نہیں نکلنے دیتی۔ آپ نے اس کی باتیں نہیں سنیں وہ کیسی باتیں کرنے لگی ہے۔ اس کے ساتھ پڑھنے والی لڑکیاں بہت ماڈرن اور آزاد گھرانوں کی ہیں۔ وہ لڑکوں کے متعلق کیسے منہ کھول کر باتیں کرتی ہیں۔ فلاں پر میرا دل آ گیا ہے۔ فلاں میرو پر مرتی ہے، فلاں اس پر ہزاروں خوف اور وہم میری ذات سے چمٹے ہوئے ہیں۔ میں راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں کہ کہیں میری انشی بھی اپنی سہیلیوں کی باتوں میں نہ آ جائے۔ ہاسٹل میں رہنا اس کی مجبوری نہ ہوتی تو میں کبھی اسے وہاں نہ بھیجتی۔ یہاں آنے کے بجائے اگر راولپنڈی یا اسلام آباد میں ہی کہیں جاب مل جاتی تو اچھا تھا۔ وہ اپنے گھر میں ہمارے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے رہتی۔'' امینہ کی آنکھوں میں خوف کے سائے سے لہرائے تھے۔

''اللہ پر بھروسا رکھو امینہ...... اس بار گاؤں جائیں گے تو میں بات کروں گا میرو اور انشی کے رشتے کی۔''

احمد شاہ نے اطمینان سے اپنا پراٹھا ختم کر کے چھوٹے سے تولیا، رومال سے ہاتھ پونچھے جو کھانے کے وقت اپنے ساتھ...... ہی رکھتے تھے۔

''اللہ کرے اس بار چھٹیوں میں میرو بھی اپنی اماں کو ساتھ لے آئے بات کروں گا اس سے۔''

''آپ پہلے اماں سے بات کر لیں وہ کیا کہتی ہیں۔'' امینہ، احمد شاہ کی بات سن کر مطمئن نظر آنے لگی تھیں۔

''بات اماں کی نہیں ہے امینہ...... وہ تو خود کب سے ایسا چاہتی ہیں، بات ازمیر اور اس کی ماں کی ہے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔''

''آپا، اماں کی بات سے کبھی انکار نہیں کریں گی، مجھے یقین ہے۔'' امینہ نے میز پر سے پلیٹیں اور پیالے اٹھا کر ٹرے میں رکھے۔

''کبھی، کبھی یقین ٹوٹ جاتا ہے امینہ......'' ان کے لبوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''اگر اس کی مرضی نہ ہوئی تو پھر میرو اور اماں بھی اسے راضی نہیں کر سکیں گی۔ تم دعا کرتی رہا کرو مجھے بھی اپنی انشی کے لیے میرو بہت پسند ہے۔''

انہوں نے باورچی خانے سے باہر آتی انشال کی طرف دیکھا۔ ایمنہ نے میز پر پڑی پلیٹیں وغیرہ ایک طرف کر کے ٹرے رکھنے کی جگہ بنائی۔ انشال نے ٹرے میز پر رکھی اور چائے کا کپ اٹھا کر احمد شاہ کی طرف بڑھایا۔

’’یہ لیں جی میرے ہاتھ کی بنی چائے پئیں اور بتائیں کیسی ہے۔‘‘

’’بغیر پیے ہی بتا سکتا ہوں کہ بہت اچھی ہوگی اس لیے کہ ہماری انشی نے بنائی ہے۔‘‘ احمد شاہ مسکرائے۔

’’ویسے بابا ہاسٹل میں چائے مجھ غریب سے ہی بنوائی جاتی ہے۔ چاہے دس بار بنانی پڑے۔ پری اور سبو کو ٹھیک سے چائے بنانی ہی نہیں آتی۔ سبو کا کبھی موڈ ہو تو کافی بنا لیتی ہے۔‘‘ بظاہر شوخی سے کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئی لیکن اس کی آنکھیں اس کے لہجے کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ اس نے ماں کی طرف نہیں دیکھا تھا ان کے دل کو کچھ ہوا۔

’’اب ایسے منہ کیوں بنایا ہوا ہے تمہارے بابا نے اجازت دے تو دی ہے جانے کی۔‘‘

’’لیکن میں اب ایسی بھی نافرمان نہیں ہوں کہ اپنی چھوٹی سی خوشی کے لیے اپنی ماں کو ناراض کر کے جاؤں......‘‘ اس نے چائے کا کپ اٹھا کر ماں کی طرف بڑھایا۔

’’آپ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں کہ وہاں ہر وقت کا ساتھ ہے تو یہاں پھر ایک ساتھ پورا دن گزارنے کی کیا ضرورت ہے۔‘‘

’’ماں، باپ کے لیے اولاد کی چھوٹی، چھوٹی خوشیاں بھی بہت اہم ہوتی ہیں لیکن پتا نہیں میں کیسی ماں ہوں انشی......ڈرپوک، وہمی ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں کہ میرے بچوں کو کچھ ہو نہ جائے۔ مجھے باہر کی دنیا سے خوف آتا ہے جیسے باہر کوئی عفریت ہو جو میرے بچوں کو اچک کر لے جائیں گے۔ اگر تمہارے بابا کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں کبھی تمہیں گھر سے باہر جانے ہی نہیں دیتی۔ یہ جو آج تم یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہو تو یہ صرف تمہارے بابا کا دیا ہوا حوصلہ

گھر کے ہر فرد کے لیے ماہنامہ پاکیزہ کراچی

کے باذوق قارئین کے لیے خوشخبری

کون خوابوں کے پار رہتا ہے

خوابوں، خیالوں اور تخیلات کی دنیا ہمیشہ ہی مسحور کن لگتی ہے۔ سنہرے اور روپہلے خوابوں پر نہ کسی کو اختیار ہے اور نہ ہی کوئی قدغن لگا سکتا ہے۔ امنگوں، آرزوؤں کی تکمیل میں تخیلاتی دنیا کبھی معاون ہوتی ہے تو کبھی انسان مایوس بھی ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں مایوسی بھی آگے بڑھنے میں معاون ثابت ہو تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

حسیں داستاں اور خوابوں کی تعبیر ...... ایسے ہی تو بنتی ہے ایک دلکش تحریر

مایہ ناز، قلمکار، ہردلعزیز ناول نگار محترمہ

افشاں آفریدی

کے ماہرانہ انداز بیان کا ایک اور دلکش، حسین و پرلطف قسط وار ناول

جلد ہی ماہنامہ پاکیزہ کے صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

ہے۔ سب مائیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ میں تمہاری سہیلیوں کی ماؤں جیسی نہیں ہوں...... بے خوف، نڈر، ہزاروں وسوسے اور وہم کسی آکٹوپس کی طرح میرے دل ودماغ کو جکڑے رکھتے ہیں۔'' امینہ کی آنکھوں میں نمی سی تھی۔

''اوکے اماں آپ ڈپریس نہ ہوں کہہ تو دیا کہ نہیں جاؤں گی بس اب خوش ہوجائیں۔'' اس نے امینہ کے بازو پر ہاتھ رکھا اور مسکرائی۔

''اور ہاں آپ میرے اور رومی کے لیے پریشان نہ ہوا کریں، یہ یقین رکھیں کہ ہم ہمیشہ آپ کی دعاؤں کے حصار میں ہوتے ہیں اور کوئی عفریت ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ اور اب اپنا موڈ ٹھیک کرلیں۔ نہیں جارہی میں۔''

''تمہارے بابا نے اجازت دے دی ہے تو میں کون ہوتی ہوں تمہیں منع کرنے والی۔'' نروٹھے انداز میں کہتے ہوئے امینہ نے چائے کا کپ اٹھایا اور گھونٹ بھرنے لگیں لیکن چہرے پر اب پہلے جیسا تناؤ نہیں تھا۔

''آپ میری بہت پیاری اماں ہیں اور آپ کا حکم سر آنکھوں پر اور بابا کی بھی کیا مجال ہے کہ وہ آپ کے دیے ہوئے حکم پر اپنا حکم صادر کریں۔''

اب کے انشال پورے دل سے مسکرائی تھی۔ احمد شاہ جو گھونٹ، گھونٹ چائے پیتے ہوئے دونوں ماں، بیٹی کی باتیں سن رہے تھے بے اختیار مسکرادیے۔

''اور میں تو اپنی اماں کے حکم پر اپنی جان بھی قربان کرسکتی ہوں۔''

''اچھا اب زیادہ ڈراما کوئین مت بنو جلدی سے چائے ختم کرو اور جاکر برتن دھوکر کچن سمیٹ لو۔ میں تمہارے بابا کے ساتھ مری جارہی ہوں۔ پہلی بار اپنی دوست کے گھر جارہی ہو تو کیا خالی ہاتھ جاؤ گی...... کیا خیال ہے پری کی ماما اور دادی کے لیے شال ٹھیک رہے گی اور پری کے لیے بھی کوئی گفٹ لے لوں گی۔'' امینہ نے محبت سے انشال کی طرف دیکھا۔

''میری پیاری اماں جان......'' انشال نے اٹھ کر پیچھے سے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''خوشی سے اجازت دے رہی ہیں یا بابا کے کہنے پر؟''

''خوشی سے۔'' امینہ نے اس کے ہاتھ پر پیار کیا۔

''ویسے پیاری اماں...... کیا آپ کی اماں بھی ایسی ہی تھیں۔ وہمی، ڈرپوک......'' انشال نے جھک کر پوچھا۔

''میری اماں......'' امینہ کے مسکراتے لب بھنچ گئے۔

''وہ تو میری کم عمری میں ہی مرگئی تھیں۔ مجھے ان کے متعلق کچھ یاد نہیں ہے۔''

''سوری...... اماں میں نے آپ کو اداس کردیا۔'' انشال شرمندہ ہوئی۔

''نہیں...... کوئی بات نہیں...... تم جاؤ اب یہ برتن اٹھالو...... اور ہاں پری کے لیے کیا گفٹ لوں......؟''

''اپنی مرضی سے کچھ بھی لے لیں۔ کوئی ہینڈ بیگ اچھا مل گیا تو وہ لے لیں...... یا جو بھی آپ کو اچھا لگے۔''

انشال نے میز پر سے خالی کپ اور پلیٹیں اٹھا کر ٹرے میں رکھے اور باورچی خانے میں چلی گئی تو احمد شاہ نے امینہ کی طرف دیکھا جن کی آنکھوں سے آنسو رخساروں پر پھسل آئے تھے۔

''امینہ اس طرح کیوں رو رہی ہو؟''

''اپنی ماں کا خیال آگیا تھا۔ وہ میرے لیے اتنی ہی وہمی ہوتیں یا مجھ سے مختلف ہوتیں۔ کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنے والدین کے سائے تلے پلتے ہیں۔ میں نے ماں کی محبت دیکھی ہوتی تو مجھے پتا

ہوتا...... مائیں کیسی ہوتی ہیں۔ شاید اسی لیے میں اچھی ماں نہیں ہوں...... میرے بچوں کو نہ جانے مجھ سے کتنی شکایتیں ہوں گی۔'' آنسوؤں میں روانی آگئی تھی۔

''تم بہت اچھی ماں ہوامینہ لیکن کیا تم خود کو خوش نصیب نہیں سمجھتیں۔ تمہارے والدین تمہاری کم عمری میں چلے گئے۔ کچھ دکھ کچھ محرومیاں تقدیر میں لکھی ہوتی ہیں لیکن پھر اللہ نے تمہیں انشال اور رمیز دیے تمہیں ماں کے رتبے سے سرفراز کیا۔'' احمد شاہ کا وہی مخصوص اور دھیما لہجہ جو ہمیشہ امینہ کے دل میں سکون بن کر اترتا تھا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے میں تو اللہ کا شکر ادا کرتے تھکتی نہیں ہوں کہ اس نے مجھے آپ کا ساتھ دیا۔ اتنے پیارے بچے دیے۔ بس کبھی، کبھی اپنی محرومیاں یاد کر کے دل بھر آتا ہے۔'' انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

''خوش رہا کرو امینہ۔'' احمد شاہ کتاب اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

''میں دل سے تمہیں خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتا ہوں۔'' بات مکمل کر کے وہ رکے نہیں تھے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ امینہ کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ ہمیشہ کی طرح وہ انہیں نہیں بتا سکی تھیں کہ ان کا ساتھ پا کر وہ کتنی خوش اور مطمئن ہیں۔ آنسوؤں نے ایک بار پھر یلغار کی لیکن انہوں نے ان آنسوؤں کو باہر نہیں آنے دیا اور وہاں ہی بیٹھے، بیٹھے ماضی کے اوراق الٹنے لگی تھیں۔

☆☆☆

رابی نے آہستگی سے اپنے مشترکہ کمرے کا دروازہ کھولا۔ سامنے ہی بیڈ پر گڑیا گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ ہولے، ہولے چلتی ہوئی بیڈ کے قریب آئی اور گڑیا کو دیکھنے لگی۔ خوب صورت آنکھوں کے پپوٹے سوجے ہوئے تھے۔ لانبی مڑی ہوئی پلکیں صبیح رخساروں پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔ وہ بہت پُرسکون نیند سو رہی تھی رابی جو اسے اٹھانے آئی تھی اس کا جی نہ چاہا کہ اسے اٹھائے حالانکہ اس کا پسندیدہ ڈراما آنے والا تھا وہ اسی طرح آہستگی سے دروازہ بند کرتے ہوئے لاؤنج میں آئی اور ابھی نیچے جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھی ہی تھی کہ ثریا اپنے بیڈ روم سے باہر نکلیں۔

''اے رابی ذرا اِدھر تو آ......'' اور رابی ان کی طرف بڑھی۔

''جی امی......''

''اِدھر کمرے میں آ......'' وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

''ذرا اپنے ابو کا نمبر تو ملا دو...... کتنی بار آپریٹر کو کال کی ہے۔ لیکن وہ نمبر ہی نہیں ملا کے دے رہا۔ یا پھر تمہارے پاس کوئی کالنگ کارڈ ہے تو اس سے ملا دو...... بات لمبی ہی ہو جائے گی۔''

''خیریت ہے اماں، ابھی کچھ دیر پہلے تو ان سے بات ہوئی ہے آپ کی۔'' رابی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''خیریت ہے بس ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' وہ بھی بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''میرے پاس تو کالنگ کارڈ نہیں ہے شاید اسفند بھائی کے پاس ہو پتا کرتی ہوں......''

رابی اٹھنے لگی تو ثریا نے منع کر دیا۔

''رہنے دو آپریٹر کا نمبر ملاؤ اور چھ منٹ کی کال بک کروا دو۔'' اس سے پہلے کہ وہ نمبر ملاتی فون بج اٹھا۔ ثریا جو بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں انہوں نے فوراً بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو......''

''کیا بات ہے دو بار فون آچکا ہے، میں فارغ نہیں تھا خیریت ہے ناں......؟''

اسپیکر آن تھا احمد حسن کی آواز سنائی دی تو ثریا نے تشکر بھری سانس لی۔

''سب خیریت ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔ ضروری بات کرنی تھی، شکر ہے آپ نے فون کر لیا میں ابھی

Digest Novels Lovers Group

کرنے ہی والی تھی۔''

''آخر ایسی کیا آفت آگئی۔ ابھی تو اتنی لمبی بات ہوئی ہے۔ مفت میں تو فون نہیں ہوتا اچھا خاصا بل آجاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بچت کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ بچوں کی تعلیم اور شادی بیاہ میں کام آئے گی بہرحال کہو کیا کہنا ہے۔''

''یہی...... یہی تو بات کرنی تھی مجھے آپ سے۔'' ثریا پُرجوش ہوئیں کہ تمہید نہیں باندھنی پڑی۔

''ہمیں اپنے بچوں کا بھی سوچنا ہے۔ اسفند اور رانی کی تعلیم ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ صوفی کی شادی سر پر کھڑی ہے اور آپ نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا اسفند کو کہ گڑیا کو کالج میں ایڈمشن دلوا دو۔ سوچا بھی ہے کہ کتنا خرچ بڑھ جائے گا۔ کتابوں کا، ایڈمشن فیس، ویگن کا کرایہ اور پھر آپ کی لاڈلی اتنی لائق فائق بھی تو نہیں ہے کہ خود سے پڑھ لے۔ پہلے بھی اسفند نے جان ماری اس کے ساتھ تو اتنے نمبر لیے ہیں اب تو ٹیوشن کی فیس الگ سے دینی ہوگی۔ آج کل یہ اکیڈمی والے بھی لوٹ ہی رہے ہیں۔ وہاں آنے جانے کے لیے الگ سے ویگن لگوانی پڑے گی۔''

''اوہ...... مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ میری بیگم اتنی گہرائی میں بھی سوچ سکتی ہیں۔'' احمد حسن کا لہجہ سادہ سا تھا۔

''ہاں تو اور کیا...... ہمیں اپنے بچوں کا بھی تو سوچنا ہی ہے ناں...... ماں تو اس کی ہمارے در پر اسے پھینک کر چلی گئی۔ مڑ کر خبر ہی نہیں لی۔ اس کا بھی کچھ فرض ہے کہ نہیں۔'' ثریا پُرجوش ہوئی تھیں۔

''ہاں فرض تو تھا اس کا لیکن اب مجبوری ہے۔ کون سا اس پر اربوں خرچ ہو جانے ہیں۔'' احمد حسن کے ٹھنڈے ٹھار لہجے کو رانی نے محسوس کیا تھا لیکن ثریا نے نہیں۔

''لاکھوں خرچ ہیں اور ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے ہماری۔'' ثریا تڑخ کر بولی تھیں۔

''منع کر دیں اسفند کو بتا دیں اسے کہ آپ اس کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے...... اپنے بچوں کا بھی سوچنا ہے کچھ آپ نے...... سالوں سے اس کا خرچ برداشت کر رہے ہیں۔''

''بہت شکریہ...... یہ احساس دلانے کا۔'' احمد حسن کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔

''لیکن آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میری بہن پچھلے پانچ چھ سالوں سے نہیں آسکیں اس سے پہلے اگر آپ کی یادداشت کمزور ہے تو آپ کو یاد دلا دوں کہ وہ باقاعدگی سے ہر ماہ میرے منع کرنے کے باوجود اس کا خرچ بھیجتی تھیں۔ اور تحفے تحائف اس کے علاوہ۔ جب بھی آتیں آپ سمیت سب کے لیے ڈھیروں تحفے اور وہ بھی بہت قیمتی لے کر آتی تھیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ بہت بیمار تھیں میں نے ہر جگہ ان کے لیے پیغام چھوڑے ہیں پتا نہیں اب وہ اس دنیا میں ہیں بھی یا نہیں...... ہوتی تو ضرور رابطہ کرتی۔'' احمد حسن کی آواز بھرا گئی تھی۔

''ہاں تو اب وہ تو نہیں ہے اس دنیا میں تو کیا ہم نے اس کا ٹھیکا لے رکھا ہے کہ ساری زندگی اس کو پالتے رہیں گے۔ نہ بھئی نہ......'' ثریا نے دایاں ہاتھ یوں ہلایا جیسے احمد حسن ان کے سامنے بیٹھے ہوں۔

''مجھے نہیں کروانا اسے کالج میں داخل...... میں اپنے بچوں کا حق کیوں ماروں......''

''بالکل آپ اپنے بچوں کا حق کیوں ماریں۔ بجا فرمایا آپ نے۔'' احمد حسن جب غصے میں ہوتے تو ثریا کو یوں ہی آپ جناب کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

''مجھے آپ سے اتفاق ہے لیکن بات یہ ہے ثریا بیگم کہ اس کا جو حق ہے وہ تو اسے ملنا ہی چاہیے۔ گوجر خان والے گھر میں میری بہن کا بھی قانوناً اور شرعاً حصہ ہے تو اس کے حصے کی رقم تو اسے ملنی چاہیے ناں اور ہاں وہ جو آبائی زرعی زمین فروخت کر کے اسلام آباد میں پلاٹ خریدا تھا اس میں بھی گڑیا کی ماں کا حصہ ہے اور میں نے اس کی اجازت کے بعد ہی زمین فروخت کر کے پلاٹ خریدا تھا تو اسفند یار سے کہو کہ کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کر لے اور کل ہی گڑیا کا اکاؤنٹ کھلوا کر پلاٹ فروخت کرنے کے بعد اس کے حصے کی رقم اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دے۔ اس کے تعلیمی اخراجات کے لیے۔ کسی وکیل سے بھی بات کر کے حساب کتاب کروا لے سارا۔ اور ہاں

digestlibrary.com

اس میں کچھ وقت تو لگے گا تو جیا کا جو زیور ہے تمہارے پاس جو وہ گڑیا کے لیے اماں جان کے پاس رکھوا گئی تھیں اور اماں جان نے مرنے سے پہلے تمہارے حوالے کیا تھا اس میں سے کوئی ایک چیز فروخت کر دو۔ اسفند کو کہنا اس سے جو رقم ملے اس میں سے اس کے ایڈمشن وغیرہ پر خرچ کر لے۔''

ثریا ساکت بیٹھی تھیں یوں جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔

''پھر بھی اگر تمہیں اس کا وجود گھر میں برداشت نہیں ہو رہا تو اسفند کو کہو واپس جانے سے پہلے اسے ہاسٹل میں داخل کروا دے۔''

''نہ.... نہیں میرا یہ مطلب تو نہیں تھا۔'' ثریا بیگم ہکلائیں۔

''میں تمہارا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا ہوں ثریا بیگم بہتر ہے کہ جو میں نے کہا ہے وہ اچھی طرح تم بھی سمجھ لو۔'' احمد حسن کا لہجہ حتمی تھا۔

''وہ...... وہ پلیز میری بات تو سن لیں حسن، میں تو صرف یہ چاہ رہی تھی کہ صوفی کی شادی ہے تو گڑیا کا ایڈمشن اگلے سال ہو جائے گا۔ کون سا اتنی عمر ہو گئی ہے اتنا کام ہے...... میں اور صوفی بازاروں کے چکر لگائیں یا گھر دیکھیں۔ رابی کو تو اپنی پڑھائی سے ہی فرصت نہیں گڑیا گھر پر ہوتی ہے تو میں تسلی سے شاپنگ کے لیے جا سکتی ہوں پھر اکیلے میں نہیں سنبھال سکتی۔''

ثریا نے آخری پتا کھیلنے کی کوشش کی۔ سمجھتی تھیں کہ گڑیا ایک سال پڑھائی چھوڑ کر گھر بیٹھی تو پھر خود بخود ہی اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو جائے گا۔

''میں آپ کی عقلمندی اور سمجھداری کا قائل ہو گیا ثریا بیگم۔'' احمد حسن کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا۔

''تو ایسا ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ گڑیا کا سال ضائع ہو تو آپ یوں کریں کوئی کل وقتی ملازمہ رکھ لیں۔ سیکنڈ فلور پر ایک روم ہے ناں مع اٹیچڈ باتھ..... تو وہ وہاں رہ لے گی اسی مقصد کے لیے بنایا گیا تھا۔''

''کوئی اعتبار والی ملازمہ ملنا تو جیسے بڑا آسان ہے ناں......'' ثریا اپنی آخری حد تک کوشش کرنا چاہتی تھیں۔

''ہوں تو ایسا کریں صوفی کی سسرال میں کہیں..... ایک بار اس کی ساس نے کہا تھا کہ وہ گاؤں سے کسی خاتون کو یا بچی کو بلوا لیتی ہیں جب آپ بیمار ہوئی تھیں۔ ان کے گاؤں سے آنے والی بااعتبار بھی ہو گی اور خدمت گزار بھی ہو گی۔'' مشورہ دے کر احمد حسن نے فون بند کر دیا تھا۔ چند لمحے تو وہ ریسیور ہاتھ میں ہی پکڑے رہیں پھر ریسیور کریڈل پر پٹختے ہوئے رابی کی طرف دیکھا۔

''تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ جا کر دیکھو وہ مہارانی آرام کر چکی ہو تو اسے اٹھاؤ آٹا گوندھ کر روٹیاں پکا لے۔ اب میرا بچہ گھر آ کر بھی باہر کی روٹیاں کھائے جبکہ اسے تندور کی روٹی بھی پسند ہی نہیں رہی۔''

''اس کے ہاتھ پر چائے گری تھی آگ کی تپش پڑے گی تو جلن زیادہ ہو گی۔''

رابی کھڑی ہو گئی تھی۔

''اب تم باپ کی طرح لیکچر دینے نہ کھڑی ہو جاؤ۔ پتا نہیں کیوں باپ سمیت سب کے دل میں اس کی ہمدردی کا بخار...... ہر وقت چڑھا رہتا ہے۔'' ثریا نے احمد حسن پر آیا غصہ اس پر اتارا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا امی کہ آپ کو گڑیا سے کیا پرابلم ہے۔ اتنی معصوم اور پیاری سی ہے پہلے تو آپ بھی اس سے پیار کرتی تھیں پھر اچانک یہ پیار ختم کیسے ہو گیا۔'' رابی اور اسفند ہی تھے جو گڑیا کے معاملے میں ان سے بحث کر لیتے تھے۔

''جو بھی پرابلم ہے تمہیں اس سے کیا۔'' ثریا جھنجلائی تھیں۔

''اور کوئی پیار ویار نہیں تھا مجھے اس سے۔ میری مجبوری تھی اس کو سنبھالنا۔ تمہاری دادی تو ہر وقت میری نگرانی کرتی تھیں کہ کہیں ان کی لاڈلی نواسی کو میں کچھ کہہ نہ دوں پیار کرنے کے لیے اپنی اولاد تھی پرائی اولاد سے کیوں پیار کرتی میں۔''

رابی نے تاسف سے اسے دیکھا۔
''پرائی کیوں امی...... ہماری جیا پھپو کی بیٹی ہے۔''
''تمہاری پھپو کی بیٹی اور تمہارے باپ کی بھانجی ہے۔ میرا کیا رشتہ ہے اس سے۔'' ثریا کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اندر اٹھتے ابال کو کیسے کم کریں سو غصے میں بچ بولتی جا رہی تھیں۔
''کیا شوہر کے حوالے سے بننے والے رشتے پرائے ہوتے ہیں امی وہ بھی تو آپ کے اپنے ہی ہوتے ہیں۔''
رابی بدستور تاسف سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
''زیادہ بک بک مت کرو اور جو میں نے کہا ہے وہ کرو۔ محترمہ سے کہو نو بجے تک روٹیاں پکالے۔'' وہ رات کا کھانا آٹھ بجے والا ڈراما دیکھ کر ہی کھاتے تھے۔ رابی اس بار خاموشی سے باہر چلی گئی جانتی تھی کہ اگر اس نے ان کی بات نہ مانی تو ان کا عتاب گڑیا پر ہی ہوگا۔ گو اس کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا اتنی پُرسکون نیند سوئی گڑیا کو اٹھانے کا لیکن اس نے اسے اٹھا دیا۔
''اٹھو گڑیا تمہارا ڈراما لگ گیا ہے۔''
''کیا......؟'' وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔
''ایک وقفہ تو ہو گیا ہوگا...... ذرا پہلے جگا دیتیں۔''
''تم اتنے سکون سے سو رہی تھیں کہ جی نہیں چاہ اٹھانے کا اب جلدی سے آجاؤ ابھی اشتہار چل رہے ہوں گے۔''
رابی دروازے کی طرف بڑھی تو وہ بھی دونوں ہاتھوں سے بال پیچھے کرتی پاؤں میں چپل پہنتی اس کے پیچھے لپکی۔ ابھی اشتہار ہی چل رہے تھے۔ اسفند یار کی نظر بے اختیار اس کی طرف اٹھی۔ نیند سے جاگنے کی وجہ سے آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے، اسفند اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکا۔
''شکر ہے۔'' کہتی ہوئی وہ صوفی کے پاس بیٹھ گئی۔
''کیا ہوا آپی...... وہ مر گئی کیا......''
''نہیں...... بچ گئی۔'' اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔
''اگر وہ مر جاتی ناں تو بہت رونا آتا مجھے۔ میں نے بڑی دعائیں کی تھیں کہ زریں کو کچھ نہ ہو۔'' اس نے اطمینان بھری سانس لی تھی۔
''پگلی یہ حقیقت تھوڑی ہوتی ہے...... کہانی ہوتی ہے۔ اصل میں تو نہیں مرتے ناں...... ایک کردار ہی تو ہوتا ہے۔''
''ہاں تو لیکن کردار سے بھی تو ہمدردی ہو جاتی ہے۔'' معصومیت سے کہتے ہوئے اسفند کو وہ اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ایک تو وہ تھی ہی خوب صورت اس پر کم عمری کی معصومیت...... اپنے چہرے پر اسفند کی نظروں کی تپش محسوس کرتے ہوئے اس نے ذرا سا دائیں طرف رخ موڑ کر اسفند کی طرف دیکھا۔ نظریں اسفند کی نظروں سے ملیں تو دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ اسفند کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ گڑیا نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ ایک نئے اور بالکل انوکھے جذبے سے آشنا ہوتا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا اور آنکھوں نے خواب بننے شروع کر دیے تھے۔ محبت کے ہفت رنگ خواب اور محبت کے اس سفر میں وہ تنہا نہیں تھی اسفند کی آنکھیں بھی ان ہفت رنگ خوابوں سے سجی ہوئی تھیں۔

(جاری ہے)

سوالیہ نشان

دردانہ نوشین خان

Digest Novels Lovers Group

سبز آنکھوں والا دراز قامت، خوبرو توصیف جہانگیر لڑکے، لڑکیوں کے گروہ میں نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ وہ خود سراپا جمال تھا اور جمال پرست بھی تھا۔ اس کی نظروں کا تخاطب ہمیشہ کوئی زرنگار صورت کوئی اجلا چہرہ ہوتا عام چہروں، عام لوگوں کو اس کا غرور کسی شمار میں نہیں رکھتا تھا۔

گندمی رنگت، مناسب نین نقش والی ساویہ خان ذہانت میں سارے بیچ پر سبقت لیتی تھی۔ ہر امتحان

میں ٹاپ پر کنداں نام ہر تیسرے مہینے وظائف کا چیک وصول کرنے والی سماویہ، رشک بھری مبارک بادیں وصول کرنا جس کا معمول تھا اس کے دل میں کسی چور لمحے نے ایسی نقب لگائی کہ سبز آنکھوں والا اس کی ذہانت کے دلائل اعترافات کو رد کرتا سیدھا دل میں جا اترا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ بندہ سادہ کپ، میلی کرسی، پرانا لباس اور عام وجود سے دور بھاگتا ہے۔ وہ اسے سمجھانا چاہتی تھی...... حسن ایک بے شعور خوشنمائی ہے وہ حق اور سچ سے اسے روشناس کرانا چاہتی تھی۔ اعلیٰ اسوہ، کردار و سیرت کے اس کے پاس ٹھوس دلائل تھے مگر وہ ان کی مدد سے تقریری مقابلہ تو جیت سکتی تھی توصیف کے سامنے وہ ایک ''درخواست'' یعنی کمزور التجا جیسے لگتے۔ اس لیے وہ اسے زبان پر کبھی نہ لائی۔ کبھی وہ اپنی تو یوں کا رخ خود اپنی ہی جانب کر لیتی۔

''اے مس ٹاپ ون...... تمہیں بھی دور ٹھہرے دراز سائے کی سورج کی شعاعوں میں چمکتے سنہرے بال، کسی پورٹریٹ جیسی شفاف سبز آنکھیں، لشکارے مارتا ہوا رنگ روپ اور ناز بھری مسکراہٹ نے اپیل کیا تو اپنے منطقی دلیلوں کی گٹھری اپنے پاس رکھو۔ من نہ کردم شما حذر بہ کیند...... واہ بی بی۔'' کبھی وہ خود کو سخت ڈانٹتی تو کبھی خود کے لیے جواز پیش کرتی۔

''نہیں یہ الزام ہے۔ میں نے اسے بعد میں دیکھا پہلے سنا، وہ اس روز بول رہا تھا...... بات غالباً ٹک ٹاک...... یا ایف بی ریلیز کی بے مقصدیت کی تھی۔ اس کا اعتماد...... مگر وہ میرا ہم خیال بول رہا تھا۔''

''تو کیا ہم خیال بولنے والا ہر کوئی محبوب بن جاتا ہے؟''

''نہیں، نہیں، یہ بات نہیں ہے۔'' اور پھر وہ اداس ہو جاتی۔ اور یہ تو کبھی سماویہ خان کی خودداری سے توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ توصیف جہانگیر کے آس پاس ایسے بھی پھرے گی۔

پھر ایسا ہوا کہ میرال آ گئی۔

میرال...... گویا حسینۂ عالم...... توصیف جہانگیر کا پرفیکٹ جوڑ...... وہ یوسف ثانی یہ آسمانی حور......

یونیورسٹی کی دوسری منزل کی بلیک وڈ ریلنگ پر اس کی نقرئی تراشیدہ انگلیاں، سائڈ پوز سے آرٹ کی گئی مورتی کی طرح صراحی دار گردن، ہنسلی کی نمایاں ہڈی...... رخسار کی جا لائن (jaw line) تیکھی ناک، اسٹرابری ہونٹ وہ مصوری کا شاہکار تھی۔ جسے کچھ فاصلے پر ٹھہرے توصیف نے دیکھا اور دیکھتا چلا گیا اور توصیف کے اس دیکھنے کو سماویہ نے دیکھا اور من کے کانچ کا کھلونا بلندی سے گرا اور پاش، پاش ہو گیا۔ یہ تو اظہر من الشمس ہو گیا۔ زلزلہ ہائی ریکٹر اسکیل کا تھا مگر تھم جلد گیا۔ تصویر ہٹ گئی تھی۔ دیکھنے والا ابھی تک منظر کریدتا بے حس و حرکت موجود تھا۔ تیسرا وجود مکمل منہا ہو چکا تھا۔

عجیب لڑکی نکلی میرال بھی...... وہ جس کے حسنِ جہاں تاب سے لوگ متاثر تھے۔ وہ سماویہ خان سے متاثر نکلی۔

''تو آپ ہیں وہ اسکالر شپ آن گوگنگ گرل، scholr ship ongoing girl......''

''کیا مطلب......؟''

''آپ سے ملاقات میرے لیے اعزاز ہے۔''

''ارے...... شرمندہ کر رہی ہیں۔''

''لکھنؤ یونیورسٹی سے آئی ہیں؟'' کسی تیسری نے گرہ لگائی۔

"no infact I was really impressed by her acdemic victories"

اس پہلی ملاقات میں دونوں اپنے پلے رشک کی... گھڑولیاں سر پر اٹھائے دوستی کے کنویں کی جانب بڑھیں اور بڑھتی چلی گئیں۔

''سماویہ...... سوچو یہ سال 1823ء ہے۔ ایک رئیس کی صاحبزادی اور چرواہے کی جاہل بیٹی کی دوستی ہو گئی ہے۔ رئیس کی صاحبزادی نے قاہرہ، مشہد، قرطبہ اور آکسفورڈ سے کتب منگوا کر پڑھ رکھی ہیں۔ چرواہے کی

بیٹی کھیل کود کی شوقین...... بتاؤ رشک کس پر کرنا چاہیے۔''

''اے چرواہے کی چنچل جاہل بیٹی......! یہ فیصلہ کسی شاعر، فنکار سے کروالو...... کسی مصور کسی عاشق نامراد سے کروالو...... ذہین صاحبزادی اتنا جانتی ہے یہ 1823ء نہیں ہے، یہ 2023ء ہے۔ ذہانت، دیانت، صداقت، اپنا شباب گزار چکی ہیں اب انہیں ضعیفی کا سامنا ہے۔ یہ مادیت، ظاہریت اور چکا چوند کی رغبت کا دور ہے۔''

''فیصلہ شاعر سے کیا کرانا ہے، وہ تو دیوانہ ہوتا ہے فنکار کہاں کا دانش مند فرزانہ ہوتا ہے۔ مصور کو تو سب fine ہی دکھتا ہے۔ اور عاشق فریب کار بھونرا ہے۔''

ان کی دوستی میں بھی ٹھنی رہتی تھی اور آس پاس توصیف، موجود ہوتا۔ وہ تو میرال کا سایہ تھا اور میرال سایوں کی عادی تھی۔

توصیف کو اپنے منہ زور عشق کے اظہار کے لیے الفاظ کی ضرورت تو نہ تھی اس کی تو آنکھیں نثار جاتی تھیں۔ تاثرات اعلان کرتے تھے پھر بھی اس نے اظہار کر ڈالا۔

''سن اے مس ورلڈ...... میں چار سال سے اس یونیورسٹی میں ہوں...... ان چار سالوں میں کوئی آٹھ، دس لڑکیاں تو میری خاطر خودکشی کرنے والی تھیں وہ کیا کہا ہے شاعر نے......

ہزار چہرے ہزار آنکھیں......
میں کس کو دیکھوں میں کس کو سوچوں......

ایسا ہی ہے ناں شعر...... میرال...... look at me میں سراپا جمال ہوں اور جمالیات پسند ہوں۔'' وہ اپنے اور پھر میرال کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''مسٹر سراپا جمال...... آپ جمالیات پسند ہیں۔ شوق سے اپنا شوق جاری رکھیں، اپنے شوق میں مجھے گھسیٹنے کا آپ کو کوئی حق نہیں......''

توصیف کے پاس بہت دلائل تھے اور آخری دلیل ''عشق'' تھی۔

میرال کے پاس ہر دلیل کا رد تھا اور سب سے

ناکام معاشرے

جب روسی مصنف انتون چیخوف سے ناکام معاشروں کی فطرت کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا۔

''ناکام معاشروں میں ہر دانا کے مقابلے میں ہزار احمق ہوتے ہیں اور ہر شعوری بات کے مقابلے میں ہزار بیوقوفانہ باتیں ہوتی ہیں۔ اکثریت ہمیشہ بیوقوف رہتی ہے اور مسلسل دانا لوگوں پر غالب آتی ہے۔ اگر آپ دیکھیں کہ کسی معاشرے میں فضول موضوعات زیرِ بحث بنے ہوئے ہیں اور بیوقوف لوگ منظرِ عام پر چھائے ہوئے ہیں تو آپ ایک انتہائی ناکام معاشرے کی بات کر رہے ہیں۔

از: عرشیہ جنید، کراچی

سب اچھا

میری ماں جی ہر ایک کو اچھا کہتی تھیں۔ ہم پوچھتے کہ آپ کسی کو برا کیوں نہیں کہتیں؟ ماں جی جواب دیتیں! کسی کو اچھا کہو گے تو اچھا ثابت کرنا اس کی ذمے داری ہے اگر اسے برا کہو گے تو اس کو برا ثابت کرنا تمہاری ذمے داری ہے۔ تو تم کیوں کسی کی ذمے داری اپنے سر لیتے ہو۔ از: سنبل ملک، لاہور

کمزور دلیل ''عشق'' تھی وہ کہہ رہی تھی۔

''مسٹر توصیف جہانگیر...... میری لائف میں، میں نے کوئی چار سو تک اپنے عشق کے دعویٰ داروں کی گنتی کی تھی، آگے گنتی چھوڑ دی...... میں سوچتی تھی یہ کیسا عشق ہے اپنے پاس مخلص، سچا چاہنے والیاں، اچھی صفات رکھنے والیاں خوش شکل، اسٹائلش لڑکیوں کو کراس کر کے مجھ تک پہنچتا ہے۔ مجھ میں کیا ہے۔ چلو مان لیا میں خوب صورت ہوں...... تو...... عشق کا فارمولا خوب صورتی ہے۔ خوب صورتی ماند ہوگئی تو اگلے خوب صورت کو بڑھ گیا کیونکہ...... یہ تو طے ہے کہ خوب صورت پھول مرجھاتا بھی ہے، خوب صورت محل، خوب

صورت گاڑی پرانی ہوتی ہے اور خوب صورت عورت بھی بوڑھی ہو جاتی ہے۔''

عجیب کوئی بد دماغ لڑکی تھی۔ جسے اپنی تعریف سے چڑ ہوتی تھی اس کا جنون اعلیٰ مقاصد، یونیک پروجیکٹ، محنت کر گزرنے کی لگن تھا۔ اوپر والے نے اسے حسن کی مورتی بنا دیا تھا پوجا کروانے والی کوئی خصلت اس میں نہ تھی۔

میرال تو ساویہ کی محنت و ذہانت کو اپنے لیے مقابلہ سمجھ سکتی تھی۔ توصیف کو جیتنا اس کے لیے کوئی ہدف نہیں تھا۔ اور جس کی دھاک تلے دبی تھی وہ توصیف جہانگیر کی وجاہت میں گرفتار تھی مگر وہ دوست ہونے کے باوجود یہ بھی میرال کو نہیں بتا سکتی تھی کیونکہ وہ شاہین کے مقام سے پر کٹے کوّے کے مقام پر نہیں آسکتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ توصیف کی وجاہت پر نہیں مرمٹی...... پھر کس چیز پر مرمٹی......؟ اس تکبر، غرور، نک چڑھے بزعم خود شہزادہ میں مرمٹنے کے لیے اور تھا بھی کیا...... آخری ایک سال تھا اور یہ بے ثمری تکون تھی...... اوپر سے سالانہ تقریبات کی بڑی شہرت والے ڈرامے میں توصیف نے شہزادہ سلیم کا کردار کیا کر لیا اس کی شہرت کو تو چار چاند لگ گئے۔ سوشل میڈیا پر وائرل ہو گیا۔ دو ٹی وی چینل نے اسے ڈراما آفر دے دی۔

توصیف اپنے ساتھ میرال کو کردار کرنے کی پیشکش کر رہا تھا اور محبت کے موضوع پر ان کی آخری ملاقات تھی۔

''یار میری بات سنو...... پرانی جینز اور پھیکے کُرتے سے جان چھڑا کر بہتر پہن کر سامنے آؤ میں تمہیں ٹاپ کلاس پروڈکشن ہاؤسز کے کام دلاتا ہوں۔ تم اس فیلڈ میں تھوڑی محنت کر کے اس وقت کی ساری سیلبریٹیز کو چاروں شانے چت کر سکتی ہو۔ اپنی ویلیو جانو...... کبھی خود کو آئینے میں وقت دے کر تو دیکھو۔''

''اچھا یہ بتاؤ مجھ میں کیا اچھا لگتا ہے تمہیں......'' پہلی بار نرم لہجہ تھا۔

''یہ جھیل سی آنکھیں...... فیس پہ جگمگاتی صبح کی کرنیں...... اتنے گھنے گھٹاؤں سے بال...... یعنی لانبی زلفیں...... یہ لب، یہ رخسار، یہ قد و قامت، یہ قیامت کی اٹھان......''

''بس...... حسن پرست شاعروں نے صدیوں سے عاشقوں کی مت مار رکھی ہے۔ اچھا یہ بتاؤ میری آنکھیں دھندلا جائیں۔ رنگت ماند پڑ جائے، زلفیں چھدری چارلٹیں بن جائیں اور لب و رخسار بہار کھو دیں تو......؟''

''تو کیا؟''

''تو پتا ہے کیا ہے جو نہیں بدلے گا...... جس پر زوال نہیں آئے گا۔'' وہ خاموش رہا تو بولی۔

''تمہیں نہیں پتا، میں بتاتی ہوں...... میرا اندازِ فکر، میری سوچ...... میری منفی، مثبت qualities یعنی کہ میں اگر میری ''میں'' سے تمہیں عشق ہے تو پھر تو یہ عشق ہے ورنہ...... گلی چھاپ دل پشوری......''

''کیوں بہاریں کھو دیں وغیرہ، وغیرہ......'' وہ اس کی لاجک سے چڑ گیا۔ ''no'' وہ بھنا گیا۔ ''فضول کے وہم ہیں۔'' اس کی سمجھ نہیں آتی تھی میرال کہنا کیا چاہتی ہے۔ کیوں بے بنیاد گمان پر اسے کھونا چاہتی ہے۔ پھر وہ ہوائی وعدے، کرنے لگا، ہر زمانے ہر زوال میں دل میں رکھنے کے وعدے، چاند تارے توڑ لانے جیسے وعدے...... وہ خاموش ہو گئی۔ خاموشی سے اٹھ گئی۔ ساویہ نے یہ سب سنا تو سوچا۔ ''واقعی خدا جب حسن دیتا ہے ''حسنِ خیال'' آ ہی جاتا ہے۔ یہ بھی سوچا ''میرال نے اسے ٹھکرا دیا۔ اس (توصیف) کا دل ٹوٹا ہوگا۔ میرا بھی تو دل ٹوٹا تھا۔ اب میرال کے دل ٹوٹنے کی باری ہے۔''

ایک سال ہی تو تھا گزر گیا۔ ایک شجر کے پنچھی بکھر گئے۔

کچھ عرصے بعد ساویہ خان کو ملٹی نیشنل کمپنی میں پُرکشش جاب مل گئی۔ اس کی CV ہی اتنی شاندار تھی۔ پھر اس کے ماموں کی شاندار سفارش تھی اور پھر انہی ماموں کی وہ بہو بن گئی۔

توصیف جہانگیر نے ٹی وی پلے کیے مگر اداکاری میں جم نہ پایا اسے کمرشلز میں پک کرلیا گیا پھر سنا وہ امریکا چلا گیا۔

حسن کی دیوی کی کچھ خبر نہ ملی۔ ویسے سب کو لگتا تھا وہ کفرانِ نعمت کررہی ہے۔ واضح راستے کو ترک کر کے غیر واضح پر چل رہی ہے۔ آرام سے کسی بڑے آدمی سے شادی کر کے راج کرتی۔

گیارہ سال بعد

کوئی ماڈرن سی عورت پارک کے بینچ پر اسٹک پر ہاتھ رکھے سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے بوائے کٹ سیاہ و سفید بال تھے اوور کوٹ میں جسامت کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ سرما کی شام جوں، جوں ڈھلنے لگی کرکٹ کھیلنے والے لڑکے اور والدین کے ساتھ آئے ہوئے بچے ایک، ایک کر کے نکلنے لگے۔ پارک کی لائٹس روشن ہونے لگیں۔ سردی بڑھنے لگی۔ سر پر ٹوپا اور جرسی جینز میں کوئی اور عورت دو بچوں کے ہاتھ تھامے بیرونی گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بچے کے ہاتھ سے موبائل چھوٹا اور اسٹک والی ماڈرن عورت کے پاؤں کے پاس گھاس پر جا گرا اس نے سر اٹھا کر بچے کو اسمائل دی۔ بچے نے سوری کہہ کر موبائل اٹھایا تو اس کی ماں ایک دم چونکی۔

”میرال......؟ میرال ہو تم......؟“

بیٹھی ہوئی عورت نے پلکیں جھپک کر پہچاننے کی کوشش کی۔

”آئی تھنک......تم وہ ٹاپر لڑکی......کیا نام تھا......“

”سماویہ خان۔“ پھر دونوں نے فرطِ مسرت سے پُرجوش معانقہ کیا۔

”میرال، کہاں چلی گئی تھیں تم......؟ تمہاری کوئی خبر ہی نہیں ملی۔“

”پہلے اپنی سناؤ......شادی تو ہو گئی نظر آ رہا ہے۔“

”اب کیا پینتیس سال کی عمر تک بھی شادی نہیں ہوتی......ان کے پاپا کالج میں پڑھاتے ہیں......میں ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈائریکٹر ہوں......“ پھر دونوں نے تفصیلی احوال کے لیے کل اسی جگہ ملاقات طے کی۔

اگلی شام میرال پارک کے باہر گاڑی میں بیٹھی انتظار کررہی تھی۔ سماویہ کو لے کر اچھے سے ریستوران گئی۔ کافی کے کپ کو اٹھاتے ہوئے میرال نے کہا۔

”ہاں اب بتاؤ......کیسی ہو؟“

”بچے پاپا کے ساتھ ہیں۔ اب سکون سے اپنی سناؤ......شادی کی؟“

”تم جانتی ہو میں ایڈونچرس تھی۔ سیدھی لکیر جیسی زندگی میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ مگر تم شاید یہ نہیں جانتیں کہ بچپن سے مجھے اسکیٹنگ کا شوق تھا۔ مجھے بلندیوں پر چڑھنے اور پہاڑوں کی چڑھائی پسند تھی۔ پھر میں نے الپائن کلب آف پاکستان جوائن کرلیا۔ یہ ادارہ کے ٹو اور دیگر اونچی چوٹی سر کرانے کی تربیت دیتا ہے۔ میرے فادر ہائی کلاس زمیندار تھے۔ میں ان کی اکلوتی اولاد، وہ میری ہر فرمائش ہر ضد پوری کرتے رہے ہمیشہ......ماں میری سادہ سی دیہاتی خاتون تھیں اب وہ بھی نہیں رہیں۔ کے ٹو چوٹی سر کرنے والی دو پاکستانی خواتین کا بتا کر میں نے ابا کو قائل کرلیا۔ میں پُرجوش تھی۔ مقصد کی لگن تو میں ہمیشہ پیدا کرلیتی تھی مگر میرا فیملی بیک گراؤنڈ اور جغرافیائی جم پل اس شوق میں مددگار نہ تھی۔ ہمیں تربیت میں ہی بتا دیا جاتا تھا کہ چار میں سے ایک کوشش میں کوہ پیما زندگی کی بازی ہار جاتا ہے یہ ایک اوسط اندازہ تھا۔ کامیاب ہوجانے والے یا بچ جانے والوں کو یخ بستگی کے ری ایکشن مدتوں رہتے......مگر میں تو تربیت کے دوران چڑھائی میں جانے کیسے بری طرح سلپ ہوئی کہ جان تو بچ گئی ایک ٹانگ ضائع ہوگئی۔ کافی چوٹیں آئیں......میرے ماتھے پر بھی گھاؤ کا نشان رہ گیا ہے۔ میری بائیں ٹانگ مصنوعی ہے اسٹک کے سہارے چلتی ہوں۔“

”یہ حادثہ کب ہوا......؟“

”اب تو دو سال ہوگئے ہیں۔“

”پھر اب......کیا کررہی ہو؟“

”میں نے کبھی تمہیں بتایا تھا کہ مجھ سے لگ بھگ

سیکڑوں اظہارِ محبت کرنے والے تھے۔ اب تو خیر وہ سب گھر بسا چکے۔ دو سال پہلے میں نے جس، جس کو آزمایا اس نے میرا احوال سن کر اجنبیت اختیار کر لی۔ خیر.....کوئی مسئلہ نہیں.....''

''توصیف جہانگیر یاد ہے؟''

''سب یاد ہے۔ وہ مڈل ایسٹ میں ہوتا ہے۔ پہلے امریکا میں تھا، سوشل میڈیا نے مشکل آسان کر دی۔ سب کا پتا چل جاتا ہے۔''

''تم سے مل کر خوش ہوا ہوگا۔ ابھی گیارہ سال ہی تو گزرے ہیں۔ تم نے اپنی لک بدل لی۔ بال چھوٹے کرا لیے مگر پیاری ہو، اتنی ہی پیاری.....''

''پیاری دوست کو چاند میں داغ نظر نہیں آتا۔'' میرال نے کوکیز کی پلیٹ بڑھائی۔

''کس طرح بات ہوئی؟'' سماویہ نے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''بات تو وڈیو کال پر ہوئی۔ پتا ہے سماویہ، مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات کی آندھی چل گئی۔ پہچان گیا مگر سخت حیران تھا۔ ظاہر ہے بال جو گھٹائیں تھیں لٹیں ہوگئی تھیں۔ ماتھے پر اسٹیچنگ کا نشان.....وہ گلابی پن چہرے پر جو ہوتا تھا نہ رہا۔ مگر خیر چھوڑو، تلخ سا بولا۔ کہاں ہوتی ہیں؟ کیسی گزر رہی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''سرگودھا.....الحمدللہ.....'' میں نے اس سے شادی کا پوچھا جواب گھما گیا۔ مجھ پر ہی سوال ڈال دیا۔ ''شادی کس شہزادے سے کی؟''

''شہزادہ تو باہر چلا گیا۔''

''آپ کی achievement کا کیا ہوا کیا چاند پر پہنچ گئیں.....؟'' طنز پر طنز کر رہا تھا۔

''چاند تو کہاں؟ میں تو کے ٹو کی چڑھائی میں ہی گر گئی۔ ٹانگ ضائع ہوگئی۔''

''سیریسلی.....؟'' وہ چلا اٹھا۔ میں نے مختصراً سب بتا دیا۔

''تم ہمیشہ سے سر پھری تھیں۔ یہ تو ہونا تھا۔ لائف تباہ کر ڈالی۔''

''باقی سب چھوڑو.....'' میں نے کہا۔ ''میری میموری بہت اسٹرانگ ہے۔ تم نے ہر زمانے اور ہر حال میں ساتھ دینے کا دعویٰ کیا تھا نو سال پہلے (یہ ہماری بات چیت دو سال پہلے ہوئی ہے) فون کرنے کا مقصد یاد دلانا تھا۔ ایسا ہے کہ وہ دعویٰ تمہاری شخصیت سے لگا نہیں کھاتا تھا اس لیے میرے پلو سے بندھا رہ گیا۔''

''بہتر ہے پلو کھول کر اسے اڑا دو.....تم محبت کو ساتھ لے کر چلتیں تو شاید وہ مقام آ جاتا.....میں مجنوں کے دور کا تو نہیں ہوں.....تمہاری میموری اسٹرانگ ہے تو تمہیں یاد ہوگا جمالیات پسندی میری مجبوری ہے۔''

''پلو سے کھول کر اڑا دیا۔'' میں ہنس پڑی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے میری سوچ پر اب پہلے سے زیادہ ناز ہے۔ سنو توصیف جہانگیر میرے بابا کی مربوں اراضی ہے، میں اس کی تنہا وارث ہوں۔ میں نے جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے اس کی آمدن کئی گنا بڑھا دی ہے۔ میں نے لڑکیوں کے لیے تعلیمی، تربیتی ادارہ کھولا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔''

''اراضی تو آباد ہوگئی دل کی دنیا آباد نہیں ہوئی۔'' اس نے پھر ہٹ کیا۔

''تمہارے دل کی دنیا آباد ہوئی؟''

''ہاں فیملی ہے میری.....عشنا تمہارے جتنی خوب صورت نہ سہی مگر بہت کو آپریٹو اور بہت اچھی سیرت کی لڑکی ہے۔''

''تو.....یوں کہو توصیف جہانگیر.....جیت تو میری ہوئی ہے۔'' وہ کھل کر مسکرا رہی تھی۔ کہانی کا آخری موڑ بتاتے ہوئے جہاں میرال کا چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔ وہاں سماویہ کا چہرہ درماندہ ہوگیا.....جس خدشے کے تحت وہ کبھی توصیف سے حالِ دل نہ کہہ سکی وہ خدشہ بے بنیاد ہوگیا۔ اور وہ جمال کی حدِ آخر سے نیچے سمجھوتا نہ کرنے والا، اچھی سیرت پر راضی ہوگیا جو عام شے سے دور بھاگتا تھا وہ کیونکر عام ہوگیا.....دونوں بیک وقت سوالیہ نشان تھیں۔

❁❁❁

کردار

مسکان نور

Digest Novels Lovers Group

"نکل جاؤ ہمارے گھر سے بدکردار عورت!"

مہر النسا کو ایک زوردار دھکا دیتے ہوئے فریدہ بیگم غصے سے چیخ کر بولی تھیں اور رہی مہر النسا تو اس کو لگنے والے دھکے نے اتنی تکلیف نہیں دی تھی... جتنی فریدہ بیگم کے نیزوں جیسے الفاظ نے اس کو تکلیف دی تھی۔ اس کا دل جیسے بدکردار لفظ سن کر چھلنی ہو گیا۔

وہ گرنے ہی والی تھی کہ کسی کے مضبوط ہاتھوں نے اسے شانوں سے تھام کر گرنے سے بچا لیا.....

مہر النسا نے نم مگر زخمی نظروں سے تھامنے والے کو دیکھنا چاہا تھا لیکن اس کے آنسوؤں نے سارا منظر جیسے دھندلا دیا تھا۔ جب آنسو آنکھوں سے نکل کر بہہ چکے تو منظر واضح ہوا تھا۔ علی اس کا شوہر سنجیدہ چہرہ لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''علی اسے دھکے دے کر نکالو... یہاں سے۔ یہ لڑکی تمہارے قابل بالکل نہیں ہے۔ شادی تم سے کی اور پسند کسی اور کو کرتی ہے۔ ایسی لڑکی کو گھر میں نہیں رکھتے بلکہ دھکے دے کر باہر نکالتے ہیں۔ نکالو اسے یہاں سے، میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی اور جتنی جلدی ہو سکے اسے فارغ کرو تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔'' فریدہ بیگم غصے سے بھرے لہجے میں مہر النسا کی پشت کو گھورتے ہوئے اپنے بیٹے علی سے بولیں تو مہر النسا نے تڑپ کر آنسو بھری آنکھوں سے علی کو دیکھتے ہوئے سر نفی میں ہلایا تھا۔

''نن...... نہیں یہ سب جھوٹ ہے، تہمت ہے مجھ پر۔ پلیز آپ ان سب باتوں کا یقین مت کریجیے گا۔'' مہر النسا نے بھرائے ہوئے لہجے میں اپنی صفائی دینی چاہی جسے علی نے نظر انداز کر کے ماں کی طرف دیکھا جو غصے سے سرخ چہرہ لیے کھڑی تھیں۔

''امی!'' علی کے لب ہلے تھے۔ مگر مہر النسا کو تو کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے بس علی کے ہلتے لب نظر آئے تھے اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

مہر النسا اپنی دوست کو مسکرا کر ہاتھ ہلاتی وین سے نیچے اتری تھی۔ اس نے کالج کے سفید یونیفارم پر بڑی سی چادر جو پیروں تک آتی تھی اوڑھ رکھی تھی اور وہ مضبوطی سے اپنی چادر پکڑے تیز قدموں سے چل رہی تھی کہ اس کے قدم اچانک سست پڑ گئے اور آنکھوں میں جیسے خوف سا ابھر گیا، وہ جس بات سے ڈر رہی تھی شاید وہی ہونے جا رہی تھی۔ عدنان اس کے گھر کے دروازے سے کچھ قدم آگے کھڑا تھا اور مسکرا کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے دو قدم آگے بڑھا۔

''آ گئیں تم، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔'' عدنان اپنے بالوں میں انگلیاں چلا کر مسکرا کر بولا تھا۔

''مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی، میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔'' مہر النسا اس سے مزید فاصلہ کرتے ہوئے اس سے اور دور ہو کر تلخ لہجے میں بولی۔ اس نے اپنے چہرے پر دوپٹا نقاب کے انداز میں لپیٹ دیا تھا جس سے اس کی صرف آنکھیں نظر آ رہی تھی۔ جن میں غصہ، بے بسی صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ مہر النسا نے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائی تھیں لیکن افسوس وہاں کوئی نہیں تھا۔ تبھی تو اسے اور ہمت مل گئی تھی کہ وہ اس کے راستے میں آ کھڑا ہوا تھا۔

''ہٹ جاؤں گا لیکن پہلے میرے سوال کا جواب دو۔ تم نے میرے لائے ہوئے رشتے کے لیے انکار کیوں کیا؟'' عدنان کے چہرے پر اس بار مسکراہٹ نہیں تھی بلکہ وہ سپاٹ لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''انکار میرے والدین نے کیا تھا میں نے نہیں۔'' اس بار مہر النسا کو نہ چاہتے ہوئے بھی جواب دینا پڑا تھا۔

''اوہ...... اچھا مطلب کہ انکار تمہارے والدین نے کیا تھا، تم نے نہیں۔'' عدنان ایک گہری سانس لے کر ہلکے پھلکے لہجے میں مسکرا کر بولا تو مہر النسا کو فوراً اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

''نہیں، تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میرے والدین کا انکار سمجھو میرا انکار ہے۔ صرف میرے والدین کو ہی نہیں، مجھے بھی تم سخت ناپسند ہو۔ اس لیے آئندہ میرے راستے میں مت آنا دوبارہ اور میرا راستہ چھوڑو۔'' مہر النسا سخت لہجے میں غصے سے بولی تھی۔

''اگر نہ چھوڑوں تو؟'' عدنان کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ وہ بھی تلخ لہجے میں چیلنج کرتا ہوا بولا تو مہر النسا کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اپنے باپ کو دیکھ کر خاموش ہو گئی اور اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون آ گیا جسے عدنان محسوس کرتا ہوا مڑا تھا اور قیوم صاحب کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ مہر النسا کی طرف مڑا۔

''میں دیکھتا ہوں کہ تم کب تک اپنے انکار پر قائم رہتی ہو......زندگی عذاب کردوں گا تمہاری، یہ بات یاد رکھنا تم۔'' وہ اسے دھمکی دیتا جلدی سے آگے بڑھ گیا تھا۔

''کیا ہوا مہر النسا بیٹی، عدنان تمہیں پریشان کر رہا تھا؟'' قیوم صاحب اس کے پاس آکر فکر مند لہجے میں اسے دیکھ کر بولے تو مہر النسا کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''گھر چلیں ابو، میں آپ کو سب بتاتی ہوں شکر ہے آپ آگئے۔''

مہر النسا بس اتنا ہی بول پائی تھی کیونکہ اس کا لہجہ بھر آیا تھا۔ قیوم صاحب نے اپنے غصے پر بمشکل قابو پاتے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ گھر آکر مہر النسا نے عدنان سے کی ہوئی باتیں اور اس کی دی ہوئی دھمکی نم آواز میں اپنے ماں باپ کو بتائیں تو سیما بیگم کا چہرہ زرد اور قیوم صاحب کا غصے کے مارے سرخ پڑ گیا تھا۔

''اس کی اتنی جرأت کہ میری بیٹی کو دھمکی دے۔ میں کروں گا اس کے باپ سے بات۔ وہ اسے سمجھائے ورنہ میں اپنی زبان سے اسے سمجھاؤں گا۔'' قیوم صاحب سے غصے کے مارے بولا نہیں جا رہا تھا وہ ایک شریف خصلت انسان تھے اور نرم مزاج رکھتے تھے مگر عدنان نے جو آج کیا وہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ بات ان کی بیٹی کی تھی وہ کیسے خاموش رہ سکتے تھے۔

''آپ ان سے کیا بات کریں گے قیوم صاحب۔ اولاد کو انہوں نے ہی تو بگاڑا ہے۔ یہ ان کی خراب تربیت تو ہے جو آج ہمیں یہ دن دکھا رہی ہے۔'' سیما بیگم نے دکھی لہجے میں کہا تو قیوم صاحب نے سر اثبات میں ہلایا۔

''صحیح کہہ رہی ہو بیگم۔ آج کل کے والدین نے اپنے بچوں کی تربیت کرنا چھوڑ دی ہے۔ انہیں برے، بھلے کی تمیز نہیں سکھاتے۔ لڑکا سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ لڑکوں کی تربیت زیادہ اچھی کرنے کی ضرورت ہوتی ہیں۔ والدین کی خراب تربیت تو ہے جو آج ہر معصوم لڑکی گھر سے باہر نکلنے سے ڈرتی ہے۔'' قیوم صاحب نے مہر النسا کی طرف دیکھ کر افسوس بھرے لہجے میں کہا تھا جو اپنے ہاتھوں کی لکیروں پر نگاہیں جمائے خاموش اور اداس بیٹھی تھی کچھ دیر میں وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

دونوں میاں بیوی سوچتی نظروں سے مہر النسا کی پشت کو دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

قیوم صاحب اور سیما بیگم کی ایک بیٹی تھی مہر النسا جو بہت خوب صورت بھی تھی اس کا خواب تھا پڑھ لکھ کر کچھ بن کر دکھانا ہے۔ قیوم صاحب اپنی بیٹی کے خواب جانتے تھے اور وہ اس کے خواب پورے کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔

عدنان ان کے پڑوس میں ہی رہتا تھا، ایک دو گلی چھوڑ کر۔ عدنان ماں باپ کا بگڑا ہوا بیٹا تھا۔ صرف میٹرک تک اس نے تعلیم بمشکل حاصل کی تھی۔ باپ کے ساتھ دکان پر بھی نہیں بیٹھتا تھا۔ سارا دن بس دوستوں کے ساتھ اپنا وقت برباد کرتا رہتا۔ وہ مہر النسا کو پسند کرتا تھا۔ وہ جب بھی اسکول، کالج کے لیے گھر سے باہر نکلتی اسے دیکھ کر مسکراتا رہتا۔ اسے دیکھ کر مہر النسا کو شدید غصہ آتا وہ اپنا منہ پھیر لیتی تھی۔ مگر پھر جلد ہی عدنان نے اس کے گھر اپنی ماں کو رشتے کے لیے بھیج دیا۔ مہر النسا کے والدین کیونکہ جانتے تھے، انہیں عدنان کے بارے میں سب معلوم تھا سو انہوں نے انکار کردیا۔ عدنان کی ماں شدید ناراض ہوکر ان کے گھر سے نکلی تھی۔ جب عدنان تک ان کا انکار پہنچا تو وہ غصے سے جیسے پاگل ہوگیا اور پھر اس نے مہر النسا سے خود بات کرنے کا سوچا مگر مہر النسا کے منہ سے انکار سن کر وہ اور غصے میں آگیا تھا۔

عدنان کے غصے نے قیوم صاحب کو یہ سوچنے پر مجبور کرگیا تھا کہ وہ اب بیٹی کی جلد شادی کردیں۔ ان کی سوچ میں سیما بیگم کی بھی سوچ شامل ہوگئی تھی۔ مہر النسا نے سنا تو ناراض ہوگئی بلکہ روٹھ گئی۔ وہ ابھی شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی اپنے ماں باپ کا سہارا بننا چاہتی تھی انہیں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ مگر اس بار

digestlibrary.com

قیوم صاحب اور سیما بیگم نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔

مہر النسا کے لیے رشتے تو آتے رہتے تھے مگر وہ یہ کہہ کر منع کر دیتے کہ ان کی بیٹی پڑھ رہی ہے مگر اس بار انہوں نے ہاں کر دی تھی۔ علی ماں باپ کا اکلوتا، لاڈلا بیٹا تھا اور نہایت شریف اور نیک لڑکا تھا اور اپنی تعلیم مکمل کر کے اچھی جاب کر رہا تھا۔ قیوم صاحب، علی اور اس کے گھر والوں سے مل کر بہت مطمئن اور خوش تھے۔

جب علی کو لڑکی کی تصویر دکھائی گئی تو مہر النسا کی تصویر۔ دیکھ کر وہ مسکرا دیا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آ گئی تھی۔ اسے یہ معصوم سی بھولی بھالی نظر آنے والی لڑکی دل سے بھا گئی تھی اور وہ ماں کی پسند کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

اور یوں ان کی منگی کے ساتھ شادی کی تاریخ بھی رکھ دی گئی اور منگنی کے بعد ایک مہینے کے اندر ہی مہر النسا دل میں دکھ اور اپنے ٹوٹے ہوئے خوابوں پر آنسو بہاتی علی کے گھر رخصت ہو کر چلی گئی۔ قیوم صاحب اور سیما بیگم ایک طرف تو غمگین تھے مگر اب مطمئن بھی تھے کہ ان کی بیٹی عزت سے ان کے گھر سے رخصت ہو گئی ہے۔

شادی کے بعد بھی مہر النسا کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔ اس کی ساس اور شوہر یہی سمجھے کہ ماں باپ کی جدائی کی وجہ سے وہ غمگین ہے اور یہ حقیقت بھی تھی۔ اس کے تو بہت خواب تھے جو ٹوٹ گئے تھے۔ وہ پڑھنا چاہتی تھی اور پڑھ لکھ کر کچھ بننا چاہتی تھی اور اپنے ماں باپ کا سہارا بننا چاہتی تھی۔ مگر جو اس نے سوچا تھا وہ نہیں ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اداس تھی بلکہ خود سے بھی روٹھ گئی تھی۔ علی بہت اچھا شوہر تھا وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا اسے کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دیتا تھا۔ پر وہ اپنے دل کا کیا کرتی جو دکھا ہوا تھا کچھ وقت تو اسے چاہیے تھا سنبھلنے کے لیے۔ مگر اسے کیا پتا تھا کہ اس کی خاموشی پر اس کی ساس کوئی غلط مطلب لے بیٹھیں گی۔

مہر النسا کے ہاتھوں سے اب مہندی بھی اترنے لگی تھی اور اس کی ساس نے اس سے میٹھا بنوا کر اسے گھر کے کام بھی سونپ دیے تھے۔ علی بھی اب چھٹیوں کے بعد آفس جانے لگا تھا۔ مہر النسا کو اس کی ماں نے تعلیم دینے کے ساتھ گھر داری بھی سکھائی تھی جو اب اس کے کام آ رہی تھی۔

☆☆☆

مہر النسا کچن کا کام ختم کر کے اپنے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی اپنے کمرے میں آئی تو اس کا موبائل بج رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر پڑا موبائل اٹھایا۔

کوئی انجان نمبر تھا۔ مہر النسا انجان نمبر سے جب بھی کال آتی تھی تو خود نہیں اٹھاتی تھی بلکہ اپنے باپ کے ہاتھوں میں تھما دیتی یا اپنی ماں کو دے دیتی۔

مگر اب وہ سوچ رہی تھی کہ اٹھائے یا نہ اٹھائے کیونکہ کال پر کال آ رہی تھی۔ ”ہو سکتا ہے کسی جاننے والے کی کال ہو یا پھر ایمرجنسی بھی ہو سکتی ہے......“ یہ سوچ کر مہر النسا کا دل دھڑک اٹھا تھا اور اس نے ہمت کرتے ہوئے کال اٹھالی تھی۔

”ہیلو!“ مہر النسا نے ہمت کرتے ہوئے کہا تھا لیکن دوسری طرف عدنان کی آواز کو پہچانتے ہوئے اور اس کی بات سن کر اس کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔

”ہیلو مہر النسا، میں عدنان بول رہا ہوں۔ کیسی ہو؟ اتنی جلدی تم نے شادی بھی کر لی اور ہمیں پتا بھی نہیں چلنے دیا۔ یہ تو تم نے بہت غلط کیا ہمارے ساتھ۔“ دوسری طرف عدنان افسوس بھرے انداز میں کہہ رہا تھا۔

مہر النسا جیسے کسی خواب سے جاگی تھی۔

”ت...... تمہیں میرا نمبر کیسے ملا؟“ مہر النسا نے سہم کر مگر حیرانی سے پوچھا تھا اور ساتھ ہی وہ سہمی ہوئی پریشان نظروں سے دروازے کو بھی دیکھے جا رہی تھی۔

”ثمرہ سے لیا ہے تمہارا فون نمبر۔“

”ثمرہ؟“ مہر النسا کے لب بے آواز ہلے تھے۔ ثمرہ اس کی دوست تھی اور وہ اس کے ساتھ ہی پڑھتی تھی۔ عدنان، ثمرہ کا کزن تھا جو اسے بالکل بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اکثر کہتی تھی کہ اسے اپنا یہ کزن بالکل بھی

پسند نہیں۔

''ثمرہ تمہیں میرا نمبر کیسے دے سکتی ہے؟'' مہرالنسا صدمے سے بولی۔ اسے ثمرہ سے ایسی حرکت کی بالکل توقع نہیں تھی۔

''ارے اس بیچاری کو کچھ بھی نہیں کہو۔ وہ بیچاری مجبور تھی۔ دے ہی نہیں رہی تھی نمبر مگر میری دھمکیوں سے ڈر کر کہ تمہارا کالج جانا بند کروادوں گا چچا سے جھوٹ موٹ کہوں گا کہ تمہاری لڑکوں کے ساتھ دوستی ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو وہ معصوم میری دھمکیوں میں آسانی سے آگئی۔ تمہیں تو پتا ہے کہ اسے پڑھنے کا کتنا شوق ہے اور اسے اپنی عزت بھی بہت پیاری ہے تو وہ فوراً سے مان گئی میری بات۔''

عدنان آرام سے کہہ رہا تھا اور مہرالنسا کا غصے اور بے بسی کے مارے برا حال تھا۔

''تم ایک بہت برے انسان ہو۔'' مہرالنسا بمشکل کہہ پائی۔

''وہ تو میں ہوں۔'' عدنان ڈھٹائی سے مسکرا کر بولا۔

''آئندہ مجھے کال کرنے کی جرأت مت کرنا۔''

مہرالنسا اس کا جواب سن کر اپنا غصہ پیتے ہوئے بولی اور فون بند ہی کررہی تھی کہ عدنان جلدی سے بول پڑا۔

''فون بند کرنے کی غلطی مت کرنا۔ تم نے مجھے پہلے ہی بہت زیادہ غصہ دلایا ہے۔ اگر فون بند کیا تو سیدھا تمہارے گھر پہنچ جاؤں گا اور تمہاری ساس کو ساری حقیقت بتادوں گا پھر تو تمہاری ساس تمہیں دھکے دے کر گھر سے باہر نکالے گی اور تمہارا وہ شوہر......'' عدنان شوہر لفظ کو چبا کر بولا تھا۔ ''وہ بھی تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھے گا، آخر ہم ایک دوسرے کو پسند جو کرتے ہیں......وہ بیچارہ غیرت مند یہ بات کہاں برداشت کرپائے گا......اور تمہیں اسی وقت گھر سے باہر نکال دے گا۔'' عدنان بات کرتے ہوئے آخر میں ہنسا تو مہرالنسا کا دل مارے بے بسی کے بھر آیا......اور جب بولی تو اس کا لہجہ بھرایا ہوا تھا۔

''مہربانی کرکے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ خود بھی سکون سے رہو اور مجھے بھی زندگی سکون سے گزارنے دو پلیز......میرا تم سے کوئی ایسا تعلق نہیں تھا۔'' مہرالنسا یہ کہہ کر بے بسی کے مارے پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی اسے اپنے دکھ پھر سے یاد آگئے تھے۔

''مجھے کیا ہوا ہے، میں تو سکون میں ہوں ہاں مجھے تمہارا سکون ضرور برباد کرنا ہے، تمہارا گھر اجاڑنا ہے۔ تم نے مجھے ٹھکرایا تھا ناں۔ اب جب تمہیں تمہارا شوہر ٹھکرائے گا، تمہیں دھکے دے کر گھر سے باہر نکالے گا تب مجھے اور بھی زیادہ سکون اور خوشی ملے گی۔''

عدنان اپنے خطرناک ارادے اسے بڑے آرام سے بتارہا تھا اور اس کا رہا سہا سکون بھی برباد کررہا تھا۔

''تم ایسا کچھ بھی نہیں کرو گے۔'' بہتے آنسوؤں کے درمیان وہ بمشکل بولی تھی۔

''میں ایسا ہی کروں گا تم بس دیکھتی جاؤ۔'' عدنان ہنس کر کہتا فون بند کرگیا تھا۔ مگر مہرالنسا ابھی تک ساکت سی کھڑی اپنے ہاتھ میں دبے موبائل کو خوف بھری نظروں سے تکے جارہی تھی۔ پھر وہ بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ کر پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی۔

عدنان کی کال کے بعد ثمرہ کی اس کے پاس کال آئی تھی اور اس نے اس سے شرمندہ لہجے میں معافی مانگی تھی اور مہرالنسا نے اسے معاف کردیا تھا۔ بھلا مجبور و بے بس انسانوں سے کیا ناراض ہونا۔ مہرالنسا یہ بات سوچ کر رہ گئی تھی۔

عدنان کی کال کے بعد وہ اور بھی زیادہ خوف زدہ اور پریشان رہنے لگی تھی۔ دروازہ بجتا تو وہ اور سہم سی جاتی کہ کہیں عدنان تو نہیں آگیا۔ بظاہر وہ اپنے شوہر اور ساس کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی مگر پھر بھی علی سمجھ گیا تھا کہ اسے ضرور کوئی پریشانی ہے۔ آخر اس نے ایک دن اس سے پوچھ ہی لیا۔

''مجھے تم کچھ دنوں سے بہت پریشان اور اداس نظر آرہی ہو کوئی بات اگر تمہیں پریشان کررہی ہے تو تم مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے بتاسکتی ہو۔ ہوسکتا ہے میں

تمہاری پریشانی دور کرسکوں۔‘‘

علی نے اس کے معصوم سے خوب صورت چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا تو مہرالنسا کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا لیکن اس نے جلد ہی خود پر قابو پالیا.... اور سرنفی میں ہلاتے ہوئے بولی۔

’’ن...... نہیں کوئی بھی پریشانی نہیں۔ بس امی، بابا کی کچھ دنوں سے بہت یاد آرہی ہے تو اسی وجہ سے تھوڑی اداس ہوں۔‘‘ مہرالنسا کو آخرکار بہانہ مل ہی گیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے اپنی لرزتی پلکیں جھکا کر دھیمی آواز میں بولی تھی کہ کہیں وہ اس کی آنکھوں سے اس کا جھوٹ نہ پڑھ لے۔

’’ارے بس اتنی سی بات پر ہماری پیاری بیگم پریشان اور اداس بیٹھی ہے۔ تم نے مجھ سے کہا کیوں نہیں کہ تمہیں انکل، آنٹی کی یاد آرہی ہے، میں تمہیں اسی دن ان کے پاس لے چلتا۔ خیر اگر تم چاہو تو ہم ابھی چلتے ہیں، کیا خیال ہے تمہارا؟‘‘ علی مسکرا کر پیار بھرے لہجے میں اسے دیکھ کر بولا تو مہرالنسا کے چہرے پر بھی رونق سی آگئی تھی۔

’’جی آپ کی بات تو صحیح ہے مگر مجھے شام کے کھانے کی تیاری بھی کرنی ہے اس لیے آج نہیں ہم کل چلیں گے۔‘‘ کچھ خیال آنے پر وہ بولی۔

’’ارے کل کیوں، ہم ابھی چلتے ہیں، تم کھانے کی فکر مت کرو ہم واپسی پر کھانا ہوٹل سے پیک کروا کر لے آئیں گے۔ تم بس چلنے کی تیاری کرو تب تک میں امی کو بتا کر آتا ہوں۔‘‘ علی نرمی سے اس کا ہاتھ تھپتھپاتا کمرے سے باہر نکل گیا... اور مہرالنسا اس کی پشت کو دیکھتی سوچ رہی تھی کہ وہ کتنی خوش قسمت ہے کہ علی جیسا شوہر اسے ملا ہے۔ اس کی اپنے لیے اتنی پرواہ دیکھ کر وہ مطمئن سے انداز میں مسکرانے لگی مگر پھر عدنان کا خیال آتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی .... اور اس کا دل بری طرح سے سہم گیا۔

’’ارے تم ابھی تک یہیں بیٹھی ہو۔ کن سوچوں میں گم ہیں ہماری بیگم، جلدی سے تیار ہو جائیے امی نے اجازت دے دی ہے۔‘‘ علی کمرے میں واپس آیا تو اسے پھر سے کسی سوچ میں گم دیکھ کر اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے مسکراتے لہجے میں کہا تو مہرالنسا نے بری طرح سے چونک کر اس کے مسکراتے چہرے کی طرف دیکھا پھر شرمندہ ہوتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

’’جی، میں بس ابھی تیار ہو کر آتی ہوں۔‘‘ وہ الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی تو علی نے بغور اس کا کھویا ہوا انداز نوٹ کیا.... مگر پھر اپنا سر جھٹک کر وہ ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھا کر اپنے بالوں میں پھیرنے لگا۔

’’تم خوش تو ہو ناں میری بچی؟‘‘ مہرالنسا، ماں کے سامنے بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی اور علی، قیوم صاحب کے ساتھ ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھا کسی بات پر ہنس رہا تھا۔ انہیں مسکرا کر دیکھتی مہرالنسا سے اچانک ہلکی آواز میں سیما بیگم نے پوچھا تھا۔

مہرالنسا، ماں کی بات پر بری طرح سے چونک پڑی اور ماں کے اس سوال پر اس کا دل بھر آیا... اس کا دل چاہا کہ ماں کو ساری باتیں بتا دے مگر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنے ماں، باپ کے دل پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی اور نہ ہی چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے اس کے ماں، باپ کو کوئی تکلیف پہنچے۔ وہ پیار سے ماں کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر چہرے پر مسکراہٹ لا کر بولی۔

’’جی امی، میں خوش ہوں بہت زیادہ خوش، علی ایک اچھے انسان ہونے کے ساتھ ایک اچھے شوہر بھی ہیں۔ میں ان کا ساتھ پا کر سچ میں بہت خوش ہوں امی جان۔‘‘ سیما بیگم بیٹی کی بات پر دل سے مسکرا اٹھیں اور سر اثبات میں ہلایا۔

’’میری تو یہی دعا ہے تم دونوں ہمیشہ خوش و آباد رہو۔‘‘ سیما بیگم نے اس کے سر پر محبت سے اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے شفقت بھرے لہجے میں مسکرا کر کہا تو مہرالنسا کے چہرے پر ایک اداس سی مسکراہٹ آگئی۔

digest.library.com

عدنان کی دھمکی کو کئی دن گزر گئے تھے۔ اس کی کوئی کال آئی تھی اور نہ ہی اس نے کوئی اور قدم اٹھایا تھا اور اب مہر النسا کے بے قرار دل کو سکون سا مل گیا تھا یہ سوچ کر کہ عدنان اسے صرف ڈرا دھمکا رہا تھا اور کچھ بھی نہیں۔ مگر یہ اس کا صرف خیال تھا۔ بھلا انتقام کی آگ اتنی جلدی کہاں بجھتی ہے۔

''میں ذرا مارکیٹ جا رہی ہوں بیٹی۔ مجھے کچھ ضروری چیزیں لینی ہیں..... تم کھانے میں جو بنانا چاہو بنا لینا۔'' فریدہ بیگم نے بڑا سا دوپٹا سر پر اوڑھتے ہوئے مہر النسا سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم دروازہ اندر سے اچھی طرح بند کر لو۔'' فریدہ بیگم قدم باہر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولیں تو مہر النسا ''جی امی'' کہتی اُن کے پیچھے، پیچھے گئی اور دروازہ بند کر کے کچن میں چلی آئی تاکہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کر سکے۔

''السلام علیکم آنٹی!'' فریدہ بیگم رکشے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہی تھیں کہ پیچھے سے کسی نے پکارا تھا۔ وہ بے ساختہ حیران ہو کر پلٹی تھیں اور پکارنے والے کو دیکھ کر ان کے دل میں ڈر سا پیدا ہوا انہوں نے اپنے پرس پر گرفت بے ساختہ مضبوط کی تھی اور انہیں یوں پرس کو مضبوطی سے پکڑنے پر پکارنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

''ارے ڈریں نہیں آنٹی، میں کوئی چور نہیں ہوں جو آپ کا پرس چھین کر بھاگ جاؤں گا۔ میں تو آپ سے بات کرنے کے لیے آپ کے پاس آیا تھا۔'' اس نے مسکرا کر اپنا سر جھکاتے ہوئے کہا تو فریدہ بیگم آنکھوں میں حیرت لیے اس نوجوان کو دیکھنے لگیں جو شکل اور حلیے سے کوئی شریف انسان نہیں لگ رہا تھا۔

''کون سی بات کرنی ہے تم نے؟'' انہوں نے اپنی حیرت چھپا کر آہستہ آواز میں پوچھا۔

''میرا نام عدنان ہے اور جو آپ کی بہو ہے ناں مہر النسا، میں ان کے پڑوس میں رہتا ہوں۔ آپ کو مہر النسا نے بتایا تو ہوگا میرے بارے میں۔ آخر کو وہ مجھے بہت اچھی طرح جانتی ہے۔''

ایک غیر شخص کے منہ سے اپنی بہو کا نام سن کر اور خاص کر اس کی ذو معنی بات سن کر فریدہ بیگم کا منہ حیرت کے مارے کھل گیا تھا۔

''کیا مطلب..... تم میری بہو کو کیسے جانتے ہو اور وہ مجھے تمہارے بارے میں کیوں بتائے گی؟'' فریدہ بیگم کے لہجے میں ناگواری شامل ہو گئی تھی۔ جسے دیکھتے ہوئے عدنان مکاری سے مسکرا دیا۔ مطلب کہ تیر نشانے پر لگا تھا۔

''یہی کہ میں اور مہر النسا.. ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ اب بھی کرتے ہیں۔ مگر ان کے والدین ہماری پسند کے خلاف تھے اور انہوں نے زور زبردستی سے مہر النسا کی شادی آپ کے بیٹے سے کر دی۔''

عدنان بڑے آرام سے جھوٹ بول رہا تھا مگر اس نے اپنا لہجہ اتنا سچا اور دکھی بنایا ہوا تھا کہ فریدہ بیگم حیرت و بے یقینی سے منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھیں یقین کیے بغیر نہیں رہ سکیں۔ انہیں فوراً مہر النسا کا شادی کے شروع کے دنوں میں اداس اور چپ، چپ رہنا یاد آیا تو جیسے اس شک پر یقین کی مہر لگ گئی تھی مگر پھر بھی اپنے دل کو سمجھاتے ہوئے کہ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ اسے گھور کر بولیں۔

''تم جھوٹ بول رہے ہو، میں کیسے یقین کر لوں تمہاری بات کا۔''

''اگر یقین نہیں آ رہا تو یہ دیکھیں مہر النسا اب بھی میرے رابطے میں ہے' یہ مہر النسا کا نمبر ہے۔'' وہ موبائل اپنی پینٹ کی جیب سے نکال کر انہیں دکھاتے ہوئے بولا تو اس کے فون پر مہر النسا کے نام سے نمبر سیو دیکھ کر فریدہ بیگم کی آنکھیں حیرت و بے یقینی اور غصے کے مارے پھیل سی گئیں۔

''اب تو یقین آ گیا ناں آپ کو میری بات کا۔''

عدنان موبائل واپس اپنی جیب میں رکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا تو فریدہ بیگم کچھ بھی کہے

Digest Library.com

بغیر واپس گھر کی طرف مڑ گئیں اور عدنان انہیں جاتا دیکھ کر مسکرا دیا۔

وہ کئی دنوں سے انتظار میں تھا کہ فریدہ بیگم باہر اکیلے نکلیں تو وہ ان سے بات کرے۔ وہ کئی بار فریدہ بیگم کو سودا لیتے یا دودھ والے سے دودھ لیتے دیکھ چکا تھا۔ اس نے اس سے اندازہ لگایا تھا کہ کچھ بھی لینا ہو فریدہ بیگم خود ہی باہر نکلتی ہیں اور اسی بات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ہر روز یہاں آنے لگا تھا بلکہ ایک دکاندار سے اس نے دوستی بھی کر لی تھی۔ تاکہ وہ نظر رکھ سکے اس دن بھی فریدہ بیگم کو اپنے گھر سے باہر نکلتا دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی اور وہ دکان دار سے ہاتھ ملا کر پھر آنے کا کہہ کر جلدی سے فریدہ بیگم کے پاس بھاگا تھا۔

اب وہ مطمئن سا گنگناتے ہوئے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا...... جیسے اسے اب سکون ملا ہو اور یہ یقین ہو کہ اب چاہے جو بھی ہو جائے مہر النسا کا گھر اجڑنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

مہر النسا جو کچن میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ گیٹ پر بیل کی آواز سن کر حیران ہوتی آٹا چھوڑ کر ہاتھ اچھی دھو کر جلدی سے دروازے کی طرف بھاگی تھی کیونکہ اب دروازے کو کوئی زور سے پیٹ بھی رہا تھا۔ مہر النسا کا نازک سا دل خوف کے مارے تیزی سے دھڑک اٹھا تھا اسے لگ رہا تھا کہ کچھ غلط ہوا ہے یا ہونے جا رہا ہے۔

''ک...... کون ہے؟'' اس نے خوف سے کانپتی آواز میں پوچھا۔

''میں ہوں مہر النسا، دروازہ کھولو۔'' دروازے کے پیچھے سے زوردار آواز سنائی دی جس پر وہ جی بھر کر حیران ہوتی جلدی سے دروازہ کھول کر پیچھے ہٹی تھی اگر نہ ہٹتی تو پیچھے دیوار سے جا لگتی کیونکہ آنے والی نے زور سے دروازے کو دھکا دیا تھا۔

''امی، آپ اتنی جلدی کیسے آ گئیں۔ آپ کو تو مارکیٹ جانا تھا ناں؟'' مہر النسا اپنی حیرت چھپا کر ان کا غصے کے مارے سرخ چہرہ دیکھ کر بولی تو انہوں نے اسے بری طرح سے گھور کر دیکھا تھا۔

''تم اس بات کو چھوڑو، تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ عدنان کون ہے؟'' فریدہ بیگم اپنا ضبط کھوتے ہوئے غصے بھرے لہجے میں اسے گھورتے ہوئے بولیں تو مہر النسا جس کا دل ساس کے تیور دیکھ کر ہی ڈر رہا تھا کہ ضرور کچھ غلط ہوا ہے۔ فریدہ بیگم کی بات سن کر جیسے ساکت سی ہو گئی تھی اور اس کی خوب صورت بڑی، بڑی آنکھیں شدید صدمے کے مارے پھیل سی گئی تھیں۔

''بولو جواب دو مجھے، اب چپ کیوں ہو گئیں تم۔ تمہیں کیا لگا تھا کہ تم ہمیں سچ نہیں بتاؤ گی تو ہمیں پتا نہیں چلے گا، تم نے اور تمہارے ماں باپ نے ہم سے دھوکا کیا...... کیا سوچ کر دھوکا کیا ہم سے، کیا ہم تمہیں بیوقوف لگتے ہیں کہ ہم ایسی لڑکی کو اپنی بہو بنائیں گے جو پسند کسی کو کرتی ہے اور شادی کسی اور سے۔ تمہاری خاموشی یہ ثابت کر رہی ہے کہ اس لڑکے نے جو کہا ہے سچ کہا ہے۔'' فریدہ بیگم آگ بگولا لہجے میں بول رہی تھیں اور اس کی خاموشی نے جیسے اس پر یقین کی مہر لگا دی تھی۔

فریدہ بیگم کی آخری بات نے تو جیسے مہر النسا کو ہلا کر رکھ دیا تھا وہ تو کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں رہی --- شدید صدمے کی کیفیت نے اسے جیسے نڈھال سا کر دیا تھا اور اتنا نڈھال کہ وہ اپنی صفائی میں کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔ بس فریدہ بیگم کو سنے جا رہی تھی۔

''نہیں یہ جھوٹ ہے، بہتان ہے مجھ پر......'' وہ یک دم سے ہمت جمع کر کے بول پڑی۔ ''اور میرے ماں باپ نے آپ سے کوئی دھوکا نہیں کیا۔ وہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔'' مہر النسا اتنا کہتے ہوئے پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ اس کے الفاظ اس کے آنسو صاف گواہی دے رہے تھے کہ وہ سچ کہہ رہی ہے مگر جن کی آنکھوں پر شک کی پٹی بندھی ہو انہیں کچھ نظر نہیں آتا جیسے فریدہ بیگم کو بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''مجھے کچھ بھی نہیں سننا، اپنا سامان لو اور فوراً نکل جاؤ ہمارے گھر سے بدکردار عورت......!'' یہ کہتے

ہوئے طیش میں آکر فریدہ بیگم نے مہرالنسا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر زور کا دھکا دیا تھا۔ علی جو ہکا بکا سا کت سا گیٹ پر کھڑا ماں کی باتیں سن رہا تھا جلدی سے ہوش میں آکر اندر کی طرف بڑھا تھا اور جلدی سے گرتی مہرالنسا کو سنبھالا تھا۔ وہ اگر بروقت نہ سنبھالتا تو وہ منہ کے بل زمین پر گرتی۔

''علی اسے دھکے دے کر نکالو یہاں سے۔ یہ لڑکی تمہارے قابل نہیں ہے۔ شادی تم سے کی اور پسند کسی اور کو کرتی ہے۔ ایسی لڑکی کو ہم گھر میں نہیں رکھ سکتے، اسے دھکے دے کر باہر نکالو، میں اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی، تمہارے لیے شریف لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔'' فریدہ بیگم غصے سے بھرپور لہجے میں مہرالنسا کی پشت کو گھورتے ہوئے بیٹے سے بولیں تو مہرالنسا نے تڑپ کر جھٹکے سے نظریں اٹھائی تھیں اور علی کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سر نفی میں ہلایا تھا۔

''نن...... نہیں یہ سب جھوٹ ہے، تہمت ہے مجھ پر۔ پلیز آپ ان سب باتوں کا یقین مت کیجیے گا۔'' اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں اپنی صفائی دینی چاہی تھی علی نے ماں کی طرف دیکھا جو غصے سے سرخ چہرہ لیے کھڑی تھی۔

''امی!'' علی کے لب ہلے تھے۔ مگر مہرالنسا کو تو کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے بس علی کے ہلتے لب نظر آئے تھے اور پھر اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ اپنا ہوش کھوتی چلی گئی تھی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں اور سرہانے کھڑی اپنی ساس اور شوہر کو کچھ دیر خالی الذہنی کے ساتھ دیکھتی رہی ...... جب پوری طرح اسے ہوش آیا تو کچھ دیر پہلے ہونے والا واقعہ یاد آیا، اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے...... اسے تین گھنٹے ہوگئے تھے بے ہوش ہوئے۔ وہ جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے دونوں ہاتھ ساس اور شوہر کے سامنے جوڑتے ہوئے رو کر بولی۔

''میں بے قصور ہوں، میرا کوئی قصور نہیں اور نہ

غزل

ہم نے غزلوں میں تمہیں ایسے پکارا محسن
جیسے تم ہو کوئی قسمت کا ستارا محسن
اب تو خود کو بھی نکھارا نہیں جاتا محسن
وہ بھی کیا دن تھے کہ تجھ کو بھی سنوارا محسن
اپنے خوابوں کو اندھیروں کے حوالے کر کے
ہم نے صدقہ تیری آنکھوں کا اتارا محسن
ہم کو معلوم ہے اب لوٹ کے آنا تیرا
نہیں ممکن ہے مگر پھر بھی خدارا محسن
ہم تو رخصت کی گھڑی کو بھی نہ سمجھے محسن
سانس دیتی رہی ہجرت کا اشارہ محسن
اس نے جب، جب بھی مجھے دل سے پکارا محسن
میں نے تب، تب یہ بتایا کہ تمہارا محسن
لوگ صدیوں کی خطاؤں پہ بھی خوش بستے ہیں
ہم کو لمحوں کی وفاؤں نے اجاڑا محسن
ہوگیا جب یہ یقین اب وہ نہیں آئے گا
آنسو اور غم نے دیا دل کو سہارا محسن
وہ تھا جب پاس تو جینے کو بھی دل کرتا تھا
اب تو پل بھر بھی نہیں ہوتا گزارہ محسن
اس کو پانا تو مقدر [illegible] میں نہیں
اس کو کھونا بھی کریں کیسے گوارا محسن

شاعر: محسن نقوی

پسند: نازنین آفریدی، پشاور

ہی میں عدنان کو پسند کرتی تھی۔ اس نے جو بھی آپ سے کہا سب جھوٹ کہا۔ امی، وہ بدلہ لے رہا ہے اس بات کا کہ میرے امی، بابا نے اسے میرا رشتہ دینے سے انکار کردیا تھا۔ پلیز میری بات کا یقین کریں آپ۔'' یہ کہہ کر وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ کب سے خاموش کھڑی فریدہ بیگم تڑپ کر آگے بڑھی تھیں اور اسے اپنے ساتھ لگالیا تھا۔ مہرالنسا جو رو رہی تھی فریدہ بیگم کے اس طرح گلے لگانے پر حیران سی ہوگئی۔

digest-library.com

”مجھے معاف کر دو بیٹی میں نے تم پر تہمت لگائی اور تمہیں بد کردار کہا۔ یہ بات جانتے ہوئے بھی کہ تہمت اور الزام لگانا کتنا بڑا گناہ ہے جس کے لیے چار گواہ بھی ضروری ہیں مگر میں اس خبیث عدنان کی باتوں میں آ گئی جو مجھے نہیں آنا چاہیے تھا...... علی نے مجھے سب سچ بتا دیا ہے کہ شادی سے پہلے ہی تمہارے باپ نے علی کو ساری حقیقت بتائی تھی کہ کیسے عدنان تمہارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا تھا۔“

مہر النسا شدید حیرانی اپنے چہرے پر سجائے ساس کو سن اور دیکھ رہی تھی پھر ان کی آخری بات پر اس نے بے ساختہ علی کی جانب دیکھا تھا جو مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی جانب حیرت سے دیکھتا پا کر اس نے اپنا سر اثبات میں ہلایا تھا...... اسے وہ دن آج بھی یاد تھا۔ جب قیوم صاحب اس سے ملنے آئے تھے اور اس سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے۔ قیوم صاحب زمانہ شناس انسان تھے، علی کی شکل دیکھ کر ہی سمجھ گئے تھے کہ یہی نوجوان اُن کی بیٹی کے قابل ہے اور پھر کچھ سوچتے ہوئے اور اپنی سوچ پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے گلا کھنکھارا اور بات شروع کی۔

”علی بیٹا، مجھے تمہیں ایک بات بتانا تھی۔ یہ بات میری بیٹی کے متعلق ہے...... ساری بات سننے کے بعد تمہارا جو فیصلہ ہوگا مجھے قبول ہوگا بیٹا...... کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ آگے جا کر تمہاری یا میری بیٹی کی زندگی میں کوئی پریشانی آئے اس لیے تمہیں باخبر رکھنا ضروری ہے۔“ قیوم صاحب کے سنجیدگی سے کہنے پر علی کے چہرے پر حیرت ظاہر ہوئی تھی جسے وہ چھپاتے ہوئے باادب لہجے میں بولا۔

”جی، جی انکل میں سن رہا ہوں آپ کی بات، آپ کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ علی کے کہنے پر قیوم صاحب ایک گہری سانس لے کر عدنان کے بارے میں اسے سب بتانے لگے جسے سن کر علی کے چہرے پر حیرت کے ساتھ غصے کے آثار نمودار ہوئے تھے اور قیوم صاحب نے اس کا غصے سے سرخ ہوتا چہرہ بغور دیکھا تھا۔

”اب بتاؤ بیٹا تمہارا کیا فیصلہ ہے؟“ قیوم صاحب اسے خاموش دیکھ کر نرمی سے بولے تو علی نے اپنا سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا پھر ایک گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے بولا تو اس کے لہجے میں سچائی بول رہی تھی۔

”سب سے پہلے تو میں یہ کہوں گا انکل کہ آپ نے مجھے سچائی بتا کر بہت اچھا کیا کیونکہ عدنان جیسا شخص مجھے چپ رہنے والوں میں سے نہیں لگتا۔ اگر اس نے آپ کی بیٹی کو دھمکی دی ہے تو وہ ضرور عمل بھی کرے گا اور آگے جا کر اس کے لیے مشکل بھی کھڑی کر سکتا تھا اور رہی بات فیصلہ کرنے کی تو میرا فیصلہ وہی ہے انکل جو پہلے تھا۔ میں آپ کی بیٹی سے ہی نکاح کروں گا۔ اس سب میں آپ کی بیٹی کا کوئی قصور نہیں تو اس کو سزا کیوں ملے۔ آج کل تو یہ عام ہوگیا ہے انکل۔ ہماری بیٹیاں، بہنیں ان برے لڑکوں کی وجہ سے گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتی ہیں، آگے تعلیم حاصل نہیں کر پاتیں اور بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ دنیا بھی ان معصوم لڑکیوں کو ہی برا بھلا کہتی ہے۔ ان پر پابندیاں اور سخت کر دیتی ہے جس سے وہ جیتے جی مر جاتی ہیں۔ آپ نہ صرف اچھے انسان ہیں بلکہ اچھے باپ بھی۔ آپ اپنی بیٹی کے لیے پریشان مت ہوں، مجھے بہت اچھا لگا انکل کہ آپ نے اپنا سمجھ کر مجھ پر بھرپور اعتماد کیا اور سب کچھ صحیح صحیح بتا دیا۔ آپ فکر نہیں کریں، آپ کی بیٹی کے کردار کی حفاظت اب میری ذمے داری ہے۔“ وہ بھرپور تسلی دیتے ہوئے پُراعتماد لہجے میں بولا تو قیوم صاحب بھی مسکرا دیے۔

”مجھے تم پر فخر ہے بیٹا، ہر مضبوط مرد کو ایسا ہی سوچنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی تمہارے ساتھ ہمیشہ خوش رہے گی پہلے جو پریشانی تھی اب تم سے باتیں کرنے کے بعد نہیں رہی۔ خوش رہو میرے بچے۔“ قیوم صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اس کے دونوں مضبوط کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ کر دبا کر فخر اور محبت سے بولے تو علی مسکراتے ہوئے ان کے گلے لگ گیا۔

”آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ بابا جان نے

آپ کو ساری سچائی پہلے ہی بتا دی تھی۔'' مہرالنسا اس سے حیرت سے پوچھنے لگی تو علی مسکرایا اور اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تم نے بھی تو مجھے نہیں بتایا تھا کہ عدنان نے تمہیں کال کی تھی۔''

وہ اس کی بات اسی پر لوٹاتے ہوئے بولا تو مہرالنسا لاجواب ہو کر اپنا سر جھکا گئی اور اسے یوں شرمندگی سے اپنا سر جھکاتا دیکھ کر علی نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''میں نے تمہیں شرمندہ کرنے کے لیے یہ بات نہیں کہی جو تم اپنا سر جھکا رہی ہو۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تم مجھ پر بھروسا تو کر سکتی تھیں ناں۔ مجھے ساری سچائی بتا دیتیں تو تمہیں ذہنی اذیت نہ اٹھانی پڑتی۔''

اس کی بات پر مہرالنسا نے اپنا سر اٹھا کر حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا جو اسے ہی مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''میں نے آپ کو اس لیے نہیں بتایا کیونکہ مجھے لگتا تھا کہ اگر میں نے آپ کو سچ بتا دیا تو میں آپ کی نظروں سے گر جاؤں گی اور آپ مجھے گھر سے باہر نکال دیں گے...... اور شاید اپنی زندگی سے بھی کیونکہ آپ کے دل میں میرے لیے شک آ جاتا ناں اور جب شک بیچ میں آ جائے تو پھر کچھ بھی نہیں بچتا۔ کچھ بھی نہیں...... اور میں ایسا بالکل بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں اپنے ماں باپ کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں خاموش رہی اور آپ کو کچھ بھی نہیں بتایا۔'' مہرالنسا بھرائے ہوئے لہجے میں اپنی صفائی دیتے ہوئے بولی۔

''تم اپنی جگہ پر حق پر تھیں مہرالنسا کیونکہ شک کرنا عام مرد کی فطرت ہے اور یہی وجہ ہے کہ عورت بیچاری حق پر ہوتے ہوئے بھی ڈرتی ہے۔ عورت کمزور نہیں ہوتی بلکہ وہ رشتوں کو بچانے کی وجہ سے کمزور پڑ جاتی ہے۔ مگر تم میری یہ بات یاد رکھنا مہرالنسا مجھے تم پر پورا بھروسا ہے اور رہے گا کیونکہ میاں بیوی میں سب سے پہلے بھروسا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ بغیر بھروسے اور اعتبار کے رشتے کمزور پڑ جاتے ہیں اور میں اپنے رشتے کو کبھی کمزور پڑنے نہیں دوں گا۔'' علی یقین بھرے لہجے میں بولتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو لبوں سے لگاتے بولا تو مہرالنسا نم آنکھوں مسکرائی تھی۔

''شکریہ مجھ پر اعتماد اور بھروسا کرنے کے لیے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

پھر علی کو اپنی جگہ سے اٹھتا دیکھ کر بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟'' اس کے یوں.... بے ساختہ پوچھنے پر علی نے خوشگوار تاثر لیے مسکرا کر اسے دیکھا تو وہ بری طرح سے جھینپ گئی اور اسے یوں جھینپتا دیکھ کر علی کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ آ گئی۔

''میں عدنان کے پاس جا رہا ہوں۔'' علی نے مذاقاً کہا تو مہرالنسا کی آنکھوں میں جیسے خوف اتر آیا جسے اس نے بغور پڑھ لیا تھا۔

''آپ اس سے کیا لڑنے جا رہے ہیں۔ پلیز اگر ایسا ہے تو آپ مت جائیں اور اس بات کو یہیں ختم کر دیجیے۔'' مہرالنسا ملتجی لہجے میں بولی تو علی مسکرا دیا۔

''میں لڑنے کے لیے نہیں جا رہا مہرالنسا بلکہ میں اسے یہ بات سمجھانے کے لیے جا رہا ہوں کہ اب وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دے اور تمہیں اکیلا سمجھنا بھی چھوڑ دے۔ اسے میں یہ بات اچھی طرح سمجھاؤں گا کہ میاں بیوی کا رشتہ اتنا کمزور نہیں ہوتا کہ کوئی بھی بیچ میں آ کر توڑ دے۔ اس لیے وہ یہ بیکار کی کوشش نہ کرے۔ اگر پھر بھی وہ نہیں مانا تو مجھے دوسری زبان میں سمجھانا آتا ہے۔ اس لیے تم پریشان مت ہو۔'' آہستہ سے کہہ کر وہ اس کا سر پیار سے تھپتھپا کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا اور پیچھے مہرالنسا نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ دل سے مسکرا اٹھی تھی۔

علی جیسا مرد ساتھ ہو تو ڈر کیسا۔ یہ سچ ہے کہ میاں بیوی میں بھروسا ہو تو کسی کو کوئی جرأت نہیں کہ ان کے بیچ بدگمانی ڈال کر ان کا رشتہ کمزور کر دے۔ رشتوں کو مضبوط، اعتماد اور بھروسا ہی بناتا ہے۔

منی ناول

ساحل

اشرف منہاس

Digest Novels Lovers group

گیارھواں حصہ

دریائے برزبن کے کنارے موجود فارم ہاؤس میں اس کی سفید بوگاتی داخل ہوئی، آج وہ کافی دنوں کے بعد یہاں آئی تھی۔ گاڑی سے اتر کر اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی، یہ اس کے باپ کا فارم ہاؤس تھا جو شہر سے ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر موجود تھا۔ فارم ہاؤس کیا تھا بلکہ اس کے باپ کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی جس میں زندگی بلکہ عیش کی زندگی گزارنے کا ہر سامان دستیاب تھا۔ یہاں کھیت بھی تھے، پھلوں کے باغات بھی، جنگل بھی اور اس جنگل میں طرح، طرح کے جانور بھی۔ اس میں ایک جھیل بھی تھی جس کے کنارے چھوٹی کشتیاں کھڑی تھیں حتیٰ کہ ایک رن وے بھی موجود تھا جس کے آخری سرے پر سات نشستوں والا ایک پرائیویٹ جیٹ ہینگر میں کھڑا تھا۔

گاڑیوں کے لیے علیحدہ پورچ تھا جس میں طرح، طرح کی شاندار گاڑیاں کھڑی تھیں، کچھ اس کے باپ کی اور کچھ اس کے باپ کے مہمانوں کی۔ اس میں کئی ان

ڈور اور آؤٹ ڈور سوئمنگ پول بھی تھے جن میں سے ایک کے کنارے حلیل شامیر اشکول اس وقت بھی اپنے کچھ کرائم پارٹنرز کے ساتھ موجود تھا۔

رہائشی عمارت فارم ہاؤس کے بیچوں بیچ واقع تھی جس میں بے شمار کمرے، ڈرائنگ رومز، ڈائننگ رومز، میٹنگ روم، جم، سینما اور جانے کیا کچھ موجود تھا۔ یہاں اکثر بڑی، بڑی دعوتیں اور پارٹیاں ہوتی رہتی تھیں، ریاست کے مہمانوں کو بھی یہاں ٹھہرایا جاتا تھا۔ وہ لوگ جو اسرائیلی ریاست کے لیے کسی بھی حوالے سے کارآمد ہوسکتے تھے ان کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔

وہ یہ سب کچھ بچپن سے دیکھتی آرہی تھی کہ کس طرح یہاں پر مہمانوں کے نام پر بڑے، بڑے مجرم اکٹھے ہوتے ہیں اور دنیا کے وسائل لوٹنے، لوگوں کو غلام بنانے اور ریاستوں کو کھوکھلا کرنے کے منصوبے بنائے جاتے ہیں۔

وہ ان سب چیزوں سے بیزار تھی اسی لیے بہت کم اس فارم ہاؤس پر آتی تھی۔ جب سے اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا وہ شہر میں ہی رہ رہی تھی۔ باپ کے اصرار کے باوجود اسے یہاں رہنا پسند نہیں تھا۔

اس کے باپ نے اسے آتے دیکھ لیا تھا لیکن وہ سوئمنگ پول کی طرف آنے کے بجائے اندر چلی گئی۔

حلیل شامیر اشکول کو شادی کے 12 سال بعد ملنے والی یہ پہلی اولاد بہت پیاری تھی۔ اس کی پیدائش پر اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا اس کے بعد اس نے ایک امریکی عورت سے شادی کی تھی جس سے اس کے دو بچے تھے جو ابھی چھوٹے تھے۔ اس کی بیوی ان بچوں کے ساتھ امریکا میں رہائش پزیر تھی۔

سیرا کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا اور وہ پوچھے بغیر جان گیا تھا کہ کیا ہوا ہوگا۔ اسے بیٹی کے گزرے ہوئے ایک ایک پل کی خبر ہوتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ آج کل ایک مسلمان پاکستانی لڑکے میں دلچسپی لے رہی ہے۔ یہ بات اس کے لیے ناقابلِ قبول بھی تھی اور

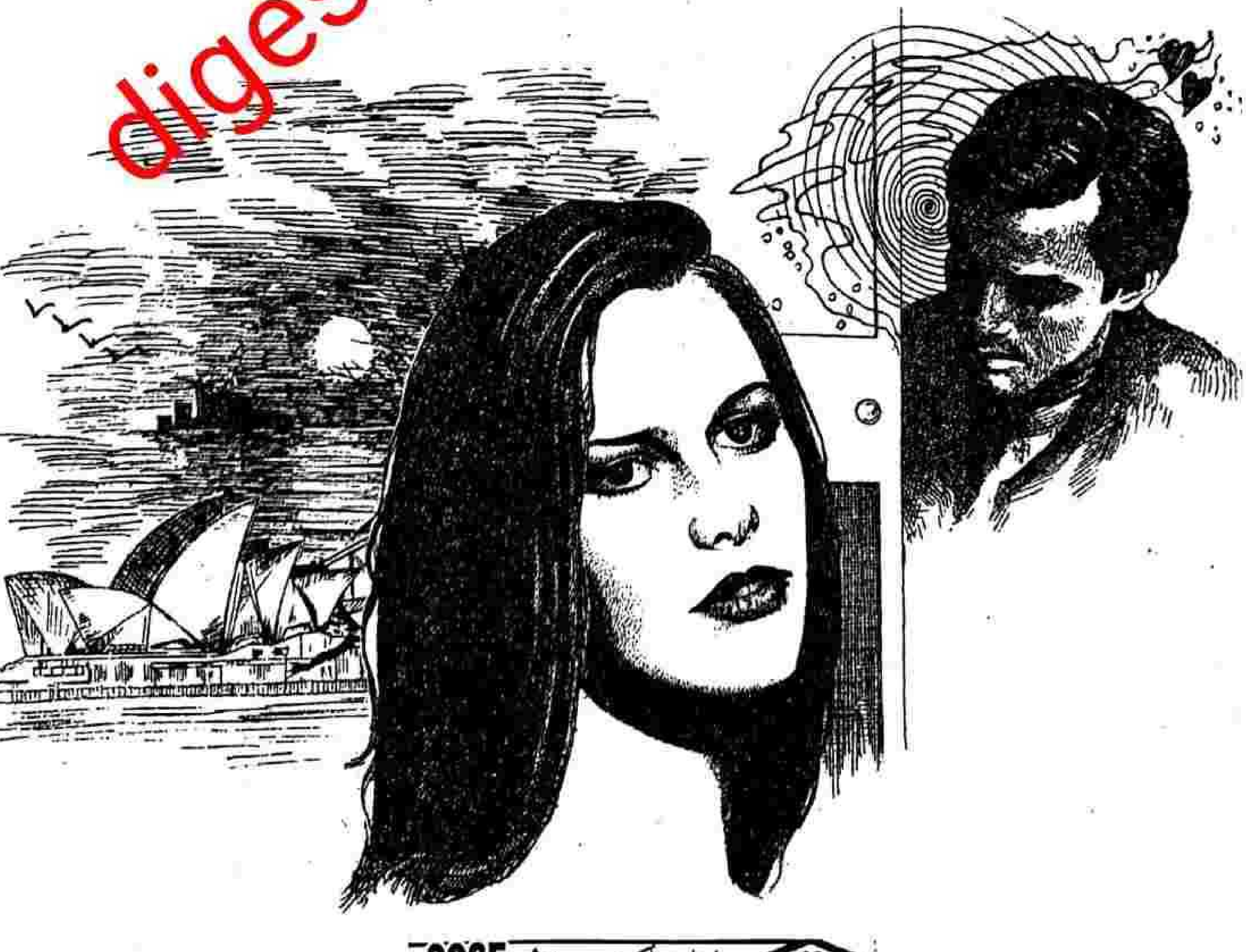

ناقابلِ برداشت بھی لیکن اسے جو کچھ کرنا تھا بہت سوچ سمجھ کر بڑے تحمل کے ساتھ کرنا تھا کیونکہ وہ بیٹی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے صبر کے ساتھ اس وقت کا انتظار کرنا تھا جب وہ اس لڑکے کو اپنی... بیٹی کی زندگی میں آنے کی سزا دے سکے۔ حالانکہ وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ یہ دلچسپی یکطرفہ تھی، اس کی بیٹی ہی کی طرف سے تھی مگر وہ اس بات کا غصہ اس پر نہیں نکال سکتا تھا اس لیے وقتی طور پر وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن آج سیرا کے چہرے کو دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ سب کچھ ہار کر واپس آئی ہے۔

وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی اور دروازہ بند کر لیا کیونکہ جانتی تھی کہ اس کے باپ نے اسے آتے ہوئے دیکھ لیا ہے اور ہو سکتا ہے وہ اس کے پیچھے اس کے کمرے تک آئے اور ابھی وہ کسی قسم کے سوال جواب کے لیے تیار نہیں تھی۔

☆☆☆

وہ بہت دیر سے آئینے کے سامنے کھڑی خود کو دیکھ رہی تھی اور بار، بار خود سے یا پھر آئینے سے ایک ہی سوال پوچھ رہی تھی۔

"کیا کمی تھی مجھ میں؟"

"کوئی کمی نہیں تھی۔" ہر دفعہ پوچھنے پر اسے یہی جواب ملا تھا۔

خود آئینہ اس کے سامنے حیران و ششدر کھڑا تھا۔ اتنا حسن اس نے بھی کہاں دیکھا تھا۔

"پھر اسے یہ سب کیوں نظر نہ آیا؟" اس نے لہو ہوتے دل کے ساتھ دوسرا سوال کیا مگر اس دفعہ اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ تھک ہار کر بستر پر آ بیٹھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں سے ہوتے ہوئے اس کی گردن تک آ پہنچے تھے اور اس کے گریبان میں جذب ہو رہے تھے۔ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی، حسن کی، نہ اثر رسوخ کی، نہ ہی دولت کی لیکن فرات کو کوئی چیز متاثر نہیں کر سکی تھی اور اب وہ دولت کے انبار پر اکیلی رہ گئی تھی۔ اپنا حسن، اپنی خوب صورتی اسے بالکل بیکار اور بے فائدہ لگ رہے تھے۔

پھر تھوڑی دیر بعد اس کے اردگرد فرات کی وہ ساری تصویریں بکھری پڑی تھیں جو اس نے مختلف وقتوں میں بنائی تھیں۔ وہ ایک، ایک تصویر کو اٹھا، اٹھا کر دیکھتی اور پھر اس سے بھی یہی سوال پوچھتی۔

"تم نے لارین میں کیا دیکھا..... ایسا کیا دیکھا جو مجھ میں نہیں تھا، میرا حسن، میرا شوق، میری دیوانگی، میری قربانی کوئی بھی چیز تمہارے قدموں کی زنجیر کیوں نہیں بن سکی؟"

وہ ہر تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی ایک، ایک ادا کو ذہن نشین کر رہی تھی۔ اس پر گہرے رنگ بہت اچھے لگتے تھے مگر نیوی بلیو رنگ سب سے زیادہ اچھا لگتا تھا۔ اس کی لامبی گہری سیاہ آنکھوں میں ایک مخصوص قسم کی معصومیت تھی جو ہر لڑکی کو خاص طور پر متوجہ کرتی تھی۔ وہ آس پاس ہوتا تو اس سے ڈر نہیں لگتا تھا بلکہ ایک خاص قسم کے تحفظ اور اپنائیت کا احساس ہوتا لیکن جب وہ کسی لڑکی کی آنکھوں میں اپنے لیے التفات دیکھتا تو فوراً لاتعلق ہو جاتا۔ اس کی آنکھوں میں معصومیت کی جگہ اجنبیت اور ہلکا، ہلکا غصہ دکھائی دیتا، اس کی آنکھوں کا بدلتا انداز اسے اور بھی زیادہ جاذبِ نظر بنا دیتا، اس کے لیے چاہت اور بھی بڑھ جاتی یہاں تک کہ اسے ہر قیمت پر پالینا زندگی کا واحد مقصد بن جاتا۔ سیرا اور اس کی طرح کی کسی لڑکی نے اپنے آس پاس اس طرح کا کوئی لڑکا کبھی نہیں دیکھا تھا جس کی طرف جتنے ہاتھ بڑھتے ہوں وہ اتنا ہی دور ہو جاتا ہو۔ اس کا پہنچ سے دور ہو جانا ہی اسے خاص بناتا تھا۔

مگر ایک لڑکی ایسی بھی تھی جس کے لیے اس کی آنکھوں میں فکر ہوتی، تشویش ہوتی۔ سیرا بہت پہلے سمجھ چکی تھی کہ اس کا جھکاؤ کس طرف ہے۔ وہ جس طرح لارین کو دیکھتا اور جس طرح اس کا محافظ بن کر اس کے آس پاس موجود رہتا یہ ساری باتیں ایک ہی بات کی طرف اشارہ کرتی تھیں کہ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتا تھا یا شاید اعتراف کرتے ہوئے

شرماتا تھا ورنہ یوں اس کو ہتھیلی کا چھالا نہ بنائے رکھتا۔

"میں نے تمہیں اتنے گلدستے بھیجے۔" کچھ دن پہلے ہی اس نے فرات سے کہا تھا۔ "گلدستہ نہ سہی ایک آدھ پھول ہی دے دو، میں بھی خوش ہو جاؤں گی۔"

"میں پھول توڑنا گناہ سمجھتا ہوں۔" اس نے ٹکا سا جواب دیا۔ "پھول توڑنا ایسے ہی ہے جیسے بچے کو اس کی ماں سے جدا کر دیا جائے۔"

سیرا کو اس سے ایسے ہی کسی جواب کی توقع تھی مگر اس کے باوجود وہ دل مسوس کر رہ گئی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ جب اسے اپنے قبولِ اسلام کے بارے میں بتائے گی تو وہ خوش بھی ہوگا اور سیرا سے متاثر بھی مگر حسبِ معمول اس کا رویہ توقعات کے بالکل برعکس تھا۔

"تم نے اسلام کیوں قبول کیا، کیا تم نے قرآن پڑھا ہے یا پھر پیغمبر کی سیرت...... تمہیں کس چیز نے متاثر کیا؟" اس کے بتانے پر اس نے کئی سوال پوچھے تھے۔

"تمہاری خاطر...... صرف اور صرف تمہاری خاطر۔" اس نے صاف اور سیدھا جواب دیا تھا۔ "ایک عرصہ ہوا میں نے اپنے لیے جینا چھوڑ دیا ہے۔ میرا جینا، میرا مرنا، میرا ہنسنا، میرا رونا اب صرف اور صرف تمہاری خاطر ہے......" اس نے دل ہاتھ میں لیے فرات کی بات کا جواب دیا تھا لیکن وہ متاثر نہیں تھا، وہ دیکھ رہی تھی وہ ذرا سا بھی متاثر نہیں تھا۔

اور اب...... اب وہ چلا گیا تھا۔ یہ سوچ کر اس کے سینے سے سرد آہ نکلی۔ اس کے پاس اس کی چند نشانیاں رہ گئی تھیں۔ اس کی ہنستی مسکراتی تصویریں اور یکطرفہ محبت کی ادھوری یادیں۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ سیرا نے جلدی سے تمام تصویریں سمیٹ کر تکیے کے نیچے رکھیں اور آنسو صاف کیے۔ اس کا باپ اندر آ چکا تھا۔

"آج مجھے ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں سڈنی جانا ہے، اچھا ہوا تم آ گئی ہو۔ ہم یہاں سے جا رہے ہیں، تمہاری پڑھائی ویسے بھی ختم ہو چکی ہے اور میرا کام بھی یہاں پر مکمل ہو چکا ہے اس لیے اب یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ تم اپنی تیاری کر لو، ہمیں تھوڑی دیر میں نکلنا ہے۔" وہ اسے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا اسی لیے حتمی انداز میں بولا۔ عموماً وہ بیٹی سے اس طرح بات نہیں کرتا تھا لیکن اب حالات مختلف تھے۔ اس نے اسے جتنی آزادی دینی تھی دے دی تھی لیکن اب اسے مزید کوئی بیوقوفی نہیں کرنے دینا چاہتا تھا۔

سیرا نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔ اس کے لیے یہ تصور بھی سوہانِ روح تھا کہ وہ جو اس کی زندگی سے جا چکا تھا وہ بھی اس سے دور چلی جائے۔ مانا کہ وہ اس کا نہیں ہو سکا تھا لیکن وہ کم از کم اس شہر میں سانس لیتا تھا۔ اب اس کے لیے یہ چھوٹی، چھوٹی تسلیاں ہی کافی تھیں۔ وہ جتنا دور تھا وہ اسے اتنا ہی قریب محسوس کرتی تھی لیکن ڈیڈی کے تیور سے لگ رہا تھا کہ وہ اب اسے یہاں سے لے جائیں گے۔

"ٹھیک ہے، میں آپ کے ساتھ چلوں گی لیکن آج نہیں کل۔" وہ بھی حتمی انداز میں بولی۔

"چلو میں تمہیں ایک دن کی مہلت دے دیتا ہوں لیکن کل میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گا، کل ہمیں یہاں سے جانا ہی ہوگا۔" وہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ اس کے چہرے پر آنسوؤں کے نشانات دیکھ چکا تھا اور دل ہی دل میں یہ عہد بھی کر رہا تھا کہ جیسے ہی مناسب موقع آیا وہ اس لڑکے کو جو اس کی بیٹی کے آنسوؤں کی وجہ تھا ضرور سبق سکھائے گا۔ وہ صرف اور صرف اپنی بیٹی کی وجہ سے مجبور تھا ورنہ دنیا کے ہر فساد کے پیچھے اس کا اور اس کے گماشتوں کا ہاتھ ہوتا تھا۔ ایسے میں اس لڑکے کو راستے سے ہٹانا تو کچھ مشکل ہی نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ یہ شہر چھوڑ کر جا رہی تھی، نہیں جانتی تھی کہ اس کے بعد دوبارہ کب یہاں آئے گی اور اب لگتا یوں تھا کہ آئندہ زندگی شاید اسے اپنے باپ کی مرضی سے گزارنی پڑے۔ اس کا دل دکھ سے بھرا ہوا تھا مگر جانے سے پہلے اس نے ایک بہت ضروری کام کر لیا تھا...... اپنی محبت کا

ایک آخری ثبوت۔

وہ روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی باپ کے ساتھ جہاز میں جا بیٹھی اور مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی جیسے اسے امید ہو کہ کوئی آئے گا اور اسے روک لے گا۔ چھوٹا جہاز رن وے پر دوڑتا ہوا زمین چھوڑ کر آسمان کی طرف بلند ہوگیا۔ ڈیڈی نے اس سے بات کرنے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ''ہوں، ہاں'' کے سوا کوئی جواب نہیں دیا۔ جہاز اب شہر سے باہر ایک جنگل پر پرواز کررہا تھا کہ اچانک پائلٹ کی آواز آئی۔ جہاز میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی جس کی وجہ سے اس کا آگے بڑھنا مشکل نظر آرہا تھا۔ ڈیڈی نے متوحش نظروں سے پائلٹ کی طرف دیکھا مگر اس کے آخری الفاظ یہی تھے...... ."Please eject" (باہر نکل جائیں)

سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ غیر ارادی طور پر سب نے اگلے ہی لمحے سیٹ کے ساتھ لگے ہوئے بٹن دبائے اور تباہ ہوتے جہاز کو چھوڑ کر سیٹوں سمیت باہر نکل گئے۔ اس کے بعد کے معاملات جیسے خواب کی طرح تھے۔ سیٹ کا گرنا، پیراشوٹ کا کھلنا اور پھر اس پیراشوٹ کا آہستہ، آہستہ زمین کی طرف سفر سب کچھ ناقابلِ یقین تھا زندگی کی طرح۔

حلیل شاہ میر اشکول کا صدمہ بیٹی اور پائلٹ سے کہیں بڑا تھا۔ اس نے زندگی بھر لوٹ مار کر کے ہزار سالہ زندگی کی امید پر جو دولت کمائی تھی اسے چھوڑ کر جانا اذیت ناک تھا مگر اس کے ساتھ یہ بھی امید تھی کہ اس نے اس دولت سے جو جدید ٹیکنالوجی خریدی تھی وہ اسے بچا لے گی۔ وہ کسی صورت مرنا نہیں چاہتا تھا اور اسے یقین تھا کہ ابھی اسے موت نہیں آئے گی، ابھی تو اس نے اپنی کمائی ہوئی دولت کو خرچ کرنا تھا، ابھی تو بیٹھ کے کھانے کا وقت آیا تھا۔

جہاز کو آگ لگ چکی تھی۔ جلتے ہوئے جہاز میں سے کچھ ان کے پیراشوٹ پر گرا تھا۔ یوں زمین کی طرف ان کا سفر اور تیز ہوگیا تھا۔ باپ، بیٹی جنگل میں قریب، قریب ہی گرے تھے پھر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کی بیٹی کس قدر اذیت سے دوچار تھی۔ شاید اس کے جسم کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں اور وہ خود اس حال میں تھا کہ اس کی ایک ٹانگ جسم سے جدا ہوگئی تھی اور دوسری ٹانگ بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ اس قابل بھی نہیں تھا کہ گھسٹ کر ہی کہیں جا سکتا۔ اس کی اذیت دوچند ہوگئی، وہ ایک سنگدل شخص تھا، اس نے لاکھوں مسلمانوں اور ان کے بچوں کا خون پی رکھا تھا مگر اپنی اولاد کو اپنی آنکھوں کے سامنے اس حال میں دیکھنا ایک بالکل مختلف تجربہ تھا لیکن اس سے بھی بڑی اذیت یہ تھی کہ وہ اپنی دولت کے بغیر دنیا سے جا رہا تھا۔

''ڈیڈی۔'' ذرا فاصلے پر موجود سیرا کی اذیت میں ڈوبی آواز ابھری۔ ''مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔''

عجیب بات یہ تھی کہ فلسطین کے ہزاروں بچوں کی ہڈیاں تک چبا لینے والا شخص آج اپنی بیٹی کا درد محسوس کررہا تھا، انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ آج وہ اچھی طرح سے سمجھ سکتا تھا کہ کٹے پھٹے جسموں کی تکلیف کیسی ہوتی ہے۔

''مجھے معلوم ہے میں زن...... زندہ نہیں بچوں گی۔'' سیرا کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''اس لیے آپ کو بتا رہی ہوں کہ...... کہ میں نے اسلام قبول کرلیا ہے اور...... اور...... میں چاہتی ہوں کہ میں مروں تو مجھے اسی طریقے پر دفن کیا جائے۔''

جہاز کا تباہ ہونا، خود اس کا جنگل میں گر کر ٹانگیں ٹوٹ جانا، بدترین خوف، اذیت اور بے بسی کا شکار ہونا، بیٹی کا آنکھوں کے سامنے موت کی اذیت میں مبتلا ہونا، اس کا عقیدہ بدل لینا یہ سب بڑے صدمے تھے مگر اتنے بڑے نہیں تھے جتنا بڑا صدمہ اسے اپنی ہی بیٹی کی آخری بات نے پہنچایا تھا...... اس کی سانس دشوار ہوگئی تھی، موت اب یقینی تھی۔ اس کی نادان بیٹی کی وجہ سے اس کا سب کچھ غیروں کے ہاتھ میں جاچکا تھا اور یہ صدمہ ہر صدمے سے بڑھ کر تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا آخری وقت ایسا ہوگا۔ اس نے شدید بے بسی اور اذیت کے عالم میں سرزمین پر

digest library.com

رکھ دیا۔

☆☆☆

پادری ڈیول (اینجل) جب سے جیل سے واپس آیا تھا اس کی سرگرمیاں بڑی حد تک محدود ہو چکی تھیں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ اس نے جرائم سے توبہ کر لی تھی۔ وہ تو اندر ہی اندر کھول رہا تھا اور انتقام لینے کے لیے صرف مناسب وقت کے انتظار میں تھا۔ وہ اپنے گندے ارادوں سے باز نہیں آیا تھا۔ اس نے ان ناموں کی پوری ایک فہرست تیار کر رکھی تھی جو اس کے نشانے پر تھے۔ ان ناموں میں سے ایک نام فرات کا بھی تھا کیونکہ اس کے خلاف ہونے والے مظاہروں میں وہ پیش، پیش تھا اور پولیس اسٹیشن میں اس کے خلاف رپورٹ درج کروانے والوں میں بھی وہ شامل تھا مگر اس سے پہلے اسے اپنے گھر کی خبر لینی تھی۔

جب لارین گھر میں داخل ہوئی تو وہ کھڑکی کے پاس کھڑا باہر کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اب ایسا چہرہ ہو گیا تھا کہ جس نے دیکھا لعنت ہی بھیجی اور یہ بات وہ خود بھی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اگر وہ بدترین ذہنی بیماری کا شکار نہ ہوتا تو اپنے لیے اتنی نفرت دیکھ کر کب کا خودکشی کر چکا ہوتا۔

لارین گھر واپس آ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک غیر محسوس مسکراہٹ تھی۔ کچھ عرصے سے وہ محسوس کر رہا تھا کہ لارین اب بہت پُرسکون اور خوش رہنے لگی تھی۔ وہ پہلے جیسی گھبرائی ہوئی، پریشان اور گم صم لڑکی نہیں رہی تھی۔ وہ اس تبدیلی کو بہت عرصے سے نوٹ کر رہا تھا لیکن اپنی مصروفیات کی وجہ سے زیادہ کھوج نہیں لگا پایا تھا۔ وہ کیوں خوش اور پُرسکون رہنے لگی تھی، ایسی کون سی بات تھی جو اس کے علم میں نہیں تھی مگر اسے خوش کر رہی تھی؟ یہ جاننا بہت ضروری تھا۔

جب اس نے قرآن جلانے کا مذموم منصوبہ بنایا تھا تو سب سے پہلے لارین کو ہی بتایا تھا جو کہ اس کے خیال میں اس سے اب اتنی تربیت لے چکی تھی کہ اسے باپ کی جگہ لے لینی چاہیے تھی، اس کا ساتھ دینا چاہیے تھا لیکن اس نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ اس نے بے اختیاری کے عالم میں کچھ ایسے لفظ بولے تھے جس سے اسے یہ شک پڑ گیا تھا کہ وہ باپ کے منصوبے سے متفق نہیں ہے۔ پھر اس کے بعد جب بھی اس نے لارین کے ساتھ اس موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی اس نے موضوع بدل دیا۔ اس مہم میں اسے لارین سے جتنی مدد کی توقع اور ضرورت تھی وہ اسے نہیں ملی تھی۔ اس کے جیل جانے کے بعد وہ صرف ایک دفعہ باپ سے ملنے آئی تھی اور اس کی رہائی کے لیے اس نے کوئی خاص کوشش نہیں کی تھی۔ اسے یہ ساری باتیں اچھی طرح سے یاد تھیں۔

وہ سیدھی ماں کے کمرے میں گئی۔

”ممی! اب آپ کو ڈیڈی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ ماں کے پاس بیٹھی اس سے کہہ رہی تھی۔ ”اور نہ ہی ان کی دی ہوئی دوائیں کھانے کی ضرورت ہے۔ میں اب آپ کو یہاں سے بہت دور لے جاؤں گی...... میں آپ کو نانا کے قاتل سے بہت دور لے جاؤں گی۔“

وہ اپنی طرف سے ماں کو بہت بڑی خوشخبری دے رہی تھی یہ جانے بغیر کہ اس کا باپ دروازے پر کھڑا سب سن رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھولی نہیں تھی کہ اس کا باپ ہی اس کے نانا کا قاتل تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی ماں کی اس حالت کا ذمے دار بھی اس کا باپ ہی تھا۔ اگر وہ باپ کے جرائم سے واقف تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ پادری اینجل کے لیے کسی بھی وقت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ آنکھوں میں گہری سوچ لیے لائبریری کی طرف آ گیا۔

لارین، ماں کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ چکی تھی۔ گزرتے، گزرتے آئینے میں اس نے اپنا عکس دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے کی حیرانی اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ اسے فرات کا خیال آیا۔ آج اس کی آنکھوں اور اس کے چہرے پر کچھ ایسا تھا جو لارین کی توجہ تقسیم کر رہا تھا۔ اس کا کہا ایک، ایک لفظ اسے یاد آ رہا تھا بلکہ اس گفتگو کو وہ بھولی ہی کب تھی اور پھر اس کی طرف سے شادی کی پیشکش...... لارین کی زندگی

کا سب سے حیرت انگیز واقعہ تھا حالانکہ وہ ہمیشہ سے اس کے ساتھ تھا، وہ اس کی عادی ہو چکی تھی۔ وہ اتنا ساتھ تھا کہ اس کے خوابوں تک میں موجود تھا مگر پھر بھی...... پھر بھی ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا، اسے یہ فرق یاد رکھنا چاہیے۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر فیصلہ کیا مگر اسے کوئی جواب تو دینا تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ صرف اپنی مرضی کا جواب سنے گا۔

''لارین۔'' ڈیڈی کی آواز سنائی دی اور وہ آئینے کے سامنے کھڑی چونک گئی۔ اسے اچانک یاد آ گیا کہ وہ پادری اینجل کی بیٹی ہے۔ پادری اینجل جو ایک اندھا کنواں تھا اور اس کے اور فرات کے بیچ حائل تھا۔ (صرف نام ہی اینجل تھا کام تو ڈیول سے بھی بڑھ کر تھے)

''لارین۔'' آواز دوبارہ سنائی دی۔ اب کے اس آواز میں دبا، دبا غصہ اور تنبیہہ موجود تھی۔ بہت دنوں سے اس نے لارین سے اعتراف نہیں کروایا تھا اور اس کے لیے یہی وقت مناسب تھا۔ اس کی زندگی میں ایسی کون سی خوشگوار تبدیلی آئی تھی جس نے اس کے اعتماد اور سکون میں اضافہ کیا تھا۔ وہ اور کیا کچھ جانتی تھی اور کیا کچھ کرنے کا ارادہ کیے بیٹھی تھی یہ جاننا بہت ضروری ہو گیا تھا۔ شاید ایک آخری اعتراف کا وقت آ گیا تھا۔

☆☆☆

بہت دیر سے اس نے اپنی بیٹی کی آواز نہیں سنی تھی۔ نہ جانے مسلمانوں کے کتنے ہی بچے اس سفاک کے ہاتھوں موت کی نیند سو گئے تھے۔ ان بچوں کے ماں، باپ بھی اسی طرح اپنی اولاد کو آوازیں دیتے رہے ہوں گے مگر ایک ہولناک خاموشی اور بچوں کے چیتھڑوں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا ہوگا۔ آج اس کا بھی آوازیں دے، دے کر گلا بیٹھ گیا تھا، حلق سوکھ گیا تھا مگر ہر طرف جنگل کی ہیبت ناک خاموشی اور نہ ختم ہونے والی اذیت کا راج تھا۔ اسے موت کا انتظار تھا جو آ کر نہیں دے رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے دائیں طرف دیکھا جہاں کچھ فاصلے پر اس کی اکلوتی بیٹی زندگی اور موت کی کشمکش سے شاید آزاد ہو چکی تھی کیونکہ بہت دیر سے وہ خاموش تھی۔

جنگل میں ایک مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا، بس سانس لینے کی آواز تک سنائی دے رہی تھی لیکن کوئی بچانے والا نہیں تھا۔ دولت نہ ٹیکنالوجی، نہ اثر رسوخ، نہ بدمعاش دوست۔ رات قریب تھی۔ وہ چیخنا چاہتا تھا لیکن چیخنے کے لیے آواز کی ضرورت تھی جو اس کے گلے میں کہیں گھٹ چکی تھی۔

''آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے، ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پاؤں ان کے اعمال کی گواہی دیں گے۔'' (یٰسین:65) اس کے لیے روزِ حساب کی ساری نشانیاں پوری ہو چکی تھیں۔ تب ہی اس نے ایک غراہٹ سنی۔ ایک بھیڑیا خون کی بو سونگھ کر اس کے جسم سے الگ ہونے والی ٹانگ کے پاس کھڑا تھا مگر وہ مردہ ٹانگ اسے شاید کچھ زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔ سیرا کی طرف تو اس نے دیکھا تک نہیں تھا۔

حلیل شامیر اشکول کی طرح اسے بھی زندہ انسانوں کا خون پینا اور گوشت کھانا پسند تھا اس لیے اب اس کا رخ اپنے ہم نوالہ و ہم پیالہ کی طرف تھا۔ جسم مختلف تھے مگر فطرت کے اعتبار سے وہ دونوں بھیڑیے تھے اور جانور کے جسم میں موجود بھیڑیا گرگ آشتی کا مظاہرہ کرنے لگا تھا۔ (سردی کے موسم میں جیسے ہی کوئی بھیڑیا بھوک سے نڈھال ہو کر گرتا ہے باقی بھیڑیے اسے کھا جاتے ہیں۔ فارسی میں اسے گرگ آشتی کہتے ہیں) اس نے سب سے پہلے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا انگوٹھا نوچا۔ حلیل شامیر اشکول کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکلی، وہ بھاگنا چاہتا تھا لیکن مکافاتِ عمل اس کے چاروں طرف دیوار بن کر کھڑا تھا۔ اسے شکایت کرنے کا حق نہیں تھا کیونکہ وہ یہ سب کچھ لاکھوں فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ تمام زندگی کرتا آیا تھا۔ بھیڑیا بہت مزے لے کر اور تھوڑا، تھوڑا کر کے اس کے جسم کو نوچ، نوچ کر کھا رہا تھا۔ وہ زندہ تھا اور اس کی چیخیں آسمان ہلا رہی تھیں مگر اس کی اذیت میں ڈوبی چیخیں جنگل میں کوئی سننے والا تھا اور نہ ہی آسمان پر۔ یہ زندگی، موت سے بدتر تھی اور نہ جانے اسے کب ختم ہونا تھا۔

''آج ہم تمہیں بھلائے دیتے ہیں جس طرح تم نے اپنے اس دن کی پیشی کو بھلا دیا تھا اور تمہارا ٹھکانا

دوزخ ہے اور تمہارے لیے کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔‘‘
(الجاثیہ 34)

☆☆☆

’’تم ذرا جلدی سے کچومر بنا دو۔‘‘

’’کس کا؟‘‘ ماہم جھٹکے سے مڑی اور بڑی حیرت سے خوش جمال سے پوچھا جو کچن کے دوسرے حصے میں کھڑی ملازم خواتین کو ہدایات دینے جا چکی تھی۔

’’ٹماٹر، پیاز کا اور کس کا۔‘‘ اس نے بھی حیرت کے ساتھ مڑ کر جواب دیا۔ ’’بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔‘‘

دوپہر کے کھانے کی تیاری زور و شور سے ہو رہی تھی، سرائے ملکی اور غیر ملکی خواتین سے بھرا ہوا تھا، کام کرنے والے جتنے ہاتھ بھی ہوتے کم تھا۔

’’نہیں...... کچومر تو...... میرا مطلب ہے انسانوں کا نہیں بنایا جاتا؟ ٹماٹر، پیاز کا تو میں پہلی دفعہ سن رہی ہوں۔‘‘ ماہم حیرت اور بیچارگی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ بولی اور اس کے ساتھ ہی خوش جمال پر جیسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔

’’تو تمہیں بھی میری طرح معلوم نہیں تھا کہ کچومر دراصل سلاد ہوتا ہے۔ ارے بھئی ٹماٹر، پیاز، دھنیا، ہری مرچ جو بالکل باریک کاٹ لیا جاتا ہے اور پھر سلاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو اسے کچومر کہتے ہیں۔ مجھے بھی ہاسٹل میں ایک لڑکی نے بتایا تھا ورنہ میں بھی تمہاری طرح ٹماٹر، پیاز کے بجائے ہمیشہ انسانوں کا ہی کچومر بناتی۔‘‘ وہ اپنی اور ماہم کی لاعلمی کا مزہ لے رہی تھی۔

’’لاؤ میں تمہاری مدد کروا دوں۔‘‘ وہ دوسری چھری لہراتی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

تبھی ماہم کی نظر کھڑکی سے باہر گئی جہاں موسم اور نظارہ قیامت کا ہو رہا تھا۔ بادل اتنے جھکے ہوئے تھے جیسے جھیل کے پانی میں اتر آئے ہوں۔ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ پانی کہاں ہے اور بادل کہاں۔

’’ویسے شادی کے بعد تمہیں سیر کرنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ وہ حسب ہدایت کچومر بناتے ہوئے بولی۔ ’’تمہارا یہ خطہ جنت نظیر ہے۔‘‘

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

جولائی کے دلکش شمارے
کی سحر آمیز جولانیاں

اولین سوغات
سچ بولنے کی جرأت رکھنے والے مسافر کی دل دوز مسافت۔ اس کے اطراف سیاست اور غفلت کا راج تھا۔ انتقام کے شعلوں میں گھری داستان
احمد سلیم سلیمی کے قلم سے

سربکف
ماضی کی دھندلی پرچھائیوں کے تعاقب میں دوڑتے بھاگتے کردار کی پُراسرار داستان......
طاہر جاوید مغل کے قلم سے

دہر
قدم قدم پر بڑھتی مصیبتوں کا مقابلہ کرنے والے ایک دلیر نوجوان کی کوچہ گردی
حسام بٹ کے قلم سے سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

پہلا رنگ
بدقسمتی سے ایک گھناؤنی سازش کا شکار ہو جانے والے بے گناہ کی بے بسی
عبدالرب بھٹی کی تیکھی کہانی

دوسرا رنگ
موسموں کی طرح رنگ بدلتے دشمن کی سفاک ترین سازشوں کا احوال زویا صفوان کے قلم سے

چینی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

’’ہاں وہ جنت جو عنقریب گم گشتہ ہونے کو ہے۔‘‘ خوش جمال پیاز کا چھلکا اتارتے ہوئے افسردگی سے بولی۔

’’کیا مطلب؟ میں سمجھی نہیں۔‘‘ ماہم نے آنکھ میں آئے آنسو صاف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

’’سال پہلے سرائے میں کچھ ترک خواتین اس علاقے کی سیر کرنے کے لیے آئی تھیں۔‘‘ خوش جمال سلیب کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔

’’چونکہ انہیں اردو آتی تھی نہ انگریزی اس لیے انہوں نے مجھے گائڈ کے طور پر ساتھ چلنے کو کہا۔ اتفاق سے مجھے ترک زبان آتی ہے کیونکہ یونیورسٹی کے زمانے میں، میں نے نمل (یونیورسٹی) سے ترک زبان کا کورس کیا تھا سو میں ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ وہ کچھ ایسی جگہوں پر بھی جانا چاہتی تھیں جس کے بارے میں انہوں نے کتابوں میں پڑھا تھا یا لوگوں سے سنا تھا لیکن میں بھی ان جگہوں پر کبھی گئی نہیں تھی اس لیے میرا بھی یہ پہلا تجربہ تھا۔ انہوں نے نلتر جھیلوں کی بہت تعریف سنی تھی لہٰذا سب سے پہلے ہم وہاں گئے۔ لوئر سے ڈیڑھ دو گھنٹے کے مشکل سفر کے بعد سترنگی جھیل آتی ہے جس کے بارے میں معروف سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ نے اپنی کتاب میں کچھ یوں لکھا ہے۔

’’میں ایک اور دنیا میں چلا گیا۔ سویر کی ہلکی دھوپ میں نلتر جھیلوں کے پانی تھے جن میں، میں چلا گیا ہوں۔ وہ دکھائی ہی نہیں دیتے تھے، اتنے شفاف تھے۔ یہ آبی جادوگری کا ایک شہر تھا جس میں سب کچھ دکھائی دیتا تھا۔ پانی کے سوا ہر شے دکھائی دیتی تھی۔ شیشے کا ایک شہر تھا اور دکھائی نہیں دیتا تھا، اتنا شفاف تھا۔ یہ اس ساحر کے سحر سے وجود میں آیا تھا اور میں آنکھیں نہیں جھپکتا تھا کہ مجھے ڈر تھا کہ میری پلکوں کی زد میں آیا تو یہ گیا...... کرچی، کرچی ہوا‘‘ میں اس طرح حسنِ ہوشربا میں داخل ہوگیا ہوں اور اب آنکھ نہیں جھپکتا کہ یہ ٹوٹ نہ جائے۔

’’یہ پانی نہیں تھا شیشہ گری کا شفاف کام تھا جس کی تہ میں پڑے برچ کے درختوں کے سفید تنے زندہ لگتے تھے۔ اس میں سبز کائی کے پھریرے ہولے، ہولے سرسراتے تھے کہ تہ میں سے پھوٹنے والے چشموں کی زد میں آتے تھے اور ہولے، ہولے سرسراتے تھے۔ جہاں کہیں کوئی چشمہ پھوٹتا تھا وہاں وہ شیشۂ آب میں ایک گل رنگ انار کی طرح پھوٹتا تھا۔ رنگوں کی پچکاریاں اس شیشے کے شفاف بدن میں شب برات کرتی، چشموں کی نیلاہٹ کے نیل شیشہ پانیوں میں دھیرے، دھیرے سرگوشیاں کرتے تھے اور سب کچھ دکھائی دیتا تھا سوائے پانیوں کے جن کی شفافی انہیں شیشہ کرتی تھی۔ ٹیڑھے میڑھے کناروں پر گھاس کے کناروں پر کہیں برچ کے درخت پانیوں میں اوندھے پڑے تھے اور کہیں ان پر جھکے ہوئے تھے۔ یہ ایک جہانِ شیشہ گری تھا۔ میں سانس بھی آہستہ لیتا تھا کہ نازک ہے، بہت کام۔ میں نے زندگی بھر ایسے طلسم خیز ستھرے اور آرپار شفاف پانی (کے ذخیرے) کہیں نہیں دیکھے تھے۔‘‘

’’انہوں نے اس حسن کی دیوانگی میں اور بھی بہت کچھ لکھا ہے۔‘‘ خوش جمال جیسے خود بھی ان منظروں میں کھوئی ہوئی بولی۔ ’’دراصل یہ جھیلیں اس قدر حسین ہیں کہ انسان کچھ دیر کے لیے سوچنا سمجھنا بھول جاتا ہے۔ ایسا حسن ہے جو انسان کی عقل کو سلب کر دیتا ہے لیکن......‘‘ خوش جمال نے [illegible] جلتی ٹھنڈی سانس بھری۔

’’مستنصر حسین تارڑ کے حصے میں یہ جھیلیں اس شکل میں آئیں لیکن میری قسمت میں یہ لکھا تھا کہ میں ان جھیلوں کو اجڑی ہوئی شکل میں دیکھوں، ان کے اجڑنے پر خود بھی آنسو بہاؤں اور ان کی داستان اور ان کی فریاد دنیا کو بھی سناؤں۔ میں نے جس جھیل میں جھانکا شاپروں، ریپروں اور بوتلوں نے میرا منہ چڑایا، میری نظر انہی میں الجھ کر رہ گئی۔ اس سے آگے جو بچا کھچا حسن تھا اس تک جا ہی نہیں سکی۔‘‘ یہ کہتے ہوئے خوش جمال کے چہرے پر ایک ناقابلِ بیان قسم کی اذیت تھی۔

’’جس وقت ہم ان جھیلوں پر پہنچے وہاں پر بے شمار لوگ موجود تھے اور ان میں سے اکثریت کا تعلق اس شہر سے تھا جس کے بارے میں وہ کہتے نہیں تھکتے کہ جس نے یہ شہر نہیں دیکھا وہ پیدا نہیں ہوا۔ کسی بھی قوم، کسی بھی

digest library.com

علاقے میں سارے لوگ برے نہیں ہوتے لیکن بدقسمتی سے میں نے وہاں جن لوگوں کو دیکھا وہ جہالت اور بداخلاقی اور بدذوقی کی انتہا پر کھڑے تھے۔ چیختی چلاتی کائنات کی وسعتوں میں باقاعدہ سوراخ کرتی بیہودہ اور بھونڈی موسیقی نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ میں نے ایک شخص کو باقاعدہ یہ کہتے سنا کہ اس علاقے کو پتا چلنا چاہیے کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں حالانکہ یہ بات کہنے اور بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان تاتاریوں کے طور طریقوں سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ یہ تو وہ جگہ ہے جہاں پر انسان اس سجھ میں نہ آنے والے حسن اور آنکھیں خیرہ کردینے والی خوب صورتی کو، پیدا کرنے والے کو سجدہ کرتے نہیں تھکتا۔ تاتاریوں کی باقیات کے ہاتھوں زوال کا شکار اس حسن کے سامنے اگر خاموشی اختیار کی جاتی تو ان نظاروں کا حسن بولتا۔ وہاں پہاڑوں سے تسلسل ایسی آواز آتی ہے جیسے وہ سب اللہ کی حمد وثنا میں مصروف ہوں مگر ”نچ پنجابن نچ“ کے غلیظ ترین آوازے میں کچھ اور سنائی نہیں دے رہا تھا۔“ ماہم نے بہت افسوس کے عالم میں خوش جمال کو دیکھا۔ وہ اس زمین کی بیٹی کا دکھ بانٹنا چاہتی تھی مگر اسے ایک بھی لفظ نہیں ملا تھا۔

”بلتستان عنقریب شاپرستان، ریپرستان اور پمپرستان بننے کو ہے۔ اسلام آباد اپنے حسن اور خوب صورتی میں کسی طرح بلتستان سے کم نہیں تھا مگر آج اس کے ندی نالوں کے پاس سے ناک کو چٹکی میں دبا کر گزرنا پڑتا ہے۔ عنقریب بلتستان میں بھی یہی کچھ ہونے والا ہے۔“ خوش جمال کی پیشگوئیاں ہولناک تھیں مگر بدقسمتی سے سب درست تھیں۔

”جب سڑکیں نہیں بنی تھیں تو یہ حسن صرف ان لوگوں کے لیے محفوظ تھا جو اس کی قدر جانتے تھے اور مشقت کرکے یہاں پہنچتے تھے مگر اب بسوں میں بھر بھر کر طرح، طرح کے جاہل، ظالم اور بدبخت یہاں پہنچ رہے ہیں اور ان علاقوں کے حسن اور خوب صورتی کے ساتھ وہ سلوک کررہے ہیں جو شاید تاتاریوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ نہیں کیا ہوگا۔ ہم بہت مہمان نواز لوگ ہیں، ہمارے لیے اس علاقے میں آنے والا ہر شخص عید کا چاند ہے۔ حسینی پل کی طرف جاتے ہوئے راستے میں بہت ساری دکانیں آتی ہیں، ان میں سے کھانے پینے کی ایک دکان ایک خاتون چلارہی ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ان کی دکان پر ایک سیاح عورت آئی، اسے چیزیں مہنگی لگیں اور وہ نہیں لے سکی لیکن دکان کی مالکن نے اس عورت کو مفت میں وہ چیز دے دی جو وہ لینے آئی تھی اور یہ بھی کہا کہ کوئی میرے پاس آئے اور بغیر کچھ لیے چلا جائے یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ تو ہم تو اس طرح کے لوگ ہیں لیکن بھانت، بھانت کے آنے والوں کو اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ وہ جن کے گھر جارہے ہیں ان کے گھر میں رہنے کے کچھ آداب کا خیال کرلیں۔ میں جب شاپر، ریپر، پمپر یہاں، وہاں پڑے ہوئے دیکھتی ہوں میرا دل کٹ جاتا ہے، میں اپنے گھر کی یہ بربادی نہیں دیکھ سکتی۔ کبھی، کبھی میرا دل چاہتا ہے میں یہاں سے دور بھاگ جاؤں۔“

وہ دونوں کچومر بنانا کب کا بھول چکی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے پہلے جو آنسو پیاز کی وجہ سے نکلے تھے اب ان حسین مگر بےبس وادیوں کے دکھ میں نکل رہے تھے۔

”یہ جگہیں تو اس قدر حسین ہیں کہ جو یہاں ایک تنکا بھی گرائے جرمانے میں اس کی جائداد بھی لکھوالی جائے تو بھی کم ہے۔ اب یہاں لوگوں میں بھی لالچ بڑھ گیا ہے۔ جا بجا سیمنٹ اور کنکریٹ کی بے ڈھنگی، بدصورت عمارتیں کھڑی کی جارہی ہیں جو نہ ماحول سے مطابقت رکھتی ہیں نہ ہی علاقے سے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کسی حسین ترین چہرے پر چیچک نکل آئے۔ کوئی انہیں روکنے والا نہیں، ہر کوئی اپنی مرضی چلارہا ہے، ہر قابلِ ذکر حسین جگہ ڈھابے، دکانیں اور بدشکل ہوٹل کھڑے ہیں جو ان جگہوں کا حسن نگل گئے۔ ان ہوٹلوں اور دکانوں کے ہجوم میں یہ جگہیں دکھائی نہیں دیتیں، ڈھونڈنی پڑتی ہیں اور جب مل جاتی ہیں تو پھر جگہ، جگہ پڑے ہوئے ریپر، شاپر اور پیمپر دل چیر دیتے ہیں پھر ان ہوٹلوں کی تعمیر کے دوران لکڑی کی ضرورت پورا کرنے کے لیے

درختوں کا بے دریغ قتلِ عام ہو رہا ہے۔ وہ وادیاں جہاں قدم، قدم پر درخت ہوتے تھے اب یوں لگتا ہے جیسے۔۔۔ بے لباس پڑی ہوں۔ میں نے دیکھا تو نہیں لیکن مجھے یقین ہے ان ہوٹلوں کے گٹروں کے تمام پائپ ان دریاؤں اور ندی نالوں میں ڈالے گئے ہوں گے۔ جو حال اسلام آباد کے خوب صورت ندی، نالوں کا اور کراچی کے سمندر کا ہوا وہی ان کا بھی ہوگا۔ ناران تو برباد ہو چکا ہے، اس کی ٹھنڈے، خوشگوار پانی کی چھوٹی، چھوٹی ندیاں اور نالیاں جو پوری وادی میں بہا کرتی تھی اب ان کے راستے میں کوڑے کی دیواریں کھڑی ہیں، وہ ندیاں، وہ نالیاں سوکھ چکی ہیں۔ تازہ اور ٹھنڈے پانی کا ایک نالہ ناران قصبے کے اندر سے بہتا تھا شہر کی غلاظت کی وجہ سے وہ پانی اب سیاہ ہو چکا ہے، اگلی باری ملتستان کی ہے۔''

''مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ حکومت اس حوالے سے کچھ کرتی کیوں نہیں ہے؟'' ماہم نے بڑی معصومیت سے سوال پوچھا۔

''کیونکہ یہ حکومت کے کرنے کا کام نہیں ہے۔'' خوش جمال نے بیزاری سے ناک چڑھائی۔ ''کوئی بھی کام حکومت کے کرنے کا نہیں ہے۔'' اس نے گویا پوری قوم کی طرف سے اجتماعی ناراضی کا اظہار کیا۔

''لوگ یہاں آتے ہیں، لطف اٹھاتے ہیں اور پھر اپنی غلیظ نشانیاں چھوڑ کر واپس چلے جاتے ہیں۔'' خوش جمال کی داستانِ غم بہت لمبی تھی لیکن خواتین نے دوپہر کے کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں آنا شروع کر دیا تھا اس لیے انہیں کام کی طرف توجہ دینی پڑی۔

☆☆☆

''ہم واپس پاکستان جا رہے ہیں۔'' آپی نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ اعلان کیا۔ وہ فیصلہ جو برسوں سے نہیں ہو پایا تھا جب ہوا تو اچانک ہو گیا۔ عالیہ کی بیٹی ابھی تک واپس نہیں آسکی تھی، صرف اس کے ماں، باپ ہی انگاروں پر زندگی نہیں گزار رہے تھے بلکہ ان کے تمام دوست، رشتے دار بھی اسی اذیت کا شکار تھے۔ ہر کوئی عالیہ کی بیٹی میں اپنی بیٹی کو دیکھ رہا تھا، سب کو اپنے بچوں کی بھی فکر کھائے جا رہی تھی۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ جیسے کسی کی اولاد اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ حکومت جب چاہے صحیح یا غلط اطلاع پر اپنی ہی عوام کے بچوں کی اغوا کار بن سکتی ہے۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم واپس پاکستان چلے جائیں گے۔'' حماد نے کئی دنوں کی خاموشی کے بعد وہ بات کہہ دی جو انہیں بہت پہلے کہنی چاہیے تھی۔ وہ ابھی، ابھی کہیں باہر سے واپس آئے تھے۔ دونوں میاں، بیوی اس وقت اپنے وسیع گھر کے جنگل نما لان میں بیٹھے ہوئے تھے اور بچے سامنے ہی کھیل رہے تھے۔

''آپ نے اچھا فیصلہ کیا۔'' مریم، شوہر کی بات سن کر بولیں۔ ''لیکن کیا اس فیصلے کی وجہ عالیہ کی بیٹی ہے؟''

''ہاں، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نہیں چاہتا کل میری اولاد جسمانی یا نظریاتی طور پر اغوا ہو جائے اور میں بے بس ہاتھ ملتا رہوں۔''

''اور کیا کوئی دوسری وجہ بھی ہے اس فیصلے کی؟'' مریم نے دیکھ لیا تھا کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتے ہیں۔ تب انہوں نے ایک میگزین بیوی کی طرف بڑھایا۔ یہ دنیا کے مختلف ممالک میں چھپنے والا تحقیقاتی اور تجزیاتی عرب میگزین تھا جس کی رپورٹس نہایت مستند ہوتی تھیں۔ مریم نے اسے کھول کر دیکھا، اس میگزین کا ایک صفحہ مڑا ہوا تھا۔ اس صفحے پر ایک مضمون تھا جس کا موضوع تھا۔

''دو نسلوں کے بعد خاندانوں کا مذہب''

مضمون کے مطابق یورپ، امریکا اور کینیڈا آ کر بسنے والے 20 مسلمان خاندانوں پر تحقیق کی گئی تھی جن کے بڑے اسی، نوے سال پہلے اپنے آبائی وطن چھوڑ کر ان ملکوں میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ان خاندانوں کی اب تیسری نسل یہاں آباد تھی اور سانحہ یہ تھا کہ اس تیسری نسل کی اکثریت اسلام چھوڑ چکی تھی۔ کچھ نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور کچھ بے دین ہو چکے تھے اور اگر کوئی نام نہاد مسلمان تھا بھی تو وہ کافر سے بدتر تھا۔

ان خاندانوں میں سے ایک خاندان کا بزرگ جو یورپ میں آ کر آباد ہوا تھا وہ ایک بہت بڑا عالم تھا اور یورپ آنے کا مقصد اسلام کی تبلیغ تھا لیکن بدقسمتی سے اسی عالم کی تیسری نسل میں سے بیشتر لوگ سرے سے اسلام

digest.library.com

سے ناواقف تھے۔

مریم آپی نے ٹھنڈی سانس بھر کر میگزین بند کر دیا۔ ان کے چہرے پر سراسیمگی تھی اور نظریں اپنی اولاد پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ سوچ کر ان کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا کہ ان کی اولاد یا پھر ان کی اولاد کی اولاد ایمان سے محروم ہوگی، مذہب بدل لے گی یا بے دین ہوجائے گی۔ اگر ایسا ہوا تو اس کا ذمے دار کون ہوگا۔ یقیناً ان کے ماں، باپ جنہوں نے صرف اپنے نفس کو خوش رکھنے کے لیے جانتے بوجھتے ہوئے دارالسلام پر دارالکفر کو ترجیح دی۔

ہم ''واپستانی'' ہوں گے۔'' وہ اچانک ہی بہت جوش سے بولیں۔ ''مجھے خوشی ہے کہ آپ نے بروقت درست فیصلہ کیا۔ ہماری زندگی تو جیسی بھی تھی گزر گئی لیکن اب ہماری اولاد کی زندگی، ان کا ایمان زیادہ ضروری ہے اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں اس فتنے سے بچائیں جس میں پورا مغرب مبتلا ہے۔ حدیث کے مطابق قیامت کے دن انسان تب تک ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکے گا جب تک کہ وہ اپنی عمر، صحت، وقت اور علم کا حساب نہ دے لے کہ ان نعمتوں کو کہاں خرچ کیا اور ہم کیا بتائیں گے کہ ہم نے اپنی جوانی، اپنی صحت، اپنی قابلیت اور اپنی پوری زندگی سب کچھ غیروں کی خدمت میں لگادی، اپنی صلاحیتیں اپنے ہی خلاف استعمال ہونے کے لیے دشمن کے حوالے کردیں۔'' آپی بہت تاسف سے کہہ رہی تھیں۔

''ہمارے پاس اب جو کچھ بھی ہے وہ ہم پاکستان کو دیں گے۔'' حماد مضبوط لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ''پاکستان کو ہم وہ ملک بنائیں گے جس کی خواہش میں ہم غیروں کے دروازوں پر جاکر دوسرے درجے کی زندگی گزارتے ہیں۔''

''ان شاء اللہ!'' آپی نے پورے جوش کے ساتھ شوہر کی تائید کی۔

فیصلہ تو ہوچکا تھا۔ انہوں نے پشت پر موجود پُرآسائش اور خوب صورت دومنزلہ گھر پر نظر ڈالی اور پھر اس کے چاروں طرف پھیلے اس جنگل نما لان کو دیکھا۔ ہر چیز دل کھینچتی تھی، راستہ روکتی تھی۔

☆☆☆

''آپی مجھے تھوڑی سی کافی بنادیں۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر دباتے ہوئے بولا۔

''گمبھیر خاموشی توڑنے کا شکریہ۔'' وہ اس کی بات سن کر بولیں۔ آج کچھ ایسا تھا جو عجیب تھا۔ نہ اتنی دیر تک وہ کبھی خاموش بیٹھا تھا اور نہ کبھی اس نے اپنے کام کے لیے کسی اور سے کہا تھا مگر آج وہ بہت دیر سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ مسلسل خاموش بیٹھا تھا۔ نظریں ایک نقطے پر جمائے، کسی گہری سوچ میں گم۔

آج وہ جب آیا تھا تو اس کے چہرے پر ایک انوکھی چمک تھی، خوشی کی چمک۔ کچھ سوچتا ہوا اور کچھ یاد کر کے مسکراتا ہوا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم کچھ بتانا چاہ رہے ہو؟'' آپی نے اسے مسکراتے دیکھ کر شرارت سے پوچھا۔

''بتاؤں گا، ضرور بتاؤں گا مگر ابھی نہیں۔'' وہ صاف چھپا گیا۔

اور اب جیسے اس کی خوشی، اس کی مسکراہٹ کو کسی کی نظر لگ گئی تھی۔

''سر میں درد ہے کیا؟'' انہوں نے قریب آکر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ''کیا حال کرلیا ہے تم نے اپنے بالوں کا، میں تیل نہ لگاؤں تو تم کبھی نہیں لگاتے۔'' ان کی ڈانٹ میں بھی پیار شامل تھا مگر اس نے کوئی خاص ردعمل ظاہر نہیں کیا اور یہ بات بھی بڑی عجیب تھی۔

''اب بتاؤ کیا ہوا ہے؟'' تھوڑی دیر بعد وہ کافی لیے اس کے سامنے آبیٹھی تھیں۔

''کچھ نہیں، بس وہ مرگئی۔'' وہ مسلسل کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے بولا۔

''کون...... کس کی بات کررہے ہو؟'' آپی کے لہجے میں تشویش تھی، کچھ اس کی حالت بھی ان کی پریشانی میں اضافہ کررہی تھی۔ یقیناً کوئی بڑی بات ہوگی۔

''لارین...... مجھے ہمیشہ سے لارین کے لیے

خوف تھا، وہ مگر مچھ کے منہ میں زندگی گزار رہی تھی، وہ ایک مجرم کے ساتھ رہ رہی تھی۔ میں نے ہر طرح سے کوشش کی کہ اس کی حفاظت میں کوئی کمی نہ آنے پائے...... مگر سیرا...... سیرا کا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایک دن چپ چاپ چلی جائے گی اور اس کے جانے کا دکھ دل میں اتر جائے گا۔'' وہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس کا لہجہ اس کے گہرے دکھ کا پتا دے رہا تھا۔

پھر اس کے منہ سے سن کر بھی آپی کو بہت دیر تک یقین نہیں آیا تھا کہ وہ زندہ دل، ہنستی، کھلکھلاتی سیرافینا حلیل ...... اب دنیا میں نہیں رہی۔

''اسے کیا ہوا؟'' وہ حیرت اور دکھ کے عالم میں بس اتنا ہی کہہ سکیں۔

''دو دن پہلے اس کے جہاز کو حادثہ پیش آ گیا۔'' ایسا لگ رہا تھا وہ آپی سے نہیں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

''تمہیں اس کی موت کا دکھ ہے یا اس میں کوئی پچھتاوا بھی شامل ہے؟'' انہوں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''دکھ ہے اور بہت گہرا دکھ ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا وہ اتنی جلدی چلی جائے گی۔ میں نے اس کو ہمیشہ نظر انداز کیا، تکلیف پہنچائی، صرف اس لیے کہ میری ذرا سی حوصلہ افزائی اسے بہت ساری امیدیں دلائے گی۔ وہ امیدیں جن پر میں پورا نہیں اتر سکتا اسی لیے میرا رویہ اس کے ساتھ ہمیشہ برا رہا۔ اس کی محبتوں، وارفتگیوں، قربانیوں کے جواب میں میرے پاس صرف تلخ جملے اور سخت لہجہ تھا حالانکہ وہ شاید ایک عرصے سے اپنے لیے جینا چھوڑ چکی تھی۔''

''لیکن میرا تو خیال ہے تمہارا تو اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ زندگی اس کی اتنی ہی تھی اور ماضی کے تلخ تجربوں نے تمہیں یہی سکھایا کہ اجنبی لڑکیوں کے معاملے میں محتاط رہنا ہی بہتر ہے۔ یاد ہے دو سال پہلے پاکستان میں تمہارے اچھے رویّے کا غلط مطلب لے کر خاندان کی لڑکیوں اور ان کی ماؤں نے کتنی غلط امیدیں لگالی تھیں اور اس بات پر پورے خاندان میں جھگڑا بھی ہوا تھا کیونکہ ان میں سے ہر لڑکی کے ماں، باپ اپنے تئیں اپنی بیٹی کا رشتہ تمہارے ساتھ طے کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔''

''جانتا ہوں۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''اور جب لوگوں کی امیدیں پوری نہیں ہوئیں تو وہ الزام تراشی پر اتر آئے تھے مگر سیرافینا حلیل......'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ''سیرافینا حلیل میری زندگی سے، اس دنیا سے جانے کے بعد بھی میرے آس پاس ہی رہ گئی ہے۔ بقول اس کے وہ صرف میری خاطر زندہ تھی، اس نے ہر وہ کام کیا جو اس کے خیال میں مجھے خوش کر سکتا تھا۔ میری زبان سیکھنے سے لے کر میرا دین قبول کرنے تک...... اس نے کہیں ہمت نہیں ہاری کہیں رکی نہ کہیں تھکی۔ خود تو چلی گئی مگر میرے لیے ایک یاد، ایک کسک بن کر رہ گئی۔'' اس کا موبائل بج رہا تھا، اسے اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس نے کچھ دیر تک دوسری طرف موجود شخص کی بات سنی اور پھر خاموشی سے موبائل ایک طرف رکھ دیا۔

''کیا ہوا، کس کا فون تھا، کیا سیرا کی کوئی خبر تھی؟'' آپی نے بڑے تجسس سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''کیا وہ زندہ ہے؟'' اس کے جواب میں آپی نے بڑی بے تابی سے سوال کیا۔

''نہیں، اس کا وکیل تھا اور بتا رہا تھا کہ سیرا کے نام جو کچھ تھا اس نے وہ سب اپنی زندگی میں ہی میرے نام کر دیا تھا، اسی سلسلے میں وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔''

''لیکن تم اس کا مال مت لینا۔'' آپی نے سنتے ہی کہا۔

''کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ بہت تھکے ہوئے لہجے میں بولا جیسے دل کا بوجھ مزید بڑھ گیا ہو۔ ''میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا ہوں، اس کے مال پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔''

''پھر تم اس کا کیا کرو گے، کیا واپس کر دو گے؟''

''نہیں، یہ مال وہیں جائے گا جہاں سے لوٹا گیا تھا یعنی فلسطین۔'' وہ پہلے کی نسبت مضبوط لہجے میں بولا۔

"خلیل شامیر اشکول نے فلسطینیوں کو زبردستی بے گھر کر کے ان کے گھروں اور زمینوں پر قبضہ کر کے یہ مال کمایا تھا۔ اس پر فلسطینیوں کا حق ہے اور یہ انہی کو ملنا چاہیے۔ میں اسے حارث نضال کے حوالے کر دوں گا اور شاید سیرا بھی یہی چاہتی تھی۔" وہ ایک بار پھر کسی گہری سوچ میں گم ہو چکا تھا، خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سیرا کی ہنستی مسکراتی تصویر تھی اور اس تصویر پر دل ہی دل میں بہنے والے فرات کے آنسو تھے۔

تم کو جہانِ شوق و تمنا میں کیا ملا
ہم بھی ملے تو درہم و برہم ملے تمہیں

☆☆☆

اس نے دور سے دیکھا، وہ جھیل میں سے نکلنے والی ایک ندی کے کنارے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں ندی کے ٹھنڈے پانی میں ڈال رکھے تھے اور انہیں آہستہ، آہستہ آگے پیچھے ہلا رہی تھی جیسے کوئی چھوٹی سی بچی پانی سے کھیل رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں پر کوئی گیت تھا جس کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ پائی۔ بادل جھیل پر یوں جھکے ہوئے تھے جیسے جھیل کے شفاف پانیوں میں اپنا عکس دیکھنے آئے ہوں، کنارے پر گلابی پھولوں والا ایک درخت تنہا کھڑا تھا، جو پورے منظر کا سب سے حسین حصہ لگ رہا تھا۔

وہ کسی انجانی کیفیت میں چلتا اس کے قریب آ گیا۔ ہلکے سبز رنگ کا لباس پہنے پانیوں میں آہستہ، آہستہ پاؤں چلاتی، گنگناتی کسی اور دنیا کی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کہیں سے آتی نرم اور خوشگوار دھوپ کا عکس تھا، وادی کے سارے رنگ اس کے چہرے کے رنگ میں گھلے ہوئے تھے۔

اس لڑکی کے ساتھ زندگی کتنی خوب صورت ہوتی اگر ان کے بیچ ماضی حائل نہ ہوتا۔ اسے اپنے رویّے کی بدصورتی کا کبھی، کبھی بہت زیادہ احساس ہوتا تھا۔ وہ اس کی طرف آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر پاؤں میں پڑی زنجیر اسے روک لیتی، اسے احساس دلاتی کہ نئے رشتے بنانے کے لیے دل کا صاف اور شفاف ہونا بہت ضروری ہے مگر اس کا بوجھ تلے دبا دل کسی نئے رشتے کے قابل بھی نہیں رہا تھا۔ اسے پرانی زنجیروں نے یوں جکڑا تھا کہ اسے ہر لمحہ اپنا آپ کسی قید میں محسوس ہوتا تھا۔

کتنی دیواروں کے سائے ہاتھ پھیلاتے رہے
عشق نے لیکن ہمیں بے خانماں رہنے دیا

☆☆☆

دنیا کی چھت سمجھے جانے والے شندور میں پولو میلے کا آغاز ہو چکا تھا جو شندور ضلع غذر گلگت میں 7 سے 9 جولائی کو ہوتا ہے اور کم و بیش ایک صدی سے یہ میلا اسی طرح ہو رہا تھا۔ آس پاس نیلے پہاڑ چوٹیوں پر برف کا تاج پہنے میدان کے چاروں طرف موجود تھے، کچھ فاصلے پر نیلے پانیوں کی ایک جھیل بھی تھی جس میں یقیناً یہ پہاڑ اپنا عکس دیکھتے ہوں گے اور اپنی قسمت پر رشک کرتے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کس قدر حسین جگہ پر پیدا کیا تھا۔ عالی بخت میلے کے دوران ہونے والے پولو میچ کا ایک ضروری حصہ تھا۔ وہ گلگت کی ٹیم کی طرف سے کھیل رہا تھا۔

کچھ ہی دن پہلے خوش جمال کی شادی بہت سادگی سے انجام پائی تھی۔ نہ بازاروں کے چکر، نہ کوئی دھوم دھڑکا اور نہ ہی کوئی ہنگامہ۔ دراصل خوش جمال کی شخصیت خود اتنی بھرپور اور مکمل تھی کہ اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس دوران عالی بخت نے سرائے کے تمام انتظامات سنبھال لیے تھے بلکہ شادی کے دن بھی مور کے سفید پر والی مقامی ٹوپی پہنے وہ انتظامات میں مصروف رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر کسی کے ساتھ اس کا تعلق اور جان پہچان ہو اور جیسے وہ ہمیشہ سے یہیں رہ رہا ہو۔ جمال صاحب جب بھی اس پر نظر ڈالتے اس میں اس کے لیے محبت اور تشکر کے جذبات ہوتے۔ اس نے اپنے آپ کو ان کا بیٹا کہا نہیں تھا بلکہ ثابت بھی کیا تھا۔

اور آج وسط ایشیا کے مشہور ترین کھیل کا میدان سج چکا تھا، لوگوں کا جوش و خروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ پاکستانیوں کے علاوہ دنیا بھر سے پولو کے شوقین یہاں جمع

digestlibrary.com

ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ خوش جمال کی سرائے پولو دیکھنے کی شوقین خواتین سے بھری ہوئی تھی۔ میدان کے دونوں طرف مہمانوں اور تماشائیوں کے بیٹھنے کے لیے سیڑھیوں کی شکل کی اونچی، اونچی نشستیں بنی ہوئی تھیں جو اس وقت مقامی، غیر مقامی اور دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاحوں سے پُر تھیں۔

پورے علاقے میں مشہور تھا کہ دنیا میں دو چیزوں کے لیے کوئی اصول نہیں...... جنگ اور پولو۔ میچ کے دن کھلاڑی اور گھوڑے تیار ہو رہے تھے، کھلاڑیوں کے ساتھ، ساتھ ان کی تیاری بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی، گھوڑوں کے جسموں کی صفائی ہو رہی تھی، انہیں دانہ ڈالا جا رہا تھا، ان کی ٹانگوں پر کپڑا باندھا جا رہا تھا اور ان کی دموں کی بڑے پیار سے چٹیاں بنائی جا رہی تھیں، زین کسی جا رہی تھی، کھلاڑی بھی اس معرکے کے لیے تیار ہو رہے تھے جس کے لیے وہ کئی مہینوں سے تیاری کر رہے تھے۔

پولو کا میدان 3700 میٹر سطحِ سمندر سے بلند ہے جس کے اردگرد کوہِ ہندوکش کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ یہاں پر فری اسٹائل پولو کھیلی جاتی ہے یعنی ہیلمٹ اور اصولوں کے بغیر۔ مقامی لوگوں کے مطابق یہی چوگان کی اصل شکل ہے۔ یہاں کھیلے جانے والے کھیل میں امپائر نہیں ہوتے، کھیل کے دوران کئی کھلاڑی بری طرح زخمی بھی ہوتے ہیں مگر یہ جواں مردوں کا کھیل تھا اور اسے اسی طرح خطروں سے کھیلتے ہوئے کھیلا جاتا تھا۔ انہی جواں مردوں میں سے ایک عالی بخت بھی تھا جو اس سے پہلے بھی اس مقابلے میں حصہ لے چکا تھا۔

ابتدائی طور پر گلگت اور چترال کی ٹیموں میں شندور میلے سے پہلے کئی مقابلے ہوتے ہیں، ان مقابلوں کے دوران مقامی جرگے کے ذریعے بہترین گھوڑے اور کھلاڑی چنے جاتے ہیں۔ بہت ساری مقامی ٹیمیں کھیل میں حصہ لیتی ہیں لیکن اصل مقابلہ گلگت اور چترال کی ٹیموں کے درمیان ہوتا ہے۔ چترال کی ٹیم سرخ قمیص میں جبکہ گلگت کی ٹیم نیلی قمیص میں ملبوس تھی، دونوں ٹیمیں شاندار گھوڑوں پر سوار ہاتھوں میں لکڑی کی لمبی چھڑیاں پکڑے مقابلے کے لیے تیار تھیں۔

کھیل کے میدان سے پہلے جگہ، جگہ عارضی اور رنگ برنگے خیمے لگے ہوئے تھے جہاں پر اس کھیل کے شوقین، انتظامیہ اور کھلاڑی رہ رہے تھے۔ سردی بہت تھی، میدان بہت کھلا اور وسیع تھا اسی لیے ہوا بھی خوب تیز چل رہی تھی۔ ہوا کے زور پر تمام خیمے پھڑ پھڑا رہے تھے اور سردی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود جگہ، جگہ مختلف اشیا اور کھانے پینے کی چیزوں کے اسٹال لگے ہوئے تھے۔ کسی جگہ خواتین کی روایتی ٹوپیاں بک رہی تھیں تو کہیں بریانی کا اسٹال لگا ہوا تھا، تندور پر روٹیاں بھی پک رہی تھیں، گائے کے ہم شکل یاک بھی موجود تھے، تازہ گوشت بھی بک رہا تھا۔ ایک بچہ تازہ آلو بخارے بیچ رہا تھا، کچھ لوگ روایتی لباس پہنے اور ہاتھوں میں تلواریں اٹھائے رقص کر رہے تھے۔

کھیل سے پہلے قومی ترانہ ہوا۔ مہمانِ خصوصی نے گیند میدان میں پھینک کر کھیل کا آغاز کیا۔ تماشائیوں کے درمیان ماہم بھی موجود تھی۔

''وہاں سردی بہت ہوتی ہے اور خیمے میں رہنا پڑے گا، آپ کو مشکل نہیں ہوگی؟'' یہاں آنے سے پہلے عالی بخت نے اسے ڈرانے کی پوری کوشش کی مگر ایک تو میلا دیکھنے کا شوق اور دوسرے عالی بخت کو کھیلتے ہوئے دیکھنے کا لطف سردی کے ڈر پر غالب آگئے تھے۔ اسے گھوڑے پر سوار کھیلتے ہوئے دیکھنا ایک بالکل ہی مختلف اور انوکھا تجربہ تھا، ایک ایسا تجربہ جو سرور اور جوش کی کیفیت میں مبتلا کرتا تھا۔

مقابلہ شروع ہو چکا تھا، روایتی حریف آمنے سامنے تھے، ہر کسی کی خواہش تھی کہ وہ جیت کر اور میچ کی ٹرافی لے کر ہی گھر جائے۔ ماہم کا خیال تھا کہ وہ اب اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ عالی بخت کو گھوڑے پر سوار کھیلتا دیکھ کر پہلے کی طرح خوفزدہ نہیں ہوگی لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی۔ جیسے، جیسے میچ آگے بڑھ رہا تھا اس کے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پچھلی دفعہ میچ کے دوران عالی بخت کے گھوڑے سے گرنے اور پھر بری طرح سے زخمی

ہو جانے والا منظر بار، بار اس کی آنکھوں کے سامنے آرہا تھا، ہر طرف سیٹیاں اور ڈھول تاشے بج رہے تھے۔ تالیوں اور اونچی آوازوں کا شور تھا، کچھ لوگ پیراشوٹ کے ذریعے جیسے آسمان سے نازل ہو رہے تھے مگر اس کی توجہ صرف ایک سوار پر ٹکی ہوئی تھی جس کا گھوڑا میدان میں دوڑتے ہوئے بھی آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ میچ ایک گھنٹے کا تھا، دونوں ٹیمیں برابر کی تھیں اسی لیے کسی کو کسی سے ہارنا نہیں پڑا۔ میچ کا اسکور برابر رہا۔ کھیل ختم ہونے پر ماہم نے جیسے بہت دیر بعد سانس لی۔

☆☆☆

اس نے چلتے، چلتے پلٹ کر دیکھا۔ ساحل کی بھیگی ریت پر اس کے قدموں کے نشان بہت واضح تھے۔ وہ بہت دیر سے ساحل پر چلتا جا رہا تھا، سمندر کے پانی پر سے اٹھتی نم آلود ہوائیں اس کے چہرے کو چھو رہی تھیں، اس کے بالوں کو کبھی بگاڑ رہی تھیں تو کبھی سنوار رہی تھیں۔ کبھی، کبھی کوئی بے قرار لہر آکر اس کے پاؤں کو چھوتی اور پھر واپس چلی جاتی۔

سمندر کا پانی اس قدر نیلا تھا کہ گمان ہوتا تھا جیسے کسی نے نیلا اور سبز رنگ ملا کر پانی میں گھول دیا ہو۔ اس کے سامنے دور تک پھیلی ریت بالکل سفید تھی اور اس سے آگے بے شمار چھوٹے قد کے درخت لگے ہوئے تھے۔ دور پانیوں میں ایک جہاز کھڑا تھا، اکیلا، تنہا جیسے کسی مسافر کا انتظار کر رہا ہو۔

دور کے اس ساحل اور اس میں تنہا کھڑے جہاز کی طرح اس کے اردگرد بھی تنہائی بڑھ گئی تھی۔ دوست دور جا چکے تھے اور سیرا کا یوں اچانک چلے جانا بھی اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس کا سیرا سے اگر کوئی تعلق تھا تو صرف انسانیت کا تھا اور اسی ایک تعلق کی وجہ سے وہ اس کے لیے اداس تھا۔ وہ حسین تھی، کم عمر تھی، ذہین تھی۔ اس کی زندگی تو اب شروع ہوئی تھی مگر شروع ہوتے ہی ختم ہوگئی۔ اس کی زندگی اتنی ہی تھی اور اس کے جانے کا بھی یہی وقت اور طریقہ مقرر تھا لیکن پھر بھی اس کے جانے کا ملال تھا کہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔

سیرا کو دنیا سے گئے آج چوتھا دن تھا مگر اسے آج بھی لگتا تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں سے نمودار ہو کر کچھ نہ کچھ نیا کرے گی اور اسے حیران کر دے گی۔ وہ جب بھی ملتی فرات کی توجہ پانے کے لیے کوئی بات، کوئی کام ایسا ضرور کرتی تھی جو اسے نہ صرف حیرت میں مبتلا کرے بلکہ وہ سیرا کو یاد رکھنے پر بھی مجبور ہو جائے۔ یاد تو وہ اسے کر رہا تھا لیکن یہ دیکھنے کے لیے وہ اس دنیا میں نہیں تھی۔ کچھ بھی تھا اسے سیرا کے جانے کا بہت دکھ ہوا تھا۔ وہ اپنی طرح کی بس ایک ہی لڑکی تھی۔

لارین نے... ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا اور فرات نے اس سے پوچھا بھی نہیں تھا۔ ایک تو سیرا کی وجہ سے وہ بہت پریشان ہوا تھا اور دوسرے وہ لارین کو سوچنے کے لیے پورا، پورا وقت دینا چاہتا تھا حالانکہ وہ دل سے چاہتا تھا کہ اس کا جواب اثبات کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ مثبت جواب جتنا فرات کے لیے ضروری تھا اتنا ہی لارین کے لیے بھی تھا۔ وہ دور رہ کر اس کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کو کسی حادثے سے بچا سکتا تھا۔ سیرا کے بعد وہ لارین کے لیے اور بھی زیادہ فکر مند ہو گیا تھا۔

لارین سے بات کرنے سے پہلے اس نے امی سے بات کرنا اور ان کی اجازت لینا ضروری سمجھا تھا۔

”بیٹا، تم جو بھی فیصلہ کرو گے ہم اسے قبول کریں گے۔ ہمیں تم پر پورا بھروسا ہے، تم کبھی غلط فیصلہ نہیں کرو گے۔“

ماں کی بات سن کر اس کا حوصلہ اور بڑھ گیا تھا، اسے یقین ہو گیا تھا کہ امی، بابا اس کے ہر فیصلے سے اتفاق کریں گے۔

”ہماری بس ایک اکلوتی شرط ہے۔“ امی کہہ رہی تھیں۔ ”کہ لڑکی مسلمان ہونی چاہیے۔ اسے اپنے ماحول، خاندان اور طور طریقوں کے بارے میں پہلے سے بتا دینا تاکہ بعد میں اسے کوئی پریشانی نہ ہو اور وہ آسانی سے ہمارے گھر اور ہمارے ماحول کا حصہ بن جائے۔“

Digest Library.com

"امی، جہاں تک میں اسے جانتا ہوں اسے ہمارے ماحول کا حصہ بننے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" اس نے ماں کو تسلی دی تھی۔

"ویسے کون ہے یہ لڑکی، کیا ہم اسے جانتے ہیں؟ کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں ہے جو اس دن شادی پر آئی تھی اور تمہارے گھر کے قریب ہی گھر بھی خرید لیا تھا اور شاید اسلام بھی قبول کیا ہے؟"

"واہ امی، لگتا ہے آپ کے پاس تو تمام معلومات ہیں، اتنا باخبر تو میں بھی نہیں ہوں جتنی آپ ہیں۔"

"تو تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں اولاد سے دور ہوں تو کیا بے خبر بھی ہوں۔" امی صاف برا مان گئی تھیں۔

"نہیں بھئی، میرا ایسا کوئی مطلب نہیں تھا، میں مانتا ہوں کہ میری امی دنیا کی سب سے باخبر انسان ہے اور جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے یہ وہ لڑکی نہیں ہے۔"

"لیکن میں نے تو سنا ہے کہ وہ میرے بیٹے کو بہت پسند کرتی ہے اور تمہاری خاطر اس نے اسلام بھی قبول کیا ہے۔"

"ہاں میری خاطر اسلام قبول کیا ہے لیکن جس دن میں برا لگا تو پھر اسلام بھی اچھا نہیں رہے گا۔ میرے ساتھ، ساتھ اسلام بھی چھوڑ دے گی۔ تو یہ اس کا جذباتی فیصلہ ہے جو اس نے سوچ سمجھ کر کسی مضبوط ارادے کے ساتھ بالکل بھی نہیں کیا۔"

"چلو یہ تو اچھی بات ہے کہ تم کسی کے ظاہر سے متاثر نہیں ہوتے۔ میرا سوال اب بھی وہی ہے کہ وہ لڑکی کون ہے؟"

"بتادوں گا، ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ مجھے اس سے بات تو کر لینے دیں، کیا معلوم وہ کیا جواب دیتی ہے۔ آپ کے بیٹے کو ہوسکتا ہے مسترد کر دے۔"

"ارے واہ!" امی ایک دفعہ پھر برا مان گئی تھیں۔

"میرے بیٹے کو بھلا کون مسترد کر سکتا ہے، کوئی بدقسمت ہوگا جو تمہیں نہ کرے۔"

"امی، سچ بتاؤں تو ہر ماں کو یہی لگتا ہے کہ اس کے بیٹے کو کوئی ناپسند کر ہی نہیں سکتا۔"

"چلو میں شرط لگاتی ہوں وہ جو بھی ہے دیکھنا ضرور ہاں کرے گی۔" وہ بڑے اعتماد سے بولی تھیں۔

"چلیں دیکھتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

اور آج محض ایک ہفتے کے بعد ہی چیزیں کس قدر مختلف ہو چکی تھیں۔ سیرا دنیا میں نہیں تھی اور لارین کیا سوچ رہی تھی کچھ معلوم نہیں تھا۔

☆☆☆

ثبات بھائی نے فون کر کے اسے فوراً گھر پہنچنے کو کہا تھا۔

"یار، تم تو چھپے رستم نکلے۔" وہ اسے دیکھتے ہی بولے۔

"کیوں، ایسا کیا کر دیا میں نے؟" وہ ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اب بنو مت، امی نے مجھے سب بتا دیا ہے کہ آپ جناب شادی کرنے والے ہیں اور لڑکی بھی پسند کر لی ہے، سارے زمانے کو پتا ہے بس ایک ہم ہیں جو غیر تھے اس لیے بے خبر ہیں۔" ثبات بھائی کے لہجے سے ناراضی جھلک رہی تھی۔

"بھائی، ناراض مت ہوں۔ میں تو سرپرائز دینے کے چکر میں تھا، ویسے بھی جب تک دوسری طرف سے کوئی یقینی جواب نہ ملے کسی کو بھی بتانا بیکار ہے۔"

"اب سرپرائز کا بہانہ کر کے ہمیں مت ٹرخاؤ۔" وہ اس کی کوئی بات نہیں سن رہے تھے اور باقاعدہ طور پر ناراض لگ رہے تھے۔

"ویسے کون ہیں یہ موصوفہ جنہوں نے ہمارے بھائی کو اتنا متاثر کیا کہ وہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگے، کیا ہم جانتے ہیں؟"

"ہاں، ہاں بالکل جانتے ہیں اسے، بہت اچھی، شریف لڑکی ہے اور نام ہے اس کا...... لارین۔" اس نے بڑے شوق سے بتایا۔

"کیا...... لارین......؟" نام سنتے ہی ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے جیسے جو سنا ہو اس کا یقین نہ آرہا ہو یا یقین کرنا نہیں چاہ رہے ہوں۔ انہوں نے

digestlibrary.com

حیرت اور تشویش کے ساتھ فرات کو دیکھا۔ جوش کی جگہ اب ان کی آنکھوں میں فکر نظر آرہی تھی۔

"کیا تم لارین اینجل کی بات کر رہے ہو، پادری اینجل کی بیٹی کی؟" انہوں نے بڑی وضاحت سے سوال کیا اس امید کے ساتھ کہ شاید انہوں نے غلط سنا ہے یا پھر شاید یہ لارین اینجل کوئی اور ہو۔

"جی ہاں بھائی، یہ لارین اینجل ہی ہے جو قریب رہتی ہے، پادری اینجل کی بیٹی ہے۔" بھائی کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر وہ بھی سنجیدہ ہو چکا تھا۔

"فرات، تم ہوش میں تو ہو؟ سارے زمانے میں تمہیں اس شیطان کی بیٹی ملی ہے شادی کے لیے۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ پھٹ پڑیں۔ انہیں فرات سے ایسی توقع نہیں تھی۔

"بھائی میں سنجیدہ ہوں۔"

"عنقریب تم رنجیدہ بھی ہو گے۔" انہوں نے ناراضی سے جواب دیا۔

"وہ اپنے باپ سے بہت مختلف ہے۔" وہ اسی طرح سنجیدگی سے بولا۔

"کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ باپ شیطان اور بیٹی فرشتہ ہو گی؟" طول پکڑتی بحث نے ان کے غصے میں اضافہ کر دیا تھا۔

"بھائی، آپ اسے غلط سمجھ رہے ہیں، باپ کی حرکتوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ اب مسلمان ہو چکی ہے۔"

"کیا تمہارے لیے؟" ان کے لہجے میں گہرا طنز تھا جیسے ساری کہانی ان کی سمجھ میں آگئی ہو۔

"ہرگز نہیں۔" فرات نے فوراً تردید کی۔ "وہ ایک عرصے سے مسلمان ہے اور بدقسمتی سے اس کے اسلام کی وجہ میں نہیں۔"

"اس کے باوجود یہ ایک جذباتی اور احمقانہ فیصلہ ہے۔ تم اس لڑکی سے شادی نہیں کر سکتے۔ یہاں تم میری ذمے داری ہو اور میں تمہیں اس خودکشی کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

"کیوں...... کیوں نہیں کر سکتا؟" وہ بھی ضدی لہجے میں بولا۔ ثبات بھائی کا رویہ اس کے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

"ذرا خود کو دیکھو۔" انہوں نے اس پر ایک بھرپور نظر ڈالی جو خاکی پینٹ اور نیلی شرٹ میں ملبوس اپنی وجاہت سے بے خبر تھا۔ "اور پھر اس لڑکی کو دیکھو۔"

"کیا برائی ہے اس لڑکی میں؟" اس نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے تمہاری قریب اور دور کی بھی نظر خراب ہو چکی ہے، کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔" وہ شدید جھنجلاہٹ کے عالم میں بولے۔ وہ اس کی کوئی بات، کوئی وضاحت ماننے کو تیار نہیں تھے۔ "تم دونوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں ہے۔" وہ زور دے کر بولے۔ "اور یہی نہیں اس شادی کے بھیانک ترین نتائج ہوں گے۔ پادری اینجل تمہیں نوچ کھائے گا اور صرف تم ہی نہیں پوری مسلم کمیونٹی خطرے میں گھر جائے گی اور تمہیں پتا ہے اس کمبخت نے آج کے سرمن میں پھر قرآن جلانے کا نعوذ باللہ اعلان کیا ہے۔ اس سب کا نتیجہ جانتے ہو کیا ہوگا؟ اگر پادری نے ہمارے خلاف کچھ نہ بھی کیا تو بھی ہماری کمیونٹی ہمیں تنہا چھوڑ دے گی کہ قرآن کے دشمن سے ہماری رشتے داری ہے۔ اس بدبختی کی کالک ہمارے منہ پر بھی لگ جائے گی اور ہم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

"مجھے لگتا ہے وہ ایک ذلیل موت مرنے کے لیے بے تاب ہے۔" فرات بہت نفرت سے بولا۔ "لیکن جہاں تک لارین کا تعلق ہے میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔ "میں اسے شادی کی پیشکش کر چکا ہوں، وہ خود انکار کر دے تو یہ دوسری بات ہے مگر میں اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

"کیا تم اس لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہو؟"

"اس تعلق کے لیے ایسے گھٹیا جملے نہ بولیں۔"

اسے بڑے بھائی کا لہجہ اور انداز بہت برا لگا۔ اس نے بہت سنجیدگی سے انہیں ٹوکا۔ "مجھے صرف یہ معلوم ہے

digest library.com

کہ وہ مجھ پر بھروسا کرتی ہے، وہ بالکل اکیلی اور تنہا ہے، اسے اس وقت میری مدد کی سخت ضرورت ہے جو میں کسی جائز تعلق کے بغیر کرنہیں سکتا۔ وہ عنقریب بہت بڑے خطرے سے دوچار ہونے والی ہے۔ اس کی حفاظت میرا ہی نہیں بلکہ ہم سب کا فرض ہے کیونکہ اب وہ امت کا حصہ ہے۔''

''کیا ثبوت ہے اس کے اسلام کا؟'' ثبات بھائی نے بڑے ہی چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔ ''کیا ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کوئی ڈراما نہیں کررہی، اپنے باپ کے کہنے پر تمہیں پھنسانے کی کوشش نہیں کررہی یا یہ سب کچھ کسی بڑے فساد کے لیے نہیں ہورہا؟'' وہ سوال پر سوال کیے جارہے تھے۔

''آپ کے اسلام کا کیا ثبوت ہے؟'' جواباً اس نے بھی سوال کیا۔ ''کیا صرف اتنا کہ آپ ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوئے ہیں مگر یہ تو کافی ثبوت نہیں ہے بھائی، اور یہ کیا رویہ ہے...... بجائے اس کے کہ ہم ایک نومسلم کو خوش آمدید کہیں، اس کا اعتبار کریں، نئی زندگی شروع کرنے میں اس کی مدد کریں ہم الٹا ان پر شک کرتے ہیں۔ اسلام کسی کی وراثت نہیں، جس کا دل اسے مان جائے یہ اسی کا ہے۔'' وہ طرح، طرح کے دلائل دے رہا تھا مگر ساری بحث بے نتیجہ رہی۔

کوئی بھی اپنے موقف سے پیچھے نہیں ہٹا تھا۔ وہ تنگ آکر گھر سے باہر آگیا کیونکہ بحث کے دوران ان کی آوازیں بلند ہورہی تھیں اور سب کو اس بحث کے موضوع کا پتا چل گیا تھا۔ اب وہ جانتا تھا کہ گھر کا ایک، ایک بندہ اسے نہ صرف نصیحت کرے گا بلکہ اس بیوقوفی سے باز رہنے کا مشورہ بھی دے گا۔ جب آپی اور حماد بھائی تک یہ خبر پہنچے گی تو وہ بھی اس کارِخیر میں ضرور شامل ہوں گے۔ اتنی بات وہ سمجھ گیا تھا کہ ثبات بھائی کے ساتھ جیسی اور جتنی بحث ہوئی تھی وہ انہیں قائل نہیں کرسکا تھا تو پھر کسی اور کا قائل ہونا بھی اتنا ہی مشکل تھا۔

☆☆☆

وہ آپی کے پاس بھی نہیں گیا بلکہ اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا۔ اس وقت وہ کوئی نصیحت، کوئی مشورہ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ثبات بھائی کے رویّے سے وہ بہت بددل ہوا تھا۔ اسے ان سے اس درجہ مخالفت کی بالکل امید نہیں تھی۔ بات تو یقیناً سب کو پتا چل گئی ہوگی وہ جانتا تھا۔ اب وہ چاہتا تھا تو صرف اتنا کہ سب ٹھنڈے دل سے اس معاملے پر غور کریں اور اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے بجائے اس کے مددگار بنیں ورنہ یہ ناممکن تھا کہ وہ خاندان کے اتنے سارے لوگوں کو الگ، الگ بٹھا کر سمجھاتا، قائل کرتا، لارین جس خطرے سے دوچار تھی اس خطرے کا احساس دلاتا۔

لیکن محض چار دن بعد آج پھر وہ اصرار کرکے اسے بلارہے تھے اور اسے نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑا تھا۔

اور وہاں ایک خوشگوار حیرت اس کی منتظر تھی۔ پاکستان سے امی، بابا آچکے تھے۔ وہ سب سے مل رہا تھا مگر اس نے دیکھا سب کے چہرے سنجیدہ تھے اور امی کا متفکر انداز...... وہ اس سے ملتے ہوئے رو پڑیں۔ اس نے فوراً شکایتی نظروں سے بھائی کو دیکھا۔ نہ جانے انہوں نے ان سے کیا کہا تھا اور کس طرح کہا تھا کہ انہیں اتنی عجلت میں پاکستان سے آنا پڑا تھا۔ امی بچوں کی طرح اس کے ساتھ لگ کر رو دی تھیں۔

''بیٹا، یہ تم کیا کر رہے ہو، کیوں خطروں سے کھیل رہے ہو، کیوں خود کو اتنی بڑی مصیبت میں ڈال رہے ہو؟'' وہ بار، بار یہی جملے دہرائے جارہی تھیں۔

وہ انہیں ساتھ لگائے مسلسل ان کے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ثبات بھائی نے یقیناً انہیں اچھا خاصا ڈرایا بھی تھا اور پریشان بھی کیا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ جو پہلے آسٹریلیا آنے کا ارادہ ہی نہیں رکھتے تھے اب آناً فاناً آپہنچے تھے۔ اسی دوران اس کی نظر بابا کی طرف اٹھی، وہ خاموش تھے لیکن اس خاموشی کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ اس کے فیصلے پر خوش تھے یا اس سے متفق تھے۔ یہ خاموشی یقیناً کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ وہ امی کی طرح اپنے جذبات کا اظہار تو نہیں کرسکتے تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ جب بھی بولیں گے ان کی بات، ان کا فیصلہ آخری ہوگا اور وہ شاید

digest.library.com

ان کے سامنے کچھ بھی نہیں بول پائے گا۔

☆☆☆

دن رات گھر میں ایک ہی موضوع تھا کہ وہ کسی قیمت پر لارین سے شادی نہیں کرے گا مگر اس کا موقف صرف اتنا تھا کہ وہ لارین کو یوں تنہا نہیں چھوڑ سکتا، بات کہہ کر پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ یہ بدترین بدعہدی تھی۔ کئی دنوں کی بحث بے نتیجہ رہی۔

لارین نے کیا فیصلہ کیا تھا یہ تو پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ اس کے گھر میں ہی اتنی ساری مخالفت شروع ہوگئی تھی کہ وہ اسی کا مقابلہ کرتے، کرتے نڈھال ہوا جارہا تھا۔ جب گھر والے ہی اس سے متفق نہیں تھے تو وہ لارین سے کیا پوچھتا کہ اس نے اس کی پیشکش کے جواب میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے خود بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا، یقیناً وہ انتظار کررہی ہوگی کہ فرات خود اس سے پوچھے۔

وہ جس طرح کے مسائل کا سامنا کررہی تھی ان حالات میں وہ اس کو یہ بات ہرگز نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ جس نے بڑے اعتماد سے اس کی ہر طرح سے مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا اور یہ یقین بھی دلایا تھا، اس کے خاندان نے ہی اسے بے بس کردیا تھا، وہ اس کے ساتھ نہیں تھے اور نہ ہی وہ انہیں اپنا ساتھ دینے کے لیے قائل کرپارہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لارین سے تب ہی بات کرے جب اپنے گھر کے مسائل پوری طرح سے حل کرلے ورنہ اپنے گھر کے حالات بتا کر وہ اسے مزید پریشان نہیں کرسکتا تھا۔

آپی اور حماد بھائی بھی وقتاً فوقتاً آجاتے تھے۔ انہیں بھی صورتِ حال کی سنگینی کا احساس ہوچکا تھا۔ فرات کا خیال تھا کہ ایک آپی ہی ہیں جو اس کے جذبات کو سمجھ سکتی ہیں۔ لارین کے ساتھ ان کا تعلق بھی بہت پرانا اور قریبی تھا اس لیے ایک وہی ہیں جو اس بات کی مخالفت کرنے کے بجائے ان دونوں کی حمایت کریں گی۔

سب کے سب کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔ ہر کوئی اپنی، اپنی طرف سے خطروں اور خدشات کا اظہار کررہا تھا لیکن دو لوگ مسلسل خاموش تھے...... بابا اور آپی! بابا کیا سوچ رہے ہیں وہ ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کرپایا تھا جبکہ آپی کیوں خاموش ہیں وہ یہ بھی سمجھ نہیں پارہا تھا۔

''تمہارا اور لارین کا کوئی جوڑ نہیں ہے، تم دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔'' اس نے ثبات بھائی کو ایک بار پھر وہی پرانی بات دُہراتے سنا۔ اس نے حیرت اور تعجب سے اپنے خاندان کو دیکھا۔ وہ دو انسانوں کے بیچ کس طرح کا موازنہ اور مقابلہ کررہے تھے کیونکہ ثبات بھائی کی بات کے جواب میں کسی نے اس کی تردید نہیں کی تھی بلکہ سب کی خاموشی سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اس بات سے نہ صرف متفق ہیں بلکہ اس کی تائید بھی کرتے ہیں۔

''امی، میں نے جو کچھ بھی کیا آپ سے پوچھ کر کیا ہے۔'' وہ بہت بے بسی کے عالم میں بولا۔ ''اور پھر آپ نے ہی تو کہا تھا کہ آپ کی شرط صرف اتنی ہے کہ میں جس سے بھی شادی کروں اسے مسلمان ہونا چاہیے، تو اب پھر آپ سب اس بات کی مخالفت کیوں کررہے ہیں؟ لارین مسلمان ہے اور ہم سب سے کہیں زیادہ اچھی مسلمان ہے کیونکہ ہم نے دین کی خاطر کبھی ایک ناخن تک نہیں کٹوایا لیکن اس لڑکی نے ذرا سی عمر میں نہ صرف سچائی کو مانا ہے بلکہ اس کے لیے ہر طرح کی قربانی بھی دی ہے اور آئندہ بھی دیتی رہے گی، اس کی زندگی آزمائش سے پہلے خالی تھی نہ آئندہ ہوگی۔ آپ کو میرا اور اس کا ساتھ دینا چاہیے، میں اپنے خاندان سے کیا اتنی سی بھی حمایت اور مدد کا مستحق نہیں ہوں؟'' اس کی لمبی التجاؤں کا امی نے ایک بھی جواب نہیں دیا۔ وہ بس آنسو بہائے جارہی تھیں۔ اس نے ایک، ایک چہرے کو مثبت جواب کی امید پر دیکھا مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا۔

☆☆☆

جب وہ گھر والوں کو سمجھا، سمجھا کر تھک جاتا اور اس کے سارے دلائل اور بحث بے نتیجہ رہتی تو وہ گھر سے نکل جاتا، تب اس کی منزل کوئی نہ کوئی ساحل ہوتا جہاں وہ تنہا

Digest Library.com

گھنٹوں گھومتا رہتا۔ اس نے ایک، ایک سے الگ، الگ بات کر کے دیکھ لی تھی لیکن کہیں سے کوئی مثبت جواب نہیں ملا تھا حتیٰ کہ آپی جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ تو فوراً سمجھ جائیں گی وہ بھی اس بات کی مخالفت کررہی تھیں۔

''آپی، آپ تو سب کچھ جانتی ہیں پھر بھی آپ میری بات سمجھ نہیں پارہیں۔'' اس نے شکایتی انداز میں کہا۔

''میری جان، میں سب کچھ جانتی ہوں اسی لیے تو مخالفت کررہی ہوں۔ میں اس پاگل پادری سے بھی اچھی طرح سے واقف ہوں اور لارین کو بھی جانتی ہوں۔ لارین کو، اس کی زندگی کو، اس کے ایمان کو بچانا بہت ضروری ہے لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری تمہیں بچانا ہے، یہاں موجود مسلمانوں کو بچانا ہے''

''مجھے کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' وہ آپی کی بات سن کر بے خوفی سے بولا۔ ''اور رہے دوسرے مسلمان تو میں جس سے بھی شادی کروں یہ ان کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔''

''نہیں میرے بھائی، یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ تم لارین سے شادی کرلوگے اور بات ختم ہوجائے گی۔'' آپی اس کی بات سن کر بولیں۔ ''نہیں، اس طرح بات ختم نہیں ہوگی۔ یہ منحوس شخص دنیا کے آخری کونے تک تم لوگوں کا پیچھا کرے گا، تم لوگوں کو کبھی کہیں چین سے نہیں رہنے دے گا اور یہاں بھی ہر طرح کا فساد کرنے کی اس کو کھلی چھٹی مل جائے گی اور پھر میڈیا کا جن الگ تمہارا تعاقب کرے گا، تمہیں پریشان کرے گا۔ ہم لارین کی کسی اور طریقے سے مدد کرسکتے ہیں لیکن جو طریقہ تم نے سوچا ہے وہ بالکل بھی مناسب نہیں ہے کیونکہ جو کچھ تم چاہ رہے ہو وہ ایک جذباتی فیصلہ ہے۔ تم دونوں خوش نہیں رہ سکتے، تم دونوں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہو۔ اگر اسے شادی کر کے ہی تحفظ مل سکتا ہے تو اس کی شادی کہیں بھی کروائی جاسکتی ہے، تمہارے ساتھ اس کی شادی ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہم تمہارے خیر خواہ ہیں، تمہارے دشمن نہیں ہیں، ہماری بات سمجھو۔ تم صرف اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہے ہو لیکن تم نے اپنے خاندان کو، ان کی محبت اور حیثیت کو بالکل نظر انداز کردیا ہے۔''

اسے آپی کی باتوں سے سب سے زیادہ مایوسی ہوئی تھی۔ انہیں ہر چیز کی فکر تھی، خاندان، خاندان کی محبت، خاندان کی حیثیت سب کی ... نہیں تھی تو بھائی کی، اس کے جذبات کی اور ایک کمزور لڑکی اور اس کے ایمان کی فکر نہیں تھی۔ وہ خاموش ہوگیا۔ کسی سے بھی بات کرنا چھوڑ دی۔ وہ کسی کو قائل نہیں کرسکتا اس نے مان لیا تھا۔

☆☆☆

اس شام جب وہ گھر پہنچا تو سب ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھے۔

''آؤ تم بھی کھانا کھاؤ۔'' اسے دیکھ کر امی نے آواز دی۔ وہ خاموشی سے آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ آج خلافِ توقع کسی نے اس کو سمجھانے اور قائل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آج کل وہ کم ہی کسی سے خود مخاطب ہوتا تھا۔ جن رشتوں سے اس کو سب سے زیادہ امید تھی انہوں نے ہی اس کو سب سے زیادہ مایوس بھی کیا تھا۔ کہاں تو سب اس کی عقلمندی اور سمجھداری کی تعریف کرتے نہ تھکتے تھے مگر اب سب اسے ایک جذباتی، جلد باز اور عشق کا مارا سمجھ کر اسے روکنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

اس نے دیکھا سب وقتاً فوقتاً اس پر نظر ڈالتے اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے جیسے اس سے کچھ کہنا چاہ رہے ہوں لیکن کون کہے یہ فیصلہ نہیں ہو پارہا ہو۔ آخر کار شہاب بھائی ہی بولے۔

''فرات، تمہیں لارین کے معاملے میں سمجھانے کی ہم نے حتی الامکان کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ یہ معاملہ ایسا نہیں تھا کہ اس کو صرف تمہاری جذباتیت پر چھوڑ دیا جاتا اسی لیے ہم سب نے اس کا اپنی طرف سے حل نکالنے کی کوشش کی ہے۔ تمہاری طرف سے مایوس ہوکر ممکنہ فتنے اور فساد کو روکنے کے لیے ہم نے پادری اینجل سے بات کی تھی۔''

''کیا...... کیا بات کی آپ نے؟'' اس نے کسی شدید کیفیت میں آکر چمچ پلیٹ پر پٹخ دیا۔

''ہمارا کوئی غلط ارادہ نہیں تھا، ہم نے اس سے صرف اتنی بات کی کہ اگر وہ چاہے تو لارین کی شادی تم سے کروا دے ورنہ انکار کر دے تاکہ یہ معاملہ سیدھے طریقے سے ختم ہو جائے۔ لارین کو وہ سمجھا لے اور تمہاری ذمّے داری ہم لے لیں۔ ہم سب پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ ہیں، ہمارے بیچ کوئی معاملہ ہوتا ہے یا نہیں ہوتا دونوں صورتوں میں دنگا فساد کرنے کے بجائے اسے مل بیٹھ کر حل کر لینا چاہیے۔ ویسے بھی اگر لارین کے ساتھ تمہاری شادی ہوتی بھی تو بھی آخر کار بات تو پادری سے ہی کرنی تھی۔ اتنا بڑا کام خفیہ طریقے سے تو نہیں ہو سکتا تھا۔''

''پادری نے کیا جواب دیا؟'' وہ کھانا بھول چکا تھا، بدترین اندیشے اس کے دماغ میں کھلبلی مچا رہے تھے۔

''ظاہر ہے وہ اس رشتے کے لیے کسی قیمت پر راضی نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ بدتمیزی پر اترتا، ہم واپس آگئے، ہم سے جو ہو سکتا تھا تمہاری خوشی کی خاطر ہم نے وہ سب کیا ہے۔ میرے خیال میں اب تمہیں ہم سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔'' اس کے خاندان کے خیال میں ان کی جو ذمّے داری بنتی تھی وہ انہوں نے نبھا دی تھی۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''کیا آپ نے لارین کے اسلام قبول کرنے کے متعلق بھی بتا دیا؟'' کسی بدترین اندیشے کے تحت اس نے پوچھا۔

''ہم چاہتے تو نہیں تھے۔'' وہ اس کے سوال پر نظریں چراتے ہوئے بولے۔ ''لیکن ہاں باتوں باتوں میں یہ بات بھی سامنے آگئی کیونکہ پادری کا پہلا سوال ہی یہی تھا کہ دونوں مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں ایسے میں یہ شادی بھلا کیسے ممکن ہے۔''

اور اس کا جی چاہ رہا تھا دیوار کے ساتھ اپنا سر دے مارے۔ اس کے اپنے ہی گھر والے یہ سب کس طرح کر سکتے تھے۔ وہ پھٹی آنکھوں کے ساتھ اپنے خاندان کے ایک، ایک فرد کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ امی، بابا، آپی، بھائی کوئی ایک بھی نہیں تھا جس نے اس معاملے کی نزاکت کا احساس کیا ہو۔

''دیکھو بات کرنے سے ہی یہ مسئلے حل ہوتے ہیں۔'' آپی کہہ رہی تھیں۔ ''آخر ہم اور کیا کرتے، اتنے دن ہو گئے بحث کرتے، تم ہماری سن نہیں رہے تھے۔ کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے سے بچنے کے لیے ہمیں یہ قدم اٹھانا پڑا۔ ہم نے بھی صرف بات ہی کی ہے، یہ مسئلہ جتنا ہمارا ہے اتنا ہی پادری اینجل کا بھی ہے۔ اگر تم لوگ نادانی میں کوئی قدم اٹھا لیتے تو پھر کوئی حل باقی نہیں بچتا،

قصہ...... طوطا چشم چھوٹو کا

ہماری ایک دوست نے گہرے رنگ کا افریقن طوطے کا بچہ خریدا۔ اسے پیار سے پالا پوسا۔ باتیں کرنا سیکھ گیا۔ پہلا کلمہ سناتا اور جو، جو گفتگو سنتا...... اس کی نقل اتارتا۔ ان کے شوہر گھر واپس آتے تو ''چھوٹو'' ان کے شانے پر چڑھ بیٹھتا۔ کبھی ٹائی سے چھیڑ چھاڑ، کبھی کالر سے...... کافی اور مرنڈا شوق سے پیتا۔ ایک روز نماز ادا کر رہی تھیں تو پیچھے سے آواز آئی باجی جی!، باجی جی!'' وہ حیران کہ آج ملازم کو کیا ہوا جو نماز میں مجھے آواز دے رہا ہے۔ سلام کے بعد مڑ کر دیکھا تو ''چھوٹو'' خوش، خوش گھر کے اوپر پورشن میں آزاد پھر رہا ہوتا۔ ہماری دوست پرندے کو پنجرے میں قید رکھنے کی قائل نہ تھیں۔ چھوٹو دو سال کا ہو گیا تھا۔

ایک روز ملازم اس کو کھانا دینے گیا تو ٹرے ویسے پڑی تھی اِدھر اُدھر آوازیں دیں جواب ندارد...... تلاش کے بعد پتا چلا کہ بالا ہی بالا اوپر لاؤنج کی جالی دار کھڑکی (جہاں اکثر براجمان ہوتا) کے کونے کو کتر، کتر کے وہاں سے فرار ہو چکا تھا۔

کئی روز تو پریشانی ہوئی کہیں بلی نہ کھا گئی ہو مگر آخر دل کو قرار آگیا کہ آزاد تو طوطا ہی تھا...... طوطا چشمی کر گیا۔ آج کل ان کے بڑے گارڈن میں پرندے سب آزاد ہیں...... مزے میں ہیں جن میں بطخیں، کونجیں اور مرغابیاں ہیں۔

از فریدہ افتخار، اسلام آباد

digest library.com

خاندان کو بڑے مسئلے سے بچانے کے لیے ہم نے جو کیا وہ ضروری تھا۔ ہم نے بڑی مصیبت کے مقابلے میں چھوٹی مصیبت کو چنا ہے۔''

سب وضاحتوں پر وضاحتیں دے رہے تھے مگر وہ تو جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا تھا۔ اسے فکر تھی تو صرف لارین کی۔ وہ جلدی سے دروازے کی طرف لپکا۔ ثبات بھائی اسے روکنے میں لگے ہوئے تھے۔

''مجھے لارین کو بچانا ہے۔'' وہ ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ ''اس کی جان خطرے میں ہے۔'' تب اس نے پہلی بار بابا جان کی آواز سنی...... بلند اور غصے سے بھرپور۔

''بہت ہو گیا تمہارا تماشا، واپس آؤ اور آرام سے بیٹھو یہاں۔''

''بابا جان، لارین کی جان کو خطرہ ہے، مجھے جانے دیں۔'' وہ رک گیا تھا مگر واپس نہیں آیا تھا۔

''کس سے خطرہ ہے اسے، اپنے باپ سے یا اپنی ماں سے؟'' وہ آنکھوں میں طنز لیے اسے گھور رہے تھے۔ ''تم جا کر کیا کہو گے کہ ایک بیٹی کو اس کے سگے باپ سے بچانے آئے ہو؟ لوگ تمہیں پاگل سمجھیں گے اور پھر تم کس حیثیت سے اسے بچانے جاؤ گے، کون ہو تم؟ اس لیے بچوں جیسی باتیں بند کرو۔ کہیں جانے کی اجازت نہیں تمہیں۔'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولے تھے۔

اس نے حمایت کی تلاش میں ایک نظر ارد گرد کھڑے سب چہروں پر ڈالی مگر کہیں سے اس کو حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔ وہ جھنجلاتا، غصہ پیتا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ طرح، طرح کے وہم اور اندیشے اسے پریشان کر رہے تھے۔ اس نے کمرے میں آ کر لارین کا نمبر ملایا مگر اس کا نمبر بند تھا۔ پھر ہر تھوڑی دیر بعد وہ پاگلوں کی طرح اس کا نمبر ملا رہا تھا۔ اسے لارین کو ہوشیار کرنا تھا، اسے خطرے کی خبر دینی تھی، اسے یقین دلانا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہے، وہ اکیلی نہیں ہے۔ اگر ذرا سا بھی خطرہ محسوس ہو تو وہ اسے بلا سکتی ہے، وہ اسے بچا لے گا لیکن اس کی ساری باتیں کمرے کی دیواریں سن رہی تھیں۔ لارین کا نمبر مسلسل بند تھا۔ وہ سونا چاہتا تھا مگر سو بھی نہیں پا رہا تھا، نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

☆☆☆

رات ہر طرف چھائی ہوئی تھی، باہر گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ آج کی رات اتنی تاریک تھی کہ چاند لمحے بھر کے لیے بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ گھر میں بھی خاموشی چھا چکی تھی، سب سو چکے تھے۔ کہنے کو سب اس کے اپنے تھے مگر آج اتنی دور اور اتنے اجنبی لگ رہے تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے ان کے ساتھ کبھی کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔ اس نے دیکھا لارین کا گھر بھی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ معلوم نہیں قیامت آنے والی تھی یا آ کر جا چکی تھی، وہ بے خبر تھا اور یہی بے خبری اسے نہ ختم ہونے والی اذیت میں مبتلا کر رہی تھی۔ صبح ہوتے ہی وہ لارین کے گھر ضرور جائے گا چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ وہ لارین کو اس کے... بے حس و بے رحم باپ کے رحم و کرم پر ہرگز نہیں چھوڑے گا۔ اس نے فیصلہ کیا۔

مگر اس فیصلے نے بھی اسے کوئی سکون نہیں دیا۔ کوئی بے چینی سی بے چینی تھی۔ وہ جب سے اپنے کمرے میں آیا تھا ایک لمحے کے لیے کہیں بیٹھ نہیں پایا تھا۔ وقت کسی طرح گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''آج کی رات بہت طویل، بہت بھاری ہے۔'' اس نے کمرے کے طول و عرض میں ٹہلتے ہوئے کوئی ہزارویں بار سوچا تھا۔

اِک رات وہ گیا تھا جہاں بات روک کے
اب تک رکا ہوا ہوں وہیں رات روک کے

اس نے دور سے لارین کے کمرے کی طرف دیکھا۔ اس کا کمرا ایسے زاویے پر تھا کہ صرف ایک کھڑکی دکھائی دیتی تھی اور یہ کھڑکی تاریک تھی۔

''کیا میں تمہارے گھر آ سکتا ہوں؟'' اس نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے غیر محسوس انداز میں سرگوشی کی۔

''نہیں، ابھی تمہارا وقت نہیں آیا، انتظار کرو۔'' جواب میں اس نے ایسی ہی ایک سرگوشی سنی اور پھر مسکرا دیا۔ وہ اندر اپنے کمرے میں میٹھی نیند سو رہی تھی، اس

کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ آج پھر وہی خواب دیکھ رہی تھی جس کے ساتھ اس کی روح کا تعلق تھا۔ بکریوں کی اور اونٹوں کی گھنٹیوں کی آواز بہت واضح سنائی دے رہی تھی۔ صحرا میں ہولے سے اٹھنے والی بادِ نسیم اسے اپنے جسم پر محسوس ہو رہی تھی، سکون دے رہی تھی۔ کھجوروں کا باغ آج اور بھی سرسبز تھا اور اس کے اندر زندگی بھرتی پانی کی نہر رواں دواں تھی۔ اس کی زبان پر نئے ذائقے تھے اور ناک ان خوشبوؤں سے آشنا ہو رہی تھی جو اس سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھیں۔ آج اس کا وجود بہت ہلکا تھا اور دل خوشی سے لبریز۔ بس ایک ہی عجیب بات تھی، اس خواب میں فرات کہیں نہیں تھا کیونکہ وہ جاگ رہا تھا اور وہ سو چکی تھی، ٹھنڈی میٹھی، پُرسکون نیند۔

☆☆☆

آج کا میچ بلا مقابلہ ختم ہو گیا تھا لیکن کل ہونے والا میچ سب کے لیے بہت اہم تھا۔ کوئی بھی ٹیم اسے ہارنا نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی برابر کرنا چاہتی تھی۔ کل کوئی فیصلہ ہونا بہت ضروری تھا۔ شندور اتنی خوب صورت جگہ تھی کہ وہ لوگ جو میچ دیکھنے آئے تھے میچ کے بعد سب اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ کوئی جھیل کنارے جا پہنچا تھا اور کوئی ٹریکنگ اور ہائکنگ میں مصروف ہو گیا تھا، کچھ لوگ مختلف اسٹالوں سے خریداری کرتے پھر رہے تھے۔

رات کو میلے کی انتظامیہ کی طرف سے مہمانوں کی تفریح کے لیے مختلف پروگرام پیش کیے جا رہے تھے، کہیں پر موسیقی کی محفل برپا تھی تو کہیں پر علاقائی رقص پیش کیے جا رہے تھے۔ عجیب بات تب ہوئی جب مرد و خواتین کا ایک نیا گروپ آیا۔ مردوں نے میدان کے درمیان میں بیٹھ کر بڑے، بڑے ڈھول بجانے شروع کر دیے جبکہ ان کے ساتھ آنے والی عورتوں نے جو روایتی لباس میں ملبوس تھیں ناچنا شروع کر دیا تھا۔ یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا۔ ماہم نے چپکے سے ایک نظر عالی بخت کے چہرے پر ڈالی۔ اس کا ماتھا شکن آلود تھا اور چہرے پر غیر معمولی سرخی بھی تھی۔ یقیناً اسے یہ منظر بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ ماہم خود بھی حیرت زدہ تھی۔ یہ علاقے جو غیرت اور خواتین کی عزت کے لیے مشہور تھے آج کس طرح اپنے ہی علاقے کی عورتوں کو نچا رہے تھے۔ جیسے، جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا یہ منظر ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک ہی عالی بخت اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ماہم بھی۔ وہ اپنے خیمے کی طرف جا رہے تھے۔ وہ تیز قدم اٹھاتا آگے، آگے چلتا جا رہا تھا اور جس طرح وہ تیز قدم اٹھا رہا تھا اس سے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت بہت ناراض تھا۔ راستے میں ان کی ملاقات میلے کے منتظمین میں سے ایک کے ساتھ ہوئی۔

''آپ لوگ پروگرام چھوڑ کر کیوں جا رہے ہیں؟'' وہ عالی بخت سے مخاطب تھا۔

''اور میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہاں یہ سب کیا ہو رہا ہے، عورتوں کو کیوں نچایا جایا جا رہا ہے؟'' وہ اپنا غصہ دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں شکایت کے ساتھ، ساتھ سختی بھی تھی۔

''بس جی کیا کریں، غیر ملکی لوگ جب آتے ہیں تو وہ اس علاقے کی ثقافت دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کو خوش کرنے کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ اوپر سے یہی آرڈر ہے کہ انہیں ہر طرح سے خوش رکھنا ہے تاکہ یہ آئندہ بھی آئیں اور دنیا کے سامنے جا کر پاکستان کا سافٹ امیج رکھیں۔'' وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ مسکراتا ہوا بتا رہا تھا۔

''اس سافٹ امیج کے لیے عزت اور غیرت کو نیلام کرنا ضروری ہے کیا؟'' عالی بخت دانت پیستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اچھا تو ہمیں بھی نہیں لگتا لیکن مجبوری ہے، یہ سب کرنا پڑتا ہے۔ کسی ایک کے کہنے پر ہم یہ سب روک نہیں سکتے۔ دیکھیں تو سب کو کتنا اچھا لگ رہا ہے ایک آپ کے علاوہ۔ آپ کو اگر اچھا نہیں لگ رہا تو آپ اپنے خیمے میں آرام کریں۔'' اس نے مجبوریوں کی فہرست کے ساتھ، ساتھ مشورہ بھی دیا۔

''میں کل صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

عالی بخت نے دوٹوک الفاظ میں اعلان کیا۔

''آپ کیسے جاسکتے ہیں؟ آپ اپنی ٹیم کا اہم حصہ ہیں، آپ اس طرح میچ درمیان میں نہیں چھوڑ سکتے۔'' منتظم کو قوم کی غیرت سے زیادہ کل کے میچ کی فکر تھی۔

''اگر آپ قومی غیرت برائے فروخت کا اشتہار لگاسکتے ہیں تو میں بھی میچ چھوڑ کر جاسکتا ہوں بلکہ جارہا ہوں۔'' وہ اپنی بات سختی سے کہتا آگے بڑھ گیا۔

صبح سویرے ہی انہیں اطلاع مل گئی تھی۔ عالی بخت کی بہن کے بیٹے کو سڑک پر حادثہ پیش آیا تھا جس کے نتیجے میں اسے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ انہیں سب کچھ بھول کر نہایت عجلت اور پریشانی کے عالم میں واپسی کا سفر اختیار کرنا پڑا تھا۔

☆☆☆

صبح تک وہ جاگ رہا تھا، اس نے نماز بھی پڑھی، نماز کے بعد لارین کے لیے دعا بھی کی.... اس کے سکون، آزادی اور خوشیوں کی دعا۔ اس کی ساری دعائیں حرف بہ حرف قبول بھی ہوئی تھیں۔

پھر نہ جانے کس وقت وہ تھک کر بستر پر لیٹا تھا اور اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ دوبارہ اس کی آنکھ گھنٹی کی تیز آواز پر کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اٹھتے ہی سب سے پہلا خیال اسے لارین کا ہی آیا۔ جانے کتنی دیر سے وہ ایسی بے خبری کی نیند سو رہا تھا حالانکہ اس نے تو طے کیا تھا کہ وہ روشنی ہوتے ہی لارین کے گھر جائے گا۔ اسے انتظار تھا تو صرف اس بات کا کہ ایک دفعہ صبح ہو جائے پھر وہ کسی کی نہیں سنے گا۔ ساری رات ٹہلتے اور منصوبے بناتے گزری تھی اور جیسے ہی صبح کا وقت قریب آیا وہ پتا نہیں کیوں سو گیا تھا اور اب دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

جب تک وہ اٹھ کر کھڑکی تک پہنچا تھا تب تک ثبات بھائی دروازہ کھول کر باہر جاچکے تھے۔ اس نے دیکھا دروازے پر پولیس کھڑی تھی اور ثبات بھائی ان سے بات کررہے تھے۔ وہ بری طرح سے چونک گیا۔ اس نے باتھ روم میں جاکر جلدی، جلدی منہ پر پانی ڈالا اور پھر تولیے سے منہ صاف کرتا سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

نیچے پورا خاندان لاؤنج میں جمع تھا۔ شاید سب کو معلوم ہوچکا تھا کہ باہر پولیس آئی ہے۔ سب کے چہرے پریشانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''باہر نہ جانا، ثبات گیا ہوا ہے۔'' امی اسے دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر بولیں اور اسے رکنا پڑا کیونکہ دروازہ کھل رہا تھا اور ثبات بھائی واپس آتے دکھائی دیے تھے۔ ان کا چہرہ بجھا ہوا تھا اور چال سست تھی۔

''کیا ہوا...... پولیس کیوں آئی تھی؟'' سب نے یک زبان ہوکر پوچھا۔ ثبات بھائی نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بڑے تھکے ہوئے انداز میں آکر صوفے پر بیٹھ گئے۔ ان کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور آنکھیں خالی تھیں۔

''بتاؤ بیٹا، کیا ہوا ہے؟ میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔'' امی ان کے پاس آبیٹھیں۔ دل تو سبھی کا بیٹھا جارہا تھا مگر ثبات بھائی تھے کہ منہ سے ایک لفظ نہیں نکال پارہے تھے۔ فرات انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کررہا ہو۔

''وہ ایک کیس کی تحقیقات کررہے ہیں۔'' آخرکار انہوں نے اتنا ہی بتایا۔

''کیسا کیس؟ ہم سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' ثبات بھائی کی بات [illegible] مگر اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگئے تھے جیسے آگے بولنے کی ہمت نہ ہو۔

''بولتے کیوں نہیں ہو، بتاؤ ناں کون سا کیس ہے اور ہم سے کیوں پوچھنے آئے ہیں؟'' امی نے بھی ان کا کندھا ہلایا۔

''کل رات......'' گم صم کیفیت میں ان کے لب ہلے۔

''وہ دراصل......کل رات لارین نے خودکشی کرلی ہے۔''

خیر و شر، حق و باطل کی جنگ ازل سے ہے......
ایک باشعور اور باایمان شخص ایک کا ساتھ دیتا ہے دونوں کا نہیں...... وہ بھی حق کے ساتھ کھڑا تھا اور جانتا تھا کہ یہ راہ کتنی کٹھن ہے۔
اس کی آخری منزل کیا ہے یہ جاننے کے لیے پڑھیے
اگست 2025ء کا پاکیزہ

digest-library.com

چار جنگ

شمع تفسیر

Digest Novels Lovers group

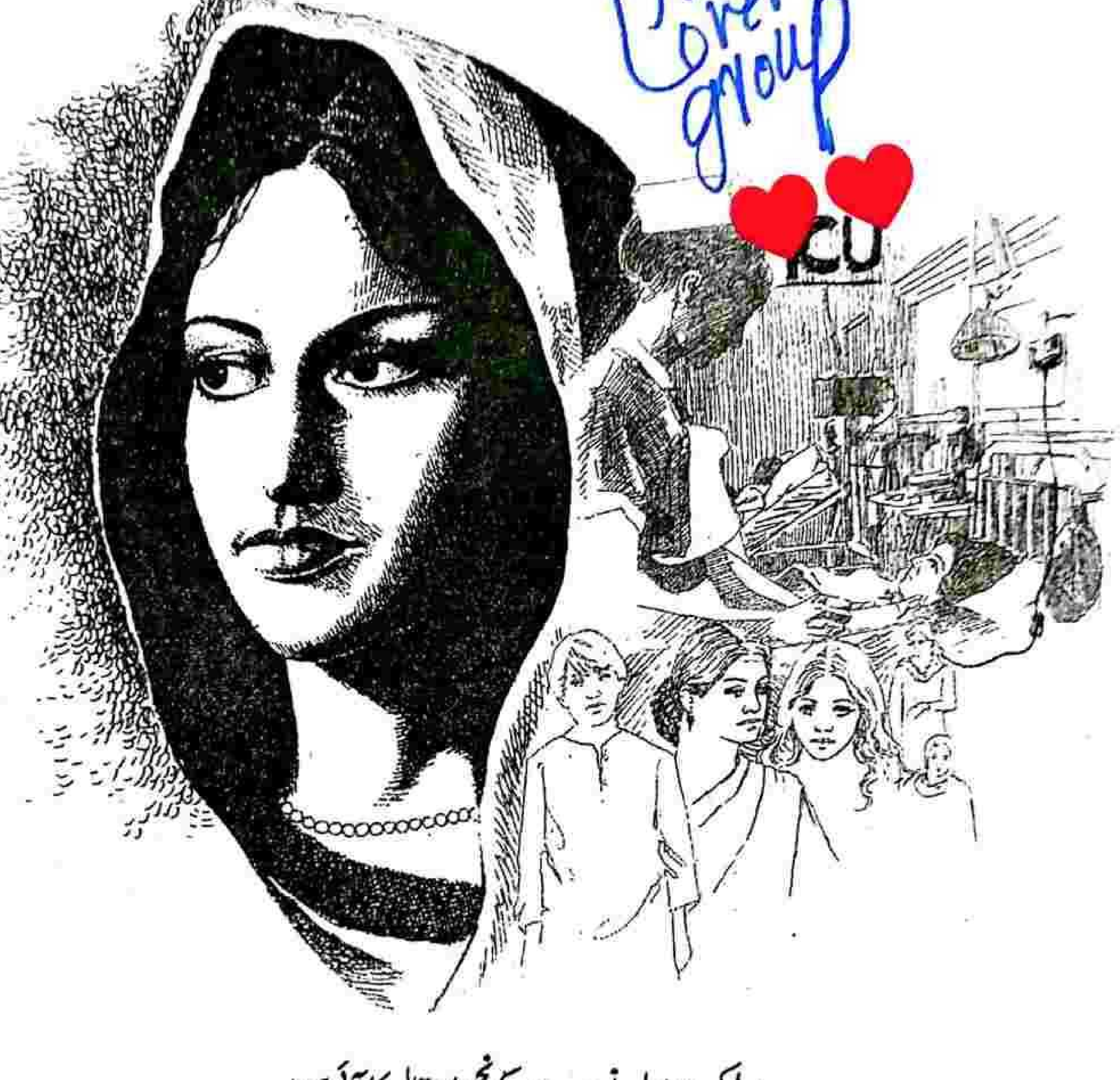

یہ ایک درمیانے درجے کے نجی اسپتال کا آئی سی یو وارڈ تھا جس کے باہر کاریڈور میں متعدد لوگ موجود تھے جو اپنے، اپنے مریضوں کی خبر گیری کے لیے آئی سی یو کے باہر ہی کھڑے رہ کر اپنے دل کی تسلی کا سامان کر رہے تھے کیونکہ اندر جانے کی اجازت فی الوقت نہیں تھی۔ ویسے بھی ایک، ایک کر کے سب کو جانے کی اجازت ملتی تھی مگر ایک خاص وقت پر۔ ان میں سے کچھ چہروں پر فکرو پریشانی تھی، کچھ نڈھال اور تھکے ہوئے تھے کچھ خوف و

اضطراب کا شکار تھے کہ پتا نہیں آنے والا وقت ان کے لیے خوشخبری لاتا ہے یا کوئی بری خبر......

مذکورہ آئی سی یو کے ایک بیڈ پر پچپن سالہ رابعہ خاتون بھی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھیں۔

تین دن قبل تک انہیں بظاہر کوئی بیماری نہیں تھی۔ بس اچانک ہی گھبراہٹ شروع ہوئی...... ساتھ ہی کمر درد...... کارڈیو بھی لے گئے اور اب وہاں کے بعد یہاں لے آئے۔ رنگ برنگے ٹیسٹ ہوئے...... ایک تو پہلے ہی خون کی کمی اور اس پر پہلے ایک اسپتال اور اب اس دوسرے اسپتال میں سرنج بھر خون نکالا گیا......

بہرحال مجبوری کا نام شکریہ...... علاج تو کروانا ہی تھا۔

رابعہ خاتون کی آل اولاد باہر کاریڈور میں پریشان حال موجود تھی۔

''امی ٹھیک تو ہو جائیں گی ناں......؟'' یہ رابعہ خاتون کی بڑی بیٹی ثانیہ تھی جو بچوں کے سے انداز میں اپنے بڑے بھائی صادق سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں، ہاں ان شاء اللہ...... امی کو ہوا ہی کیا ہے۔ بس کمر درد ہی تو ہے اور گھبراہٹ تو کمزوری سے ہو رہی ہے۔'' صادق نے ثانیہ سے زیادہ شاید خود کو تسلی دی۔

''اگر امی کو کچھ نہیں ہوا تو وہ آئی سی یو میں کیوں ہیں۔'' زرین، رابعہ خاتون کی سب سے چھوٹی بیٹی جو ابھی، ابھی ہولتی ہوئی اسپتال پہنچی تھی فکرمندی سے بولی۔

''ارے پاگل! ڈاکٹر بس اپنی تسلی کے لیے مریض کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیتے ہیں...... اور پھر بل بھی تو بنانا ہوتا ہے۔'' زرین کے شوہر ماجد نے مطمئن سے لہجے میں کہا۔

''امی نے ساری زندگی بہت محنت کی ہے ہم لوگوں کے کتنے ناز اٹھائے ہیں، اب تک کام کرتی آئی ہیں اب نڈھال سی بستر پر پڑی ہیں...... اور ہم نے ان کے لیے کیا کیا۔'' مجھلی بیٹی سحرش کہتے، کہتے رو پڑی۔

''دعا کرو اللہ سے...... روتے نہیں ہیں، دعا کرتے ہیں۔'' صادق سے چھوٹے عارف نے بہن کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''بیٹا ذرا اپنے بابا کو فون کر کے نانو کی طبیعت کا بتا دو تا کہ وہ بھی آفس سے یہیں آ جائیں۔'' ثانیہ نے اپنے بارہ سالہ بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا۔

''مما...... موبائل کی چارجنگ ختم ہو گئی ہے۔'' سنی نے ڈرتے، ڈرتے بتایا۔

''کبھی چارج بھی ہوتا ہے تمہارا موبائل...... جب ہر وقت گیم کھیلو گے تو یہی ہوگا ناں...... موبائل نہ ہوا گدھا ہو گیا۔ کبھی آرام بھی دے دیا کرو بیچارے کو۔'' ماں کے لیے جو بے انتہا فکر و پریشانی ثانیہ کے اندر بھری ہوئی تھی۔ ڈانٹ کی صورت بیٹے پر برس گئی۔

''ارے میں کر دیتا ہوں کال آپی، آپ پریشان مت ہوں۔'' عارف نے بہنوئی کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

''موبائل تو میرا بھی چارج نہیں ہے...... اصل میں امی کے کارڈیو اور پھر یہاں لانے کا سن کر اتنی پریشانی ہوئی کہ جب تک ماجد آفس سے چھٹی لے کر گھر نہیں پہنچے میں گھبرا، گھبرا کر آپ سب کو امی کی خیریت کے لیے فون کرتی رہی...... مسلسل استعمال میں ہی رہا موبائل، چارجنگ کا ٹائم ہی نہیں ملا اب بیچارہ تھک کر بند ہو گیا۔'' زرین، ثانیہ کو بتانے لگی۔

اسی اثنا میں ایک ڈاکٹر آئی سی یو سے باہر آیا تو سحرش نے تیزی سے بڑھ کر ماں کے بارے میں پوچھا۔

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، رپورٹس آنے کے بعد اصل ٹریٹمنٹ شروع ہوگا پھر ہم کچھ بتا سکیں گے۔'' ڈاکٹر نارمل انداز میں کہہ کر آگے بڑھ گیا اور یہ سب اپنی، اپنی جگہ سوچوں میں گم ہو گئے۔

☆☆☆

''میں نے بیوی کے کہنے میں آ کر امی سے بہت برا رویہ رکھا...... میں بہت برا بیٹا ہوں۔'' یہ رابعہ خاتون کا بڑا بیٹا صادق تھا جو اس وقت ضمیر کی ملامت کا شکار تھا۔ وہ خود کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا۔

''امی اکیلی بیٹھی رہتیں اور میں شازیہ کے نخرے اٹھانے میں لگا رہتا۔ اس کی فرمائش پر چیزیں لا، لا کر کھلاتا اور امی کو پوچھتا بھی نہیں تھا اور امی بیچاری گھر کا

کام بھی کرتیں اور باہر سے روز مرہ کا سودا بھی لاتیں......آہ اس عمر میں، جبھی تو اس اس حال کو پہنچ گئیں......اُف......ف تف ہے مجھ پر، کبھی ماں کو آرام دیا اور نہ ہی مان دیا۔'' آنسو پلکوں پر آ کر ٹھہر سے گئے۔

☆☆☆

اور عارف......اس کا ضمیر اور ہی انداز میں کوڑے برسا رہا تھا۔

''میرے مولا مجھے معاف کر دے'' میں کتنی زور، زور سے امی پر چیختا تھا......چھوٹی، چھوٹی باتوں پر ناراض ہو کر کھانا چھوڑ دیتا تھا۔ اور وہ میرے پیچھے کھانے کی ٹرے اٹھائے، اٹھائے خوار ہوتیں۔ بھابی کو تو کبھی توفیق ہی نہیں ہوئی، امی ہی اس عمر میں بھی میرے لیے تازہ روٹی بناتیں۔ کم از کم باہر سے سودا تو میں بھی انہیں لا کر دے سکتا تھا مگر نہیں......وہ تھک کر ہلکان ہو جاتیں اور میں آفس سے آنے کے بعد بس اپنی تھکن کا رونا لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتا، اللہ کے لیے امی مجھے معاف کر دیں، مجھے چھوڑ کر مت جایئے گا پلیز......ابو جی کے بعد اب کون ہے میرا، میری اچھی امی بس جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔'' گھٹی، گھٹی آواز اس کے منہ سے نکل رہی تھی۔

☆☆☆

''اُف بھابی، مجھ سے کتنی بڑی بھول ہو گئی، ساری عمر آپ کی سادگی کا جو مذاق بنایا سو بنایا، پرسوں جب آپ کی طبیعت خراب ہوئی تو میں نے کہا آپ ڈرامے بازی کر رہی ہیں، میرا اللہ مجھے معاف کر دے، میں نے کبھی آپ کو بڑی بھابیوں والا احترام اور مقام نہ دیا۔ ہمیشہ آپ کو غیر اہم سمجھا بس آپ صحیح ہو جائیں ورنہ یہ خلش مرتے دم تک میرے دل سے نہیں جائے گی کہ میں نے آپ کو آخری وقتوں میں بھی تکلیف پہنچائی۔'' یہ ناز بیگم تھیں رابعہ خاتون کی اکلوتی نند......

☆☆☆

اور یہ تینوں شادی شدہ بیٹیاں تھیں جو نم آنکھوں

حقیقی خوشی

ممتاز کاروباری شخصیت اور ایپل کمپنی کے چیئرمین، ارب پتی اسٹیو جابز 56 سال کی عمر میں لبلبے کے کینسر کے باعث انتقال کر گئے۔ انہوں نے 7 ارب ڈالر کی دولت چھوڑی۔ یہ ہیں ان کے چند آخری الفاظ......

''میری موجودہ حالت میں میری زندگی کامیابی کا جوہر نظر آتی ہے لیکن مجھے اپنے پاس موجود چیزوں سے زیادہ خوشی محسوس نہیں ہوتی۔ آخر میں دولت محض ایک عورت بن گئی ہے یا ایسی چیز جس کی میں عادت ڈال چکا ہوں۔

اس لمحے جب میں اپنے بستر پر لیٹا ہوں، بیماریوں اور اپنی زندگی کی فلم یاد کر رہا ہوں، مجھے احساس ہوتا ہے کہ میری ساری شہرت اور دولت موت کے سامنے بے بس اور بے معنی ہے۔ آپ کسی کو گاڑی چلانے کے لیے یا نوکر کو اپنے کام کرنے کے لیے یا ماہرین کو اپنے کاروبار کو چلانے اور مزید پیسہ اور شہرت حاصل کرنے کے لیے کرایے پر لے سکتے ہیں۔ لیکن یقیناً آپ کسی کو بھی کسی قیمت پر اپنے درد یا بیماری کو برداشت کرنے کے لیے کرایے پر نہیں لے سکتے۔ انسان جتنی بھی مادی چیزیں چاہے حاصل کر سکتا ہے لیکن ایک چیز جو کھو جانے پر کبھی واپس نہیں ملتی ہے وہ زندگی......جیسے، جیسے ہم عمر میں بڑے ہوتے جاتے ہیں ہم زیادہ سمجھدار ہوتے جاتے ہیں اور ہمیں احساس ہوتا ہے کہ چاہے گھڑی کی قیمت تیس ڈالر ہو یا تیس ہزار ڈالر، دونوں ایک ہی وقت دکھاتی ہیں چاہے ہم ڈیڑھ لاکھ ڈالر کی گاڑی چلائیں یا پندرہ ہزار ڈالر کی راستہ اور فاصلہ وہی رہتا ہے اور ہم آخر کار ایک ہی منزل پر پہنچتے ہیں۔

چاہے ہم تین سو مربع میٹر کے گھر میں رہتے ہوں یا تین ہزار مربع میٹر کے تنہائی وہی رہتی ہے۔ اور ہم چند میٹر سے زیادہ جگہ پر نہیں ہوتے۔ آپ کی حقیقی اندرونی خوشی مادی چیزوں سے نہیں آتی۔ جو آپ کے پاس ہیں......چاہیے آپ فرسٹ کلاس میں سفر کریں یا اکانومی کلاس میں اگر جہاز گر جائے تو سب مر جاتے ہیں۔ لہٰذا میں امید کرتا ہوں کہ آپ سمجھیں کہ جب آپ کی زندگی میں ایک اعلیٰ مقصد ہو اور آپ نے دوسروں کو خوش کیا ہو تو یہی حقیقی خوشی ہے۔''

انتخاب: ساجدہ ظفر، کمالیہ

کے ساتھ امی کی باتیں کر رہی تھیں۔

''بس میری امی ٹھیک ہو جائیں، اللہ پاک انہیں اپنے پیاروں کے صدقے صحت یاب کر دے میں تو انہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں گی اور خوب خدمت کروں گی۔'' ثانیہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''واقعی امی نے بہت خدمتیں کی ہیں ہماری، اتنی کم عمری میں ہماری شادیاں کر دیں کہ ہمیں تو ان کی خدمت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔'' زرین بھی افسردگی سے بولی۔

''اور جب ہم میکے آتے تھے تو کون سا ان کا خیال رکھ لیتے تھے۔ الٹا وہی ہماری دعوتوں کے لیے بازار سے سامان بھی لاتیں اور تھکی ماندی سی کچن میں چلی جاتیں۔ حد تو یہ کہ ہمارے بچوں کی فرمائشیں بھی وہی پوری کرتی تھیں۔'' سحرش نے ضمیر کی آواز کو بہنوں کی سماعتوں تک پہنچایا تو ثانیہ کی آنکھوں سے ٹپ، ٹپ آنسو گرنے لگے۔

''واقعی کتنی ان تھک محنت سے زندگی گزاری ہے ہماری ماں نے، آرام تو کیا ہی نہیں...... ابو جی کے انتقال کے بعد کتنے عرصے تک تو لوگوں کے کپڑے سیئے ہیں ہم لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے کی خاطر......'' زرین آئی سی یو وارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''اگر میں کبھی میکے آتی اور دال پکی ہوئی ہوتی تو میری پسند کے کباب لینے فوراً اسٹور پر چلی جاتی تھیں کہ میں منی کو خالی دال کیسے کھلا دوں۔'' ثانیہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''اور میرے کپڑے درزی کو دینا اور لینا اب تک امی کی ہی ذمے داری رہی اور غلط سلنے کی صورت میں میری کتنی تلخ باتیں امی نے خاموشی سے سنی ہیں۔'' زرین ایک بار پھر تاسف سے بولی۔ یک دم آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور ایک جونیئر ڈاکٹر...... صادق کی طرف بڑھا تو یہ سب قریب ہو کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''رپورٹس آ گئی ہیں مگر ہمیں افسوس ہے کہ بہت دیر ہو چکی...... آپ کی والدہ کے دونوں پھیپڑے اور ایک گردہ خراب تھا جس کی وجہ سے کمر میں درد تھا اور گھبراہٹ خون کی بے انتہا کمی سے تھی۔ اتنا کہہ کر وہ دوبارہ آئی سی یو میں چلا گیا۔

''ہائے میری تھکی ہوئی ماں...... چلی گئی۔'' سحرش نے گھٹی، گھٹی آواز میں بین کیا۔

''کیا ہوا دادی کو؟'' صادق کا سات سالہ بیٹا حسن سب کو روتا دیکھ کر پریشان ہوا۔

''بیٹا دادی کو آرام نہیں ملا ناں...... وہ بہت تھک گئی تھیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلا لیا۔'' صادق روئی ہوئی آواز میں بولا۔

''اچھا تو ان کی چارجنگ ختم ہو گئی جیسے موبائل کی چارجنگ ختم ہو جاتی ہے...... مگر موبائل تو چارج ہو جاتا ہے بابا۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''ہاں بیٹا ہم موبائل کی چارجنگ اور اہمیت پر تو بہت دھیان دیتے ہیں مگر شاید رشتوں اور انسانوں کی اتنی اہمیت نہیں رہی ہماری نظر میں کہ انہیں بھی محبت، آرام اور اہمیت کی انرجی سے چارج کر لیا جائے۔'' صادق بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا اور باقی بھائی، بہنوں کے سر ندامت سے جھکے جا رہے تھے اور کیوں نہ نادم ہوتے کہ ان سب کو یہ پتا تھا کہ امی کو اکثر کھانسی رہتی ہے اور وہ پھر بھی کاموں میں لگی رہتی ہیں مگر ان کی کھانسی کو بدلتے موسم کا شاخسانہ قرار دے کر چنداں اہمیت نہیں دی جاتی تھی اگر بروقت علاج کروا لیا جاتا تو شاید وہ اتنی تکلیف اور اذیت سے بچ جاتیں۔ جانا تو سب کو ایک نہ ایک دن اپنے خالقِ حقیقی کے پاس ہے لیکن اگر انہیں آرام کروایا جاتا اور عمر کے اس حصے میں ان کی خدمت کرنے کے بجائے اپنے لاڈ نہیں اٹھوائے جاتے تو وہ بچ جاتیں۔ صرف ایک نہیں سب اولادیں یہی سوچ، سوچ کر آنسو بہا رہی تھیں کہ ہم نے اپنی ماں کا خیال نہیں رکھا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

نقب زن

خوشبو بلوچ

Digest Novels Lovers group

وہ مئی کی ایک تپتی دوپہر تھی۔

جب تک وہ اسکول میں تھی تو پنکھے کی گرم ہوا بھی اس سخت گرمی میں خلاف معمول کچھ راحت بخش محسوس ہو رہی تھی۔ دو بجے چھٹی کی گھنٹی بجی تو وہ بھی پرس اٹھا کر چادر سنبھالتی ہوئی اسکول کے احاطے سے باہر نکل آئی۔

گیٹ سے نکلتے ہی آگ برساتے سورج کی تپش اس کے چہرے کو جھلسانے لگی۔ اس نے چلنے کی رفتار تیز کر دی تا کہ جلدی سے وہ بس اسٹاپ تک پہنچ جائے۔

اچانک اس کے قریب ایک گاڑی نے بریک لگائے۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا، وہ اس کی کولیگ شمائلہ تھی۔

”آؤ فلک! میں تمہیں بس اسٹاپ تک چھوڑ دیتی ہوں، ویسے بھی میں اسی طرف جا رہی ہوں اور آج گرمی بھی تو بہت ہے۔“ شمائلہ اور فلک دونوں ایک عرصے سے ایک ہی اسکول میں پڑھاتی آ رہی تھیں۔ اسی لیے ان میں اچھی خاصی دوستی تھی۔

کوئی عام دن ہوتے تو شاید فلک اس کی یہ پیشکش شاید قبول بھی نہیں کرتی مگر آج کی قیامت خیز گرمی اس کی برداشت سے باہر ہوتی جا رہی تھی اس لیے وہ بھی جھٹ سے دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

کار میں اے سی چل رہا تھا جس کی ٹھنڈک نے جسم کے ساتھ اس کی روح کو بھی فرحت بخش احساس سے سرشار کر دیا۔

وہ من ہی من میں اپنی اور شمائلہ کی قسمت کا موازنہ کرنے لگی۔

شمائلہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والی خوش شکل اور ماڈرن لڑکی تھی اس کے والد پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت کرتے تھے۔ عمر کے لحاظ سے شمائلہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ بی اے کرنے کے بعد اسے جلد ہی ایک نجی اسکول میں ٹیچر کی نوکری ملی تو گھر والوں کو بھی معاشی سہارا مل گیا۔

چند سالوں بعد اس کے چھوٹے بھائی کی تعلیم مکمل ہوئی تو اسے بھی ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت مل گئی جس کے نتیجے میں ان کے گھر کے مالی حالات کافی حد تک بہتر ہونے لگے تو دنیا کے ہر ماں باپ کی طرح شمائلہ کے والدین کو بھی بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر ستانے لگی۔ اور پھر وہ دن بھی جلد ہی آ گیا جب وہ صابر جو ایک فرم میں کلرک تھا کی دلہن بن کر بابل کا آنگن چھوڑ کر پیا گھر سدھار گئی۔

شمائلہ نے جلد ہی اپنی سلیقہ مندی سے اپنے گھر کو جنت بنا لیا۔ چھوٹا سا گھر، بینک سے قسطوں پر لی گئی گاڑی اور گول مٹول سے دو پیارے بچے، ان کا آشیانہ ایک مکمل مثالی گھر بن گیا۔ جبکہ فلک کی پوری زندگی جدوجہد کرتے اور قربانیاں دیتے ہوئے ہی گزر رہی تھی۔

فلک ابھی اپنے ہی خیالوں میں غلطاں تھی کہ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ بس اسٹاپ آ چکا تھا۔ اے سی کے ٹھنڈک بھرے ماحول سے نکل کر وہ سامنے کھڑی بس میں جا بیٹھی تو یوں محسوس ہوا جیسے جنت سے جہنم میں داخل ہو گئی۔ گرمی کی شدت سے اسے اور زیادہ پسینہ آنے لگا۔ ٹشو پیپر سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے سوچا۔ ”کاش شمائلہ کی طرح میرے پاس بھی ایسی ہی اے سی والی گاڑی ہوتی......!“

اچانک کنڈیکٹر کی آواز آئی۔ ”کرایہ باجی!“

اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا اس نے پرس میں سے کرایے کے پیسے نکال کر کنڈیکٹر کو تھما دیے۔ انہی سوچوں میں راستہ گزر گیا۔

گھر پہنچ کر دیکھا کہ اس کی چھوٹی بہن فضا اپنے شوہر ثاقب اور دو بچوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔

ثاقب جو اُن کا پھوپی زاد بھی تھا نے اسے دیکھتے ہی شکایات کا دفتر کھول دیا۔

”کیا بات ہے بھئی تم تو عید کا چاند ہی ہو گئی ہو! کہیں آنا جانا تو تم نے جیسے بالکل چھوڑ دیا ہے۔ نوکری کیا ہوئی تم نے تو خود کو جیسے قید ہی کر لیا ہے، اپنوں سے ملنا جلنا نہ کہیں گھومنا پھرنا۔ امی بھی کتنے ہی دنوں سے تمہیں بہت یاد کر رہی ہیں۔“

”آپ نے بالکل ٹھیک کہا ثاقب بھائی، ملازمت اور گھر کی ذمّے داریوں نے مجھے اتنا تھکا دیا ہے کہ میرا کہیں آنے جانے کو دل ہی نہیں چاہتا۔“

”ایسا نہیں کرتے فلک! کچھ وقت اپنے لیے، اپنی ذات کی خوشیوں کے لیے ضرور نکالنا چاہیے۔ تم ایک جیتی جاگتی انسان ہو کوئی روبوٹ نہیں کہ ہر وقت کام میں ہی مصروف رہو!“

”اوکے بابا اوکے! اب اپنے لیے لازمی وقت نکالا کروں گی اور خاص طور پر وقت نکال کے پھپو سے

digest library.com

ملنے بھی آیا کروں گی، بس......!‘‘

’’بس ایسے ہی خوش رہا کرو فلک! مجھے ہمیشہ تمہاری فکر رہتی ہے۔‘‘

فضا جو اسی وقت کمرے میں داخل ہوئی تھی، ان کے آخری جملے سن کر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

’’ٹھیک ہے ثاقب بھائی! میں فریش ہو کر آتی ہوں۔‘‘

وہ باہر نکلی تو غیر ارادی طور پر باورچی خانے کی طرف چلی گئی جہاں اس کی امی، فضا اور چھوٹی بہن دانیہ کے ساتھ کھانا بنا رہی تھی۔ ساتھ، ساتھ ان کی باتیں بھی جاری تھی۔

’’امی آپ کو پتا ہے ناں کہ مجھے اس کی یہ.... بے تکلفی بالکل بھی برداشت نہیں ہوتی۔‘‘ فضا خاصے تند لہجے میں بول رہی تھی۔

’’پاگل مت بنو کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہ بچپن سے ایک ساتھ پلے بڑھے ہیں؟‘‘ امی چولہے پر رکھی دیگچی کا ڈھکن اتارتے ہوئے بولیں۔

’’ہاں پتا ہے مجھے، اور یہ بھی پتا ہے کہ ثاقب بھی دل ہی دل میں اسے اپنی دلہن بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا اور پھپو بھی تصور میں اسے ہی بہو بنائے بیٹھی تھیں۔ یہ تو بس اللہ پاک کی کرنی تھی کہ ابو کا انتقال ہونے کے بعد فلک کو نوکری کرنی پڑ گئی اور آپ نے گھر کے اخراجات چلانے کے لیے اس کی شادی نہیں کروائی پھر آپ نے پھپو اور ثاقب کو زبردستی راضی کر کے میری شادی کروادی۔‘‘

فضا کی زبان شعلے اگل رہی تھی۔

’’آہستہ بولیں، کہیں ثاقب بھائی یا فلک آپی سن نہ لیں۔‘‘ چھوٹی بہن دانیہ نے تیز لہجے میں فضا سے کہا۔

’’سنتے ہیں تو سننے دو، اب میری برداشت کی حد ختم ہو گئی ہے۔‘‘

’’کیا برداشت نہیں ہوتا تم سے؟ آخر فلک نے ایسا کیا کیا ہے......! تمہارے حق پر کون سا ڈاکا ڈالا ہے؟ سر سے تمہارے ابو کا سایہ اٹھ جانے کے بعد تم لوگوں کو پڑھایا لکھایا، اپنی خوشیاں قربان کیں، تمہاری شادی کروائی اور کیا کرتی وہ تم لوگوں کے لیے...... بولو!‘‘ امی غصے سے پھٹ پڑیں۔

’’ہاں، ہاں امی! آپ کو تو اس کی ہر بات اچھی ہی لگے گی، ہر مہینے تنخواہ لا کر آپ کے ہاتھ پر جو رکھ دیتی ہے آپ کی وہ لاڈلی!‘‘ فضا زہر خند ہوئی اور تمیز و تہذیب کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں۔

’’شرم کرو فضا! تم آپی کی قربانیوں کا یہ صلہ دے رہی ہو؟ اور یہ تم امی سے کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟‘‘ دانیہ نے بہن کو سمجھایا۔

’’ہاں، ہاں! اب تم بھی مجھے ہی غلط کہنا۔ بس بہت ہو گیا، میں جا رہی ہوں اپنے گھر۔‘‘ وہ غصے سے پیر پٹختی باورچی خانے سے جانے لگی تو امی اسے روکتے ہوئے بولیں۔

’’اور یہ جو اتنا کھانا بنایا ہے، یہ کون کھائے گا؟‘‘

’’نہیں امی! بہت ہو گیا، میں اب ایک منٹ بھی یہاں نہیں رک سکتی۔‘‘

’’امی بس کھانا پیک کر کے دے دیتے ہیں اپنے گھر جا کر کھالیں گے ناں۔‘‘ دانیہ نے معاملے کی نزاکت سمجھتے ہوئے بات سنبھالی اور کھانا پیک کرنے لگی۔

باہر کھڑی فلک جس نے ساری باتیں سن لی تھیں کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا اس نے قریب ہی رکھے فریج میں سے پانی کی بوتل نکالی اور فریج کے اوپر رکھے گلاس کو اٹھا کر لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

کمرے میں پہنچ کر اس نے جلدی، جلدی گلاس میں پانی انڈیل کر پینا شروع کیا، اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ اس نے سنا وہ سچ ہے......! کیا اس کی اپنی ماں اور سگی بہن اس کے ساتھ ایسا کر سکتی ہیں؟

فضا کی زبان سے نکلے زہر آلود جملے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس کا سر چکرانے لگا اور وہ گرتے گرتے بچی۔

پانی پی کر وہ لیٹ گئی اس کی کنپٹیاں درد سے پھٹی

جا رہی تھیں۔

”کیا پھپو نے ثاقب کے لیے اس کا رشتہ مانگا تھا؟ کیا امی کی طرف سے محض اس لیے انکار کیا گیا تھا کہ گھر کا خرچا کیسے چلے گا؟“ اور یہ سب اتنی پلاننگ کے ساتھ ہوا کہ اسے کانوں کان خبر نہ ہوئی......! اسے سب سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ یہ سب کرنے والی اس کی اپنی سگی ماں تھی۔ ماں، جس کے لیے کہا جاتا ہے وہ بیٹیوں کے وہ دکھ بھی محسوس کرتی ہے جو بیٹیاں بتا نہیں سکتیں۔

یہ سب سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں بے اختیار برسنے لگیں۔

اچانک دروازہ کھلا اور دانیہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”آپی آپ یہاں بیٹھی ہیں! فضا لوگ اپنے گھر جا رہے ہیں، امی نے آپ کو بلانے کے لیے بھیجا ہے مجھے۔“

”میرے سر میں شدید درد ہے دانیہ! میں نہیں آ سکتی، امی کو بتا دینا۔ میں کچھ دیر سونا چاہتی ہوں مجھے اکیلا چھوڑ دو پلیز۔“

”اوہ......اچھا آپی میں آپ کے لیے ابھی چائے بنا کر آتی ہوں۔“ دانیہ اس کے قریب ہوتے ہوئے بولی مگر فلک نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بے رخی سے کہا۔

”نہیں، بس جاتے ہوئے دروازہ اور لائٹ بند کرتی جانا۔“

یہ کہتے ہوئے فلک نے کروٹ بدل کر آنکھوں کے اوپر بازو رکھ لیا تو دانیہ بھی لائٹ بند کر کے دروازہ بند کرتی ہوئی باہر چلی گئی۔

آج فلک کا دل شدتِ غم سے پھٹا جا رہا تھا اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دھاڑیں مار، مار کر روئے، اتنا روئے کہ اس کے اندر کے سارے دکھ اس گریہ وزاری کے سیلاب میں بہہ جائیں اور کوئی دکھ باقی نہ رہے۔

ماضی قریب کے حالات ایک، ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ ابو کی رحلت کا سانحہ، ابو کے انتقال کے بعد گھر کے دگرگوں مالی حالات، اس کا نوکری کے لیے مارا مارا پھرنا، نامساعد حالات میں ثاقب کا حوصلہ دلانا اور ہر قدم پر اس کا ساتھ دینا اور اچانک حالات کا اچانک بدل جانا اور اس کو بتائے بغیر فضا اور ثاقب کی منگنی اور پھر شادی۔ اور اسے بالکل غیر محسوس انداز میں ان سب معاملات سے بے خبر رکھنا......!

اسکول میں بھی آئے روز ساتھی اساتذہ کا اس کی بڑھتی عمر اور شادی نہ ہونے پر ہمدردی کے لبادے میں چھپے طنزیہ جملے کے نشتر اس کا جگر چھلنی کر دیتے مگر وہ ایک کان سے سن کے دوسرے کان سے نکال دیتی۔ کیونکہ وہ اپنی ماں اور بہن بھائیوں سے بے تحاشا محبت کرتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ دنیا بھر کی ساری آسائشیں ان کے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیتی اور یہ سب وہ اپنی استطاعت سے بڑھ کر کرتی بھی رہتی تھی۔

فضا کا جہیز، بھائی کو پرائیویٹ یونیورسٹی سے ایم بی اے کروانا، دانیہ کو بی اے تک تعلیم دلوانا یہ سب اس کی کوششوں سے ہی تو ممکن ہوا تھا۔

یہ سب سوچتے، سوچتے اس کا سر بہت بھاری ہو گیا اور پتا نہیں کس وقت نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ کمرے سے باہر نکلی تو سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ وہ بھی انہی کے بیچ بیٹھ گئی۔

”دانیہ بتا رہی تھی کہ تمہارے سر میں درد ہے؟ میں تمہیں دیکھنے آئی تو تم گہری نیند سو رہی تھیں، میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا اب کیسی ہو بیٹا؟“ امی نے فلک کی طرف دیکھتے ہوئے بہت پیار سے پوچھا۔

”بہتر ہوں امی۔“ اس نے امی کی طرف دیکھا۔ اسے پتا نہیں کیوں آج گھر کا ہر فرد اجنبی لگ رہا تھا یا شاید یہی ان کے اصل چہرے تھے۔

”آپی میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“ دانیہ اٹھتے ہوئے بولی۔

فلک نے اثبات میں سر ہلا کے اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر کے دیکھنے لگی۔

”فلک بیٹا گرمی کی وجہ سے سر میں درد ہو گیا ہوگا۔

Digest Library . Com

یہ موئی گرمی بھی تو غضب کی ہوگئی ہے ناں! اور اسکول سے واپسی کے وقت تو سورج آگ برساتا ہے۔ ایسے میں بس کا سفر، خدا کی پناہ.....!'' امی نے فلک سے بات کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں امی گرمی تو بہت ہے مگر نوکری بھی تو کرنی ہے، نہیں کروں گی تو کھائیں گے کہاں سے؟'' یہ کہتے ہوئے وہ...ریموٹ میز پر رکھ کر باہر چلی گئی ادھر... امی اس کے بدلے ہوئے رویے پر متعجب ہوکر اسے دیکھتی رہ گئیں۔

دوسرے دن وہ اسکول میں بھی پریشان رہی۔

شمائلہ اس سے بار، بار خاموشی اور پریشانی کی وجہ پوچھتی رہی مگر وہ خاموش رہی اس کے اندر ایک جنگ چل رہی تھی جو وہ خود سے لڑ رہی تھی۔

اسے بے شمار شکایات تھیں اپنی قسمت سے اور اپنوں سے، ان اپنوں سے جن کے لیے اس نے اپنی جوانی، اپنی ساری امنگیں دفن کر کے اپنے حصے میں حسرتیں اور اپنوں کی طرف سے فریب کی سوغات ہی پائی۔

وہ بار، بار خود احتسابی کے عمل سے گزر رہی تھی کہ زندگی کے اس پُرخار سفر میں آخر اس سے کہاں غلطی ہوئی ہے جس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اس کا من الجھ گیا تھا اس کے من میں ایک گرہ پڑ گئی تھی اور اب وہ اس گرہ کو سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اسے کہیں سے بھی کوئی سرا نہیں مل رہا تھا۔

وہ بہت الجھ گئی تھی۔

وہ پورا ہفتہ اسی ادھیڑ بن میں رہی مگر کب تک......؟ ایک روز اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا، اس کا حوصلہ جواب دے گیا، اس کی برداشت اس کا ساتھ چھوڑ گئی اور وہ شمائلہ کے سامنے رو بیٹھی۔

اسے اس وقت ایک ہمدرد کی، ایک دوست کی ضرورت تھی جس کے سامنے بیٹھ کر وہ اپنے من کے سارے دکھ بیان کر سکے اور جب شمائلہ نے اس سے اس کی ہر وقت نم رہنے والی آنکھوں اور اداسی کا سبب پوچھا تو وہ خود کو روک نہ سکی اس کی آنکھوں میں رکا ہوا

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ جولائی 2025ء کی جھلکیاں

سماج نگار
اس بڑے قلمکار کی کہانیاں پڑھتے تھے، اب ان کی سوانح حیات پڑھیں

فاتح
ہمارا فخر ہمارے ہوا باز جنہوں نے دشمنوں کو ان کی اوقات بتائی، دلچسپ تحریر

اداس نسلوں کا نوحہ گر
اس ادیب کا ذکر خاص جس نے اردو ناولوں کو نئی جہت بخشی

جام جام
فلمی دنیا سے ایک قدآور شخصیت کا چونکانے والا زندگی نامہ

جان بچا
نادانستگی میں وہ سرحد پار کر گیا، جہاں ہر قدم پر ایک نیا سانحہ منتظر تھا

زندہ مقتول
حیرت میں ڈال دینے والی انتہائی دلچسپ سچ بیانی

اس کے علاوہ
بہت سی سچ بیانیاں، سچے قصے، دلچسپ واقعات

یہ شمارہ بہت خاص ہے، ضرور ملاحظہ کریں

سیلاب امڈ آیا اور پھر اس نے اپنے سارے دکھ شمائلہ کو بتا کر من کا بوجھ ہلکا کرلیا۔

شمائلہ نے بچوں کی طرح روتی سسکتی فلک کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''فلک یہ صرف تمہارا نہیں ہر دوسرے گھر کا مسئلہ ہے، میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا کہ ایک حد تک کسی کا ساتھ دینا تو ٹھیک ہے مگر اپنی پوری زندگی کسی کے لیے وقف کردینا سراسر بیوقوفی ہے۔ اب تمہارے بہن بھائی جوان ہو گئے ہیں، اپنی اور امی کی ذمّے داریاں اٹھا سکتے ہیں۔ اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی آج بھی تم اپنے لیے سوچو، اپنی آنے والی زندگی کا سوچو۔''

شمائلہ سے اپنے دکھ درد بانٹنے کے بعد فلک کا من ہلکا ہوگیا تھا۔ اب اس کی سوچ کا زاویہ بدل گیا تھا اس نے خود پر دھیان دینا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ نت نئے کپڑے اور جوتے پہننے لگی تھی سہیلیوں کو وقت دینے لگی تھی۔

جلد ہی شمائلہ اس کے لیے ایک رشتہ لے کر آئی جو کہ اس کے شوہر کا دور کا رشتے دار بھی تھا جس کی عمر پینتیس برس کے لگ بھگ ہوگی جبکہ فلک اس وقت چالیس سال کی ہو چکی تھی۔ عمر کے اس فرق کی وجہ سے پہلے تو فلک نے انکار کر دیا مگر شمائلہ نے اسے سمجھایا۔

''فراز کو اعتراض نہیں ہے تو تم کیوں انکار کر رہی ہو؟'' شمائلہ کے سمجھانے بجھانے پر بالآخر وہ مان گئی۔

شمائلہ نے فلک کی امی سے اس کے رشتے کی بات کی انہوں نے بھی لڑکے کی عمر کے فرق اور کم آمدنی پر اعتراض کیا مگر شمائلہ کے پُرزور اصرار اور فلک کے ارادے کے آگے آخر انہیں بھی ہاں کرنا پڑی، اسی دوران فلک کے بھائی کو بھی اچھی نوکری مل چکی تھی چنانچہ گھر میں کوئی مالی پریشانی بھی نہیں رہی تھی۔

نکاح بہت سادگی سے ہوا اور فلک، فراز کی دلہن بن کر اس کے کرایے کے گھر میں آگئی۔

فراز نے اسے پلکوں پر بٹھایا، دل میں بسایا، اسے اتنا پیار دیا کہ وہ گزشتہ سارے غم بھول گئی۔

ان کی جوڑی دیکھ کر ہر کسی کو ان پر رشک آنے لگا تھا۔ فلک کو فراز نے کبھی محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ ان کی عمروں میں اتنا تفاوت ہے۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ جس نے بھی یہ کہاوت لکھی ہے خوب ہی لکھی ہے کہ ''ہر دکھ کے بعد سکھ ضرور ملتے ہیں۔'' یا ''صبر کا پھل میٹھا'' ہوتا ہے۔

وقت اپنی سُبک رفتاری سے گزرتا جا رہا تھا۔ مسرت و انبساط سے بھرے شب و روز میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا کہ شادی کو پانچ سال گزر گئے ہیں۔

فلک نے بینک سے قرضہ لے کر اپنا چھوٹا سا گھر لے لیا تھا جس کو اس نے بہت خوب صورتی سے سجا کے چھوٹی سی جنت کا نمونہ بنا لیا تھا۔

فراز اس کا حد سے زیادہ خیال رکھتا تھا، اسے کبھی کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی سوائے اولاد کے۔ اس نے فراز سے بارہا کہا کہ کوئی بچہ گود لے لیتے ہیں مگر فراز نے اسے ہمیشہ بڑے پیار سے سمجھایا کہ ''میں اللہ پاک کی ذات سے مایوس نہیں ہے نہ ہی مجھے بچہ نہ ہونے کا کوئی دکھ ہے، اگر ہمارے نصیب میں اولاد ہوگی تو ضرور ہوگی تم پریشان نہ رہا کرو۔''

فلک یہ سب سن کر مطمئن ہو جایا کرتی تھی۔

فلک نے گھر کے کام کاج کے لیے پڑوس کی ایک ادھیڑ عمر عورت ''سوہنی'' کو کہہ رکھا تھا جو آ کے اس کے گھر کی صفائی ستھرائی اور دوسرے کام کاج کر لیا کرتی تھی۔

سوہنی کا ایک سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فلک اور فراز اکثر اس کی مالی مدد بھی کر دیا کرتے تھے۔

ان پانچ سالوں میں سوہنی کی حیثیت گویا اس گھر کے ایک فرد کی سی ہوگئی تھی۔ فلک اب بے دھڑک اس پر اعتبار کرنے لگی تھی۔

فلک کے اسکول جاتے ہی سوہنی پورے گھر کی صفائی ستھرائی سمیت کھانا بھی بنا لیتی تھی کہ اب وہ اسکول سے تھکی ہاری آ کر کیا کھانا بنائے گی!

فلک، فراز کی دی ہوئی محبت اور سوہنی کے دیے ہوئے سکھ پر ہر وقت شکرِ خدا ادا کرتی رہتی تھی وہ اپنی

گزشتہ زندگی کے دکھ بھول چکی تھی۔

وہ خوش بھی اور بے حد خوش تھی کہ اچانک ایک دن اسکول میں اس کی طبیعت خراب ہوگئی۔

اپریل کا مہینہ تھا اور اچانک ہی زوروں کی گرمی پڑ رہی تھی اور شاید اسی گرمی کی وجہ سے ہی فلک کا بلڈ پریشر کم ہوگیا تھا۔

وہ پرنسپل سے آدھے دن کی چھٹی لے کر گھر آ گئی۔

گھر کی چابی اس کے پرس میں موجود تھی، گھر پہنچ کر وہ دروازہ کھول کر سیدھی باورچی خانے میں موجود فریج میں سے پانی کی ٹھنڈی بوتل نکالنے چلی گئی۔ اس نے دیکھا کہ سنک میں ناشتے والے برتن بغیر دھلے پڑے تھے اسے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔

”سوہنی تو صبح آتے ہی سب سے پہلے برتن دھوتی ہے آج کیوں نہیں دھوئے؟“

یہی سوچتی ہوئی وہ پانی کی ٹھنڈی بوتل لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو دفعتاً اسے اندر سے کسی کے آہستہ آہستہ بولنے کی آواز آئی۔ اس نے حیرت سے دروازے سے کان لگا کر سننے کی کوشش کی تو سوہنی کی جواں بیٹی زیبو کی آواز سنائی دی۔

”کچھ بھی ہو صاحب! اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوتا، آخر میں اسے کتنا برداشت کروں؟ کتنے دن، کتنے سال اس کی نوکرانی بن کر رہوں آخر؟ آپ خود سوچیں نکاح ہوا ہے ہمارا، اور نکاح کو بھی چار سال ہو چکے ہیں، ایسے ہی بغیر نکاح کے نہیں ہوں میں۔“

”ہاں، ہاں! مگر تمہیں ہر چیز مل تو رہی ہے تمہیں اور کیا چاہیے آخر؟“ فراز کی آواز آئی۔

”تم نے آخر اس بڈھی گھوڑی میں دیکھا کیا ہے جو اسے چھوڑ نہیں سکتے! مجھ سے تو اب وہ ایک منٹ بھی برداشت نہیں ہوتی۔“

”میری رانی! تم آخر سمجھتی کیوں نہیں ہو، یہ جس گھر میں تم بیٹھی ہو ناں یہ بھی اسی کا ہے، اور جس پلنگ پر لیٹی ہوئی ہو وہ بھی اسی کا ہے، اور یہ جو اے سی کی ٹھنڈی ہوا ہے ناں یہ بھی اسی کے پیسوں کی ہے جسے تم بوڑھی کہہ رہی ہو۔“

دروازے کے ساتھ کھڑی فلک یہ سب سن کے چکرانے لگی اس نے دروازے کے سوراخ سے جھانک کے دیکھا تو زیبو پلنگ پر فراز کی بانہوں کے گھیرے میں تھی جو غصے کے عالم میں خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”آخر اور کتنا برداشت کرنا پڑے گا مجھے؟ میاں بیوی ہوتے ہوئے بھی کب تک چھپ، چھپ کے ملتے رہیں گے ہم؟ آخر کب تک......! مجھ سے اب اس کا وجود برداشت نہیں ہوتا فراز! آخر تم سمجھتے کیوں نہیں ہو؟“

”کچھ سال...... میری جان صرف کچھ سال! وہ جلد ہی ریٹائرمنٹ لے لی گی۔ اس نے کہا ہے۔ جیسے ہی وہ ریٹائر ہوتی ہے اور رقم میری جیب میں آتی ہے، میں اسے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دوں گا۔ پھر صرف تم ہو گی اور میں۔ بس تھوڑا انتظار کرو۔ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے تم سمجھنے کی کوشش کرو ناں یار......!“

یہ سب کہتے ہوئے فراز نے اسے ایک بار پھر اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ فلک کی برداشت جواب دے چکی تھی وہ دروازے کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی، اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔

وقت ایک مرتبہ پھر پلٹ رہا تھا۔

اس کے کانوں میں فضا کے کہے ہوئے جملے گونجنے لگے۔

”امی اب وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی!“

زیبو کے کہے ہوئے جملے۔

”اب وہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی!“

فضا...... زیبو......!

زیبو...... فضا......!

دونوں کے کہے ہوئے جملے اس کے دماغ پر ہتھوڑا بن کر برسنے لگے۔ اچانک اس کی کنپٹی میں شدید درد اٹھا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر بم پھوڑ دیا ہو۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی کنپٹی کی طرف بڑھا اس کی آنکھوں کے آگے گہری تاریکی چھا گئی اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

۞۞۞

Digest Novels Lovers group

ناولٹ

زندگی گلزار ہے

غزالہ عزیز

تیسرا اور آخری حصہ

Digest Novels Lovers group

اگلی صبح بہت خوب صورت تھی۔ رات کی برف باری نے اگرچہ ٹھنڈ میں اضافہ کر دیا تھا مگر نیند سے بیدار ہونے کے بعد اسے بند کمرے میں بھی ہر طرف پھول ہی پھول اور محبت کی الوہی خوشبو اپنے آس پاس محسوس ہو رہی تھی۔ باہر جانے موسم کس رنگ میں رنگا تھا مگر اس کے دل کا موسم چہار سو مسحور کُن خوشبو سے مہک رہا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد اسپتال جانے سے پہلے شفا نے اس کے ہاتھ کی ڈریسنگ چینج کی تھی اور دن میں ہلکی پھلکی ایکسر سائز کرنے کو کہا تھا جبکہ وہ تو اس کے صبح کی تازگی سے زیادہ دلکش چہرے کو دیکھتے اس سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا تھا مگر مجبوری تھی۔ وہ چاہ کر بھی زیادہ دیر شفا کو اپنے سامنے روک نہیں سکتا تھا اور اس خیال سے کہ شفا نے اس کے صحت یاب ہونے پر اس کے ساتھ ڈھم ٹور کے خوب صورت علاقے کی سیر کروانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس خوش کُن خیال کے ساتھ اس نے اپنے.... بے صبرے دل کو سمجھا لیا۔

شفا اس کے اندرونی جذبات سے بے خبر خدا حافظ کہہ کر اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کر کے کمرے سے

باہر چلی گئی اور پھر دن میں اس نے شفا کے مشورے کے مطابق ہلکی پھلکی واک بھی کی جس کے باعث شام تک وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔

اگلی صبح بہت اچھی دھوپ نکلی تھی اس لیے ماحول میں بہت زیادہ ٹھنڈ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پچھلے دو دنوں میں وہ شمسہ آنٹی سے ذاتی سوالات کرنے کے لیے خود کو کافی حد تک تیار کر چکا تھا۔ شفا حسب معمول اسپتال گئی ہوئی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے موسم پر بات کر رہے تھے جبھی شاہ میر نے ہمت کر کے وہ سوال ان سے کر ڈالا جسے وہ بار، بار اگنور کرتا رہا تھا۔

''آنٹی، اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو کیا میں آپ سے آپ کی فیملی کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا ہوں؟''

جواباً شمسہ نے اسے سنجیدگی سے دیکھا۔ اس کے سوال پر وہ سوچ میں پڑ گئیں کہ وہ اسے اپنی فیملی کے بارے میں کیا بتائیں گی۔ وہ سب کچھ جو وہ اب خود سے بھی دُہرانا نہیں چاہتیں یا پھر اپنی اس پہچان اور شناخت کو جسے وہ سالوں پہلے بہت پیچھے چھوڑ آئی تھیں۔ انہیں یہ ڈر نہیں تھا کہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھیں گی تو پتھر کی بن جائیں گی۔ پتھر کی تو وہ اس وقت بھی نہیں بن سکی تھیں جب شیشے جیسی ان کی شفاف ذات پر پتھر برسائے گئے تھے۔ بس وہ پرانے اور ماضی کی کوئی بات بھی اپنے حال کی زندگی میں دُہرانا نہیں چاہتی تھیں۔

وہ جانتی تھیں کہ شاہ میر اور اسفندیار کی دوستی بہت زیادہ عرصے پر محیط نہیں تھی۔ وہ کالج، یونیورسٹی لائف کے دوست رہے تھے جبکہ ان دونوں کی فیملیز میں دوستی بہت بعد میں ہوئی اور پھر مزید مضبوط ہوتی گئی۔ شہریار آفریدی کے سرکل میں سب انہیں شہریار صاحب کی رشتے کی بہن کے طور پر ہی جانتے تھے۔ وہ کافی عرصے سے اس علاقے میں رہائش پزیر تھیں لہٰذا شہریار آفریدی کے فیملی فرینڈز میں شامل لوگوں سے ان کا ملنا جلنا بالکل بھی نہیں تھا اور اب اسفندیار کے اس دوست کے سوال پر انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ جواب میں کیا بات کریں مگر شاہ میر کی مسلسل سوالیہ نگاہوں کو دیکھ کر انہیں لگا کہ کبھی، کبھی خاموشی بلاوجہ کے شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیتی ہے لہٰذا وہ خود کو کمپوزڈ کرتے ہوئے جواباً بولیں تو شاہ میر کچھ بھی بولنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔

digest library.com

"کیا پوچھنا چاہتے ہو بیٹا؟ یہی کہ میں یہاں بیٹی کے ساتھ اکیلے کیوں رہتی ہوں، میری فیملی کے دیگر لوگ کہاں ہیں، میں کہاں سے ہوں، کب سے یہاں رہ رہی ہوں، کیوں رہ رہی ہوں؟ اپنا بزنس کر کے خود کماتی ہوں تو کوئی مرد ساتھ کیوں نہیں ہے، شہریار آفریدی اور ان کی فیملی سے میرا رشتہ کیا ہے؟"

اور وہ واقعی کچھ دیر تک تو کوئی جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ اس نے اس نہج پر تو سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کے سوال کا اس طرح کا مطلب لیں گی حالانکہ درحقیقت اس کا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا مگر شرمندگی کے احساس نے اسے چپ رہنے پر مجبور کر دیا مگر پھر اسے لگا کہ اس سے پہلے کہ وہ اس کی طرف سے بدگمانی میں مبتلا ہوں اسے ان سے معذرت کر لینی چاہیے کیونکہ وہ اس پیاری سی ہستی کو کسی بھی قیمت پر خود سے بدگمان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"آئی ایم سوری آنٹی...... آئی ایم ریئلی سوری۔ مجھے شاید یہ سوال کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں لیکن پلیز بلیومی...... میرا آپ کے یا آپ کی فیملی کے بارے میں بات کرنے کا مقصد کسی قسم کی کھوج لگانا نہیں...... نہ ہی مجھے اس بارے میں کسی قسم کا کوئی تجسس لاحق ہے بلکہ میں تو بس جب سے آپ سے ملا ہوں اپنے ذہن میں الجھی گتھی کو سلجھانا چاہتا تھا جو بار، بار آپ سے مل کر آپ کا خلوص اور اپنائیت کا احساس مجھے سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔ آپ کی ذات کے حوالے سے کسی بہت پیاری ہستی کی یاد بار، بار میرے ذہن پر دستک دیتی تھی، بس اسی کشمکش میں مبتلا رہا ہوں کہ کچھ باتیں محض اتفاق ہوتی نظر آتی ہیں مگر ہمیشہ ہی اتفاق نہیں ہوتی ہیں۔"

شاہ میر کی وضاحتیں سن کر انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے مگر اگلے لمحے احساس ہوا کہ وہ کن اتفاقات کی بات کر رہا ہے۔ کبھی، کبھی کچھ اتفاقات کے پیچھے وہ حقیقت چھپی ہوتی ہے جسے ہم اتفاق سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیتے ہیں مگر وہ سچائی ایک دن سامنے آ کر ہی رہتی ہے۔

شمسہ کے چہرے کے تاثرات میں تغیر برپا ہوا اور کچھ لمحوں کے لیے وہ بالکل گنگ سی اپنی جگہ بیٹھی شاہ میر کا چہرہ تکنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں شاہ میر نے خود ہی اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔

"میں کراچی میں رہتا ہوں، وہیں پیدا ہوا۔ ہم دو بھائی ہیں، ہمارا فیملی بزنس ہے، لیدر کی امپورٹ ایکسپورٹ کا جسے پاپا اور اب میرے بڑے بھائی سمیر مل کر چلاتے ہیں۔ میرے پاپا کا نام فرجاد احمد اور مما کا نام فاخرہ جہاں ہے اور ہمارے ساتھ ہمارے چچا، چچی اور ان کی بیٹی......"

وہ کچھ اور بھی بتا رہا تھا مگر شاہ میر کے اس تعارف نے ان کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔ جیسے، جیسے وہ بولتا جا رہا تھا شمسہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہوتی جا رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ اور سنتیں وہ اپنے ہاتھ میں لرزتے کافی مگ کو جلدی سے سامنے رکھی میز پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آئی ایم سوری بیٹا...... لیکن ابھی مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔ ہم اس بارے میں صبح بات کریں گے، تمہیں بھی اب سونا چاہیے، رات کافی ہو گئی ہے۔"

اور شاہ میر کو لگا جیسے اس سے واقعی بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ اس نے اس مہربان ہستی کو خود سے بدظن اور ناراض کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ معذرت کرنے کے لیے کچھ بولتا وہ وہاں رکے بغیر انیکسی کی جانب بڑھ گئیں اور پیچھے چیئر پر اپنی جگہ بیٹھا شاہ میر شرمندگی و پچھتاوے کی اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆☆☆

"آپ میرے بارے میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں بھابی! خدا کے واسطے میرا یقین کریں، میں اماں جان کی اس سوچ اور ارادے سے بالکل بے خبر ہوں اور اگر جانتی بھی تو میرا جواب ہر صورت میں انکار ہی ہوتا۔ میں...... میں فرجاد بھائی کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں انہیں اپنا سگا بھائی سمجھتی ہوں۔ وہ تو کیا میں کسی بھی دوسرے شخص کو سجاد کی جگہ کبھی نہیں دے سکتی نہ ہی ان کے جانے کے بعد مجھے کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ میرے لیے میرے اللہ کا ساتھ اور میری بیٹی ہی کافی ہیں۔ اس کے سوا مجھے کسی کے سہارے یا ساتھ کی ضرورت نہیں اور آپ مجھ پر اتنا بڑا الزام لگانے کی کوشش بھی مت کیجیے گا ورنہ...... ورنہ میں برداشت نہیں کروں گی۔"

فاخرہ جہاں کے الزام نے شمسہ کو ناگوار ہی نہیں دکھ اور اذیت میں بھی مبتلا کر دیا تھا مگر وہ پھر بھی ان کی تسلی

Digest Library.com

کے لیے انہیں وضاحتیں دے رہی تھیں مگر سامنے کھڑی بدگمان عورت کا تو جیسے خون ہی سفید ہو گیا تھا یا پھر وہ کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکی تھیں۔ انہیں شمسہ کی معصومیت اور سچائی پر ذرا اعتبار نہیں آیا تھا اور وہ سوکن کے جلاپے کے سلگتے احساس کے ساتھ زہریلے لہجے میں ناگن کی طرح پھنکارتی بولیں۔

”بس کرو شمسہ...... مجھے زیادہ بیوقوف سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ارے اماں جان کو کیا پڑی ہے جو وہ ایک شادی شدہ دو بچوں کے باپ کا دوسرا نکاح پڑھوانے کی بات کریں۔ یقیناً تم نے ہی اپنے اس معصوم اور خوب صورت چہرے کو ڈھال بنا کر جیٹھ کو لبھانے اور ان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی ہوگی، تب ہی تو فرجاد کو چھوٹے بھائی کی بیوہ اور یتیم بچی سے ضرورت سے زیادہ ہمدردی کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ اسی لیے فرجاد نے ہی ہمدردی میں آکر بیوہ بھاوج اور یتیم بھتیجی کو سہارا دینے کے لیے اماں کے سامنے تمہارے ساتھ نکاح کی بات کی ہوگی۔“

اور معصوم، پاکیزہ کردار کی مالک شمسہ نے تڑپ کر اس جھوٹے الزام پر جیٹھانی کو دیکھا مگر ان کی زہر اگلتی زبان کو پھر بھی بریک نہیں لگا تھا۔ وہ اذیت و دکھ میں مبتلا کھڑی شمسہ کے وجود کو مزید نیل و نیل کرتے الزامات کی سنگ باری کرتی رہیں تا کہ شمسہ کے وجود کو توڑ کر چکنا چور کر دیں۔

”میں تم جیسی معصوم صورتوں کے پیچھے چھپے گھناؤنے اور گھٹیا کردار کی مالک عورتوں کی فطرت کو اچھی طرح جانتی ہوں لیکن یاد رکھنا...... میں تمہیں تمہارے اس ناپاک ارادے میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ میں تمہیں اب ایک پل کے لیے بھی اس گھر میں برداشت نہیں کروں گی۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری...... تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکال باہر کروں گی، کیا سمجھیں......“

اور شمسہ جو ابھی شوہر کی ناگہانی و حادثاتی موت کے صدمے سے بھی باہر نہیں آئی تھیں جیٹھانی کی زبان سے اتنے جھوٹے اور گھناؤنے الزامات سن کر اذیت و دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتی چلی گئیں۔ انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح اس عورت کی شدید غلط فہمی اور بدگمانی کو دور کرنے کی کوشش کریں جو سجاد کی زندگی میں انہیں دیورانی سے زیادہ چھوٹی بہن سمجھنے کے دعوے کیا کرتی تھیں۔ آج اس بہن کی ذات اور کردار پر رکیک الزام لگانے سے گریز نہیں کر رہی تھیں۔ انہوں نے بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر ایک بار پھر فاخرہ جہاں کو یقین دلانے کی سعی کرنا چاہی، اپنے بے قصور ہونے کا اعتبار دلانا چاہا۔

”خدا کے واسطے فاخرہ بھابی...... آپ تو اتنے سالوں سے میرے ساتھ رہ رہی ہیں، مجھے اچھی طرح جانتی بھی ہیں پھر کس بنیاد پر اتنا گھٹیا الزام لگا رہی ہیں مجھ پر۔ اگر میری بات کا یقین نہیں ہے تو آپ اماں جان اور فرجاد بھائی سے خود تصدیق کر لیں۔ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا اللہ گواہ ہے میں نے فرجاد بھائی کو ہمیشہ سگے بڑے بھائی جیسا احترام دیا ہے۔ وہ بھی مجھے ہمیشہ چھوٹی بہن جیسا مان دیتے رہے ہیں۔ آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ بولتے، بولتے روہانسی ہو گئیں تب ہی اونچی آواز کے شور سے شفا اور شامی جو لاؤنج میں قریب ہی کھیل رہے تھے وہاں آکر کچن کے باہر کھڑے ہو کر ڈرے سہمے سے روتی ہوئی شمسہ اور غصے میں تیوریاں چڑھائے فاخرہ کو دیکھنے لگے۔ شفا کافی چھوٹی تھی، چھ، سات سال کی جبکہ شاہ میر نو، دس سال کا تھا جسے اپنی مما کے اس سخت اور کھردرے رویئے اور روپ کو دیکھ کر غصہ آرہا تھا کیونکہ ماں کو روتے دیکھ کر شفا بھی گھٹی، گھٹی آواز سے رونے لگی تھی جانے فاخرہ جہاں کے دماغ میں کیا خناس سمایا تھا۔ وہ تو اپنے حواسوں میں نہیں رہی تھیں۔

”ہرگز نہیں، میں اتنی آسانی سے تمہارے جھوٹے بہانوں کے فریب میں نہیں آنے والی ہوں۔ بغیر کسی وجہ کے اماں جان اتنا بڑا فیصلہ میری مرضی کے بغیر کبھی نہیں کر سکتیں اور نہ ہی میں ان کو اپنے ساتھ یہ زیادتی کرنے دوں گی۔ وہ تمہاری اور تمہاری یتیم بیٹی کی ہمدردی میں مجھ پر سوتن کا عذاب مسلط نہیں کر سکتیں لیکن اس سارے فساد کی جڑ تمہارا یہ منحوس وجود ہے۔ خود تو اپنے شوہر کو کھا گئی ہو اور اب میرے سر کے تاج کو اپنے سر پر سجانے کے خواب دیکھ رہی ہو۔ میں تمہیں اس میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دوں گی۔ نہ اس گھر میں تم ماں بیٹی کا وجود رہے گا اور نہ ہی اماں اور فرجاد کے اندر تم ماں، بیٹی کے لیے ہمدردی اور ترس کے مروڑ اٹھیں گے۔ تم ماں بیٹی کو ابھی اور اسی وقت اس گھر سے ہمیشہ کے لیے کہیں بہت دور دفع ہو جانا ہوگا تا کہ کوئی تم تک کبھی پہنچ نہ سکے ورنہ یاد رکھنا میں تمہیں اور تمہاری بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے گلا دبا کر مار ڈالوں گی۔“ فاخرہ جہاں

Digest Library.com

نے غضب ناک لہجے میں دھمکا کر آگے بڑھ کر شمسہ کی نازک کلائی کو اپنے مضبوط ہاتھ میں جکڑا تو وہ درد سے کراہتی حواس باختہ ہو کر بے یقینی سے ان کے اس بھیانک اور دوغلے روپ کو دیکھتے ہوئے اندر تک دہل سی گئیں۔ انہیں خود سے زیادہ اپنی معصوم بیٹی کی پروا تھی اور فاخرہ جہاں...... کے سر پر تو آج جیسے خون ہی سوار تھا۔

شمسہ نے خود کو فاخرہ کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کرتے روہانسے لہجے میں التجا کی۔

''آپ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں بھابی...... میں اپنی معصوم بچی کو لے کر کہاں جاؤں گی، یہ میرا بھی گھر ہے بھابی، آپ مجھے یہاں سے بے دخل نہیں کر سکتیں۔''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتیں، فاخرہ نے بھاری ہاتھ سے ان کے گال پر زوردار تھپڑ جڑ دیا اور شمسہ لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گریں مگر کچن کی سلیب کا سہارا لے کر خود کو گرنے سے بچالیا۔ شفا یہ منظر مزید نہیں دیکھ سکی۔ وہ روتی ہوئی دوڑ کر شمسہ کی ٹانگوں سے آ کر لپٹ گئی جبکہ شاہ میر ماں کے اس جلاد روپ کو دیکھ کر غصے سے آگے بڑھا۔

''یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے مما...... آپ چچی جان سے جھگڑا کیوں کر رہی ہیں اور آپ نے ان کو کیوں مارا...... آپ بہت گندی ہیں مما...... میں آپ سے بھی بات نہیں کروں گا، میں دادو اور پاپا سے آپ کی شکایت کروں گا۔''

یک دم ہی فاخرہ کو وہاں شاہ میر اور شفا کی موجودگی کا احساس ہوا تو انہوں نے گھبراہٹ میں معاملہ گھر کے دوسرے افراد تک پہنچ جانے کے ڈر سے شمسہ اور شفا کو اسی وقت گھر سے نکال دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس سے اچھا موقع انہیں دوبارہ نہیں مل سکتا تھا۔ فرجاد، اماں جان کو چیک اپ کے لیے اسپتال لے کر گئے ہوئے تھے جبکہ سمیر اسکول گیا ہوا تھا۔ وہ اس موقع کو کسی بھی قیمت پر گنوانا نہیں چاہتی تھیں۔ اماں جان ہارٹ پیشنٹ تھیں اور فاخرہ جہاں کو یہ ڈر تھا کہ اپنی بیماری کا واسطہ دے کر اماں جان کہیں فرجاد کو شمسہ سے نکاح کرنے کے لیے زبردستی بلیک میل کر کے اپنی بات ماننے پر مجبور نہ کر دیں۔ انہیں اس وقت شاہ میر پر بھی بہت غصہ آ رہا تھا جو نہ جانے کہاں سے آ کر اس سارے معاملے کا گواہ بن بیٹھا تھا اوپر سے سارے گھرانے کی طرح ان ماں، بیٹی کا بھی پکا حمایتی تھا۔ اسی لیے انہوں نے پہلے شاہ میر کو وہاں سے ہٹانے کا فیصلہ کیا، بعد میں اسے ڈرا دھمکا کر چپ کروا سکتی تھیں اسی لیے غصے سے اس کا بازو سختی سے پکڑ کر ملامتی لہجے میں بولیں۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو، چلو اپنے روم میں۔'' وہ شاہ میر کو وہاں سے زبردستی گھسیٹتے ہوئے لے جانے لگیں مگر جاتے، جاتے شمسہ کو وارننگ دینا نہیں بھولیں۔

''اور تم...... بہتر ہو گا کہ ابھی اور اسی وقت اپنا ضروری سامان اٹھا کر ہمیشہ کے لیے یہاں سے دفعان ہو جاؤ ورنہ یاد رکھنا اگر میں تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکی تو تمہاری اس بیٹی کو تو اپنے ہاتھوں سے مار دوں گی...... سمجھیں تم۔''

وہ غصے سے غراتی ہوئی شاہ میر کو گھسیٹتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں جو غصے اور بے بسی سے شور مچاتے خود کو چھڑانے کی سعی کرتے روتی ہوئی شفا کو پلٹ، پلٹ کر دیکھتے ہوئے فاخرہ کی گرفت میں پوری جان سے مچل رہا تھا اور فاخرہ اسے گھسیٹتے ہوئے کچن سے باہر لے جا کر اس کے کمرے میں بند کر چکی تھیں جبکہ آنے والے برے وقت سے انجان معصوم شفا خوف سے تھر، تھر کانپتی، روتی ہوئی ماں کی ٹانگوں سے لپٹی سہمی کھڑی تھی...... اور شمسہ کو تو جیسے سکتہ سا ہو گیا۔ جیٹھانی کا یہ خوفناک روپ انہوں نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔ اپنی راجدھانی کے چھن جانے کا ڈر اور سوتن کے وجود کے حقیقت میں بدل جانے کے خوف نے انہیں جلتے انگاروں میں دھکیل دیا تھا جیسے...... وہ کسی بھی قیمت پر انہیں اور ان کی بیٹی کو اپنی گرہستی سے ہمیشہ کے لیے دور کر دینا چاہتی تھیں۔

شمسہ کو آج پتا چلا تھا کہ بظاہر ان سے بہت پیار والا لگاؤ دکھانے والی عام سی شکل صورت کی مالک فاخرہ جہاں دراصل ہمیشہ سے شمسہ کی خوب صورتی، ان کی پُرکشش اور پُراعتماد شخصیت اور پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق رکھنے سے اندر ہی اندر حسد و جلن کا شکار رہی تھیں۔ خود تو وہ بمشکل انٹر تک تعلیم حاصل کر سکی تھیں... پڑھے لکھے اور خوش شکل فرجاد کی بیوی تو وہ صرف اماں جان کی سگی بھتیجی ہونے کی وجہ سے بن گئی تھیں مگر شمسہ کے وجود سے شاید ہمیشہ سے ہی عدم تحفظ کا شکار رہی تھیں اور اب دیور کی ناگہانی موت کے بعد ساس کی خواہش جان کر یہ عدم تحفظ کا احساس انہیں انسانیت کے درجے سے بھی گرنے پر مجبور کر گیا تھا۔

شمسہ کوئی ان پڑھ، جاہل یا کمزور عورت نہیں تھیں مگر

digest library.com

معصوم بیٹی کے وجود کی بقا کے خیال نے انہیں بزدل بنا دیا تھا، کیا کرتیں، اگر میکے میں کوئی مضبوط سہارا موجود ہوتا تو فاخرہ جہاں کی اصلیت جاننے کے بعد وہ اس گھر میں خود ہی رہنا گوارا نہیں کرتیں لیکن روڈ ایکسیڈنٹ میں انہوں نے شوہر کو ہی نہیں اپنے باپ جیسے بڑے اکلوتے بھائی کو بھی کھو دیا تھا۔ اس روز بینک سے واپسی پر حج کے لیے درخواست جمع کروانے والے شمسہ کے بڑے بھائی شیراز حسن بھی سجاد کے ساتھ گاڑی میں موجود تھے اور خوفناک حادثے نے دونوں کی ہی موقع پر جان لے لی تھی۔ شمسہ کی بھابی دونوں بچوں کو لے کر اپنے میکے چلی گئی تھیں اور بعد میں ماں، باپ کا بنایا آبائی مکان بیچ کر شمسہ کو ان کا شرعی حصہ دے کر وہ دونوں بیٹوں کو لے کر بڑے بھائی کے پاس کینیڈا اسٹیل ہو گئیں۔ انہیں جوان ہوتے بیٹوں کا مستقبل اسی طرح محفوظ بنانے کا موقع ملا تھا جسے وہ گنوانا نہیں چاہتی تھیں۔ شمسہ تو اپنے سسرال میں جان چھڑکنے والی ساس کے زیرِ سایہ بیٹی کے ساتھ بہتر زندگی گزار رہی تھیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ بیوہ ہوتے ہی سسرال میں فاخرہ جہاں کے ہاتھوں ان بیچاری بیوہ عورت کے ساتھ یہ سلوک ہوگا۔

ہوسکتا تھا کہ اماں جان واقعی اپنی بیماری کو جواز بنا کر فرجاد کو مجبوراً اپنی خواہش پر عمل پیرا کرانے پر مجبور کر دیتیں اور اب جب فاخرہ جہاں کے عزائم کھل کر ان کے سامنے آ گئے تھے، شمسہ نے بیٹی کے تحفظ کی خاطر اس گھر کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ فاخرہ بھابی کا جو روپ انہوں نے آج دیکھا تھا اس کے بعد شمسہ کو لگا کہ وہ عورت ان ماں، بیٹی کو کوئی جانی نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔ وہ صرف ایک چھت اور دو وقت کی روٹی کی خاطر ساری زندگی اس گھر میں رہتے فاخرہ کی چبھتی اور مشکوک نظروں کا سامنا کرتے نہیں گزار سکیں گی۔ اس وقت انہیں یہی مناسب لگا کہ ساس اور جیٹھ کے گھر واپس آنے سے پہلے ہی وہ شفا کو لے کر فاخرہ کے خطرناک وجود کے سائے سے ہمیشہ کے لیے دور چلی جائیں۔

البتہ اس گھر کو خیرباد کہنے سے پہلے شمسہ نے اپنا سارا زیور اور کیش کے ساتھ ضروری ڈاکیومنٹس بھی اپنے ساتھ رکھ لیے تھے جس سے فاخرہ جہاں کو کوئی سروکار نہیں تھا۔ انہیں بس شمسہ اور ان کی بیٹی کو اس گھر سے دور کرنا تھا۔ انہوں نے شمسہ کے سامان کی جانچ پڑتال میں وقت ضائع کرنے کی غلطی نہیں کی۔ اگر فرجاد اور اماں جان عین وقت پر گھر پہنچ جاتے تو ان کی ساری پلاننگ برباد ہو جاتی تھی۔ چوکیدار اور مالی کو تو انہوں نے صبح ہی کسی کام سے گھر سے روانہ کر دیا تھا مگر اس ساری کارروائی کا چشم دید گواہ ان کا اپنا بیٹا شاہ میر موجود تھا جسے انہوں نے کم عمر اور ناسمجھ جان کر نظرانداز کر دیا تھا جس نے شفا اور شمسہ چچی کو اپنے سامان کے ساتھ اپنے بند کمرے کی کھڑکی سے جو لان میں کھلتی تھی، گھر کے گیٹ سے باہر جاتے روتی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ کمرے کا بند دروازہ کھولنے کے لیے ماں کو آوازیں بھی دیتا رہا مگر اس بے حس عورت نے معصوم بچے کے رونے، چیخنے کی کوئی پروا نہیں کی۔ اگر وہ کمرے سے باہر بھی ہوتا تو وہ ماں کی زبردستی کے سامنے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری جانب شمسہ نے گھر سے نکل کر ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔ وہ رات ہونے سے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچنا چاہتی تھیں اور ابھی صبح تھی۔ بیچ میں کافی وقت پڑا تھا۔ ایبٹ آباد میں ان کے ننھیالی رشتے دار رہتے تھے اس لیے شمسہ نے وہیں جانے کا فیصلہ کیا۔

شمسہ کے گھر سے چلے جانے کے بعد فاخرہ نے شاہ میر کے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور اسے سختی سے دھمکایا تھا کہ اگر اس نے دادی یا باپ کو کچھ بتانے کی کوشش کی تو وہ اسے پھر سے کمرے میں بند کر دیں گی۔ معصوم شاہ میر اس وقت ماں کی ڈانٹ ڈپٹ اور غصے سے سہم گیا تھا۔

دوسری طرف شمسہ کو ایبٹ آباد کے اس علاقے تک پہنچتے رات ہو گئی، اوپر سے بارش بھی ہو رہی تھی لہٰذا شمسہ نے آگے کا سفر کرنے کے بجائے رات کے اندھیرے اور موسم کی خرابی کے باعث قریبی ریسٹ ہاؤس میں رات بھر ٹھہرنے کے لیے پناہ مانگی تھی۔ شہریار آفریدی نیک دل اور عورتوں کی بہت عزت کرنے والے انسان تھے۔ انہوں نے اس مشکل وقت میں ایک اکیلی، بے سہارا عورت کو اپنی انیکسی میں بیٹی کے ساتھ رہنے کے لیے عارضی پناہ دے دی مگر جب صبح سارے حالات کا شمسہ کی زبانی علم ہوا تو انہوں نے شمسہ کو بہن کہتے ہوئے ان کے سر پر ہاتھ رکھتے انہیں یہیں انیکسی میں مستقل رہائش دے دی۔ وہ جب تک چاہیں یہاں رہ سکتی ہیں یا جہاں بھی وہ اپنے رشتے داروں کے پاس جانا چاہیں گی تو وہ ان تک

پہنچادیں گے کیونکہ یہاں ان کے ریسٹ ہاؤس میں سیزن کے دنوں میں ٹریولنگ کی غرض سے آنے والے مقامی سیاح فیملیز کے ساتھ ٹھہرتے تھے۔ انیکسی تو ذاتی استعمال کے لیے خالی رہتی تھی اور شمسہ نے اس مہربانی کا شکریہ ادا کرتے ایبٹ آباد اپنے ننھیالی رشتے داروں کے پاس جا کر اُن پر بوجھ بننے کے بجائے یہیں پر رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگرچہ ریسٹ ہاؤس کے انتظامی معاملات کو دیکھنے کے لیے ضروری اسٹاف اور منیجر بھی موجود تھا مگر انہوں نے شمسہ کے پڑھے لکھے اور اچھے گھرانے سے تعلق رکھنے کا جان کر انہیں یہ ذمے داری دے دی تھی کہ وہ ان کی غیر موجودگی میں ریسٹ ہاؤس اور اس کے اسٹاف کی دیکھ بھال وغیرہ اپنی نگرانی میں رکھیں گی اور شمسہ نے خوش دلی سے یہ ذمے داری قبول کر لی تھی۔

شہریار آفریدی تو کافی پہلے شہر جا کر بس گئے تھے، ان کا کاروبار بھی وہیں سیٹل ہو چکا تھا۔ وہ سال میں ایک دو بار ہی ڈھمر... کا... لگاتے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں ریسٹ ہاؤس کے انتظامی معاملات ... زمین ہی دیکھتے تھے مگر اب انہوں نے شمسہ کو اپنے رشتے کی بہن ... کر کے انہیں مزید معتبر کر دیا تھا تاکہ ریسٹ ہاؤس کے اسٹاف کے ساتھ، ساتھ ارد گرد رہنے والے لوگ بھی شمسہ کو تنہا سمجھ کر تنگ کرنے کی کوشش نہ کریں۔ انہوں نے شمسہ سے اپنے ساتھ کراچی چلنے کی بھی بات کی تھی جہاں ان کی بہت بڑی کوٹھی تھی لیکن شمسہ نے انہیں منع کر دیا۔ وہ یہیں رہنا چاہتی تھیں لہٰذا شہریار آفریدی نے پھر اصرار نہیں کیا البتہ چھٹیاں گزار کر واپس جاتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کے انتظام والصرام کی ذمے داری شمسہ کو سونپ گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد کچھ عرصے تک شمسہ اپنے ساتھ لائی کیش رقم سے اپنے اور شفا کے اخراجات پورے کرتی رہیں پھر انہوں نے شفا کی ذہنی حالت کے پیشِ نظر کوئی جاب کرنے کے بجائے قریب میں ہی چھوٹی سی بیکری کھولنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے کالج لائف میں کوکنگ اور بیکنگ کے کورسز کر رکھے تھے تاکہ وہ گھر پر شفا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ رہ کر ٹائم گزار سکیں جو کراچی سے آنے کے بعد ہر وقت ڈری سہمی اور خوفزدہ سی رہتی تھی مگر شمسہ نے اپنی ہمت وحوصلے اور محنت سے نہ صرف اسے اس ذہنی وجذباتی برے فیز سے باہر نکالا بلکہ اس کے اچھے مستقبل کے لیے اسے بہترین تعلیمی اداروں سے اعلیٰ تعلیم بھی دلائی تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر زندگی میں آنے والے ناگہانی مصائب اور آزمائشوں کا مقابلہ کر سکے اور اتنے سالوں کی محنت و جدوجہد کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر سرخرو ہوئی تھیں مگر دوبارہ پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا، نہ ہی پیچھے رہ جانے والوں سے کوئی رابطہ یا خبر رکھی تھی۔ وہ زندگی کا یہ تلخ باب اپنے ہاتھوں بند کر چکی تھیں اور سب کچھ بھول کر زندگی میں آگے بڑھ گئی تھیں۔ البتہ ماضی کی ان تلخ یادوں کا سفر انہوں نے رات بھر جاگتی آنکھوں میں کاٹ دیا۔

وہ تو سب کچھ بھلا کر زندگی میں آگے بڑھ گئی تھی مگر ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے والے اس اجنبی مسافر نے ان کے ماضی کے زخموں کو پھر سے تازہ کر دیا تھا۔ وہ سب کچھ یاد آ جانے پر آج بھی فاخرہ بھابی کی خود غرضی اور ظالمانہ جبر کو بھولی نہیں تھیں اور وہ لڑکا جو پہلی ملاقات سے ہی شمسہ کو اپنائیت ومانوسیت کا احساس دلاتا رہا تھا، وہ احساس و جذبات محض اتفاق نہیں تھے۔ شاہ میر کی زبان سے پچھلی رات اس کی فیملی کے بارے میں جاننے کے بعد اس الجھن اور گمان کے سارے الجھے دھاگے بھی خود بخود سلجھتے ... بار اس لڑکے سے ملنے، اس سے باتیں کرنے اور اس کے نام ... جاننے کے بعد وہ اسے اتفاق سمجھ کر ذہن سے جھٹک ... اس اپنائیت بھرے احساس کی حقیقت کا پردہ بھی آج چاک ہو گیا تھا۔ وہ کوئی اجنبی نہیں بلکہ ان کے شوہر کا سگا بھتیجا اور ان ہی کا خون بھی تھا جو بچپن میں شمسہ سے بہت محبت اور لگاوٹ رکھتا تھا۔ اپنے پورشن سے زیادہ اوپر ان کے پورشن میں پایا جاتا، شفا کے ساتھ مل کر کھیلتا اور شمسہ سے ان کے کچن میں کھڑے ہو کر نت نئے بیکری آئٹمز بنانے کی فرمائشیں کیا کرتا تھا۔ جو شاید آج بھی ان کے ہاتھ کے ذائقوں کو نہیں بھولا تھا اور بار، بار ان کی بیکنگ اور کوکنگ کی تعریفیں کرتا رہا تھا۔ اب اس کی حقیقت جان کر وہ خوش بھی تھیں اور فکرمند بھی...... لیکن پھر انہوں نے اسے ساری سچائی بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

صبح کاذب کا اجالا پھیلنے کو تھا، قریبی مسجد سے مؤذن کی پکار ”اللہ اکبر“ کی صدا سن کر شمسہ نے بیڈ پر سوئی بے خبر سی شفا کو دیکھا۔ وہ اس کے جاگنے سے پہلے

digest library.com

ہی اس کے کسی بھی ممکنہ سوال جو اُن کی آنکھوں میں رت جگے کی صورت جھلکتے، شفا کے لیے کسی ذہنی پریشانی کا باعث بنتا۔ وہ اس کے سوالوں سے بچنے کے لیے آہستگی سے بیڈ سے اتر کر نماز کے لیے وضو کرنے چلی گئیں۔

☆☆☆

شاہ جہاں لاج میں اوپر نیچے پورشنز میں ان کے دونوں بیٹے فرجاد اور سجاد اپنی، اپنی فیملیز کے ساتھ مقیم تھے۔ فرجاد کے دو بیٹے سمیر اور شاہ میر تھے جبکہ سجاد اور شمسہ کی بیٹی شفا تھی۔ ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ فرجاد اور سجاد دونوں مل کر فیملی بزنس کرتے تھے۔ شمسہ پڑھی لکھی اور خوب صورت لڑکی تھی جو سجاد کے دوست کی بہن تھی البتہ فاخرہ دبتی ہوئی رنگت کے ساتھ عام سے نقوش کی مالک عام سی صورت کی حامل خاتون تھیں جن کی تعلیم بھی کچھ زیادہ نہیں تھی جبکہ شمسہ اپنی تعلیم اور کوکنگ، بیکنگ کے ہنر میں بھی طاق ہونے کے باعث گھر بھر کے افرادِ خانہ کی ہی نہیں بچوں کی بھی ہردلعزیز ہستی تھیں۔ اگرچہ گھر میں ان جیٹھانی، دیورانی کے درمیان کوئی مقابلے بازی والی فضا قائم نہیں تھی لیکن ہر جگہ شمسہ اپنے مخصوص رکھ رکھاؤ اور تعلیم و ہنر کی بدولت اپنے اچھے اخلاق اور مزاج کے باعث سراہی جاتی تھیں اور یہ منفرد سلوک و رویّے فاخرہ جہاں کے لیے فطری طور پر جیلسی کا باعث بنتے تھے مگر گھر کی بڑی بہو اور ساس کی سگی بھتیجی ہونے کے باعث ان کا سارے گھر پر ہولڈ قائم تھا سوائے اماں جان (شاہ جہاں بیگم) کے فیصلوں کے جن کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا تھا مگر وہ ساس اور پھپو کی من چاہی اور منہ چڑھی بھی تھیں۔ وہ بظاہر شمسہ کی شخصیت سے دبنے کے باوجود اس سے کسی قسم کی جیلسی یا چپقلش کا اظہار نہیں کرتی تھیں کیونکہ گھر کے پُرسکون ماحول کی فضا شاہ جہاں بیگم ہی نہیں گھر کے مردوں کو بھی عزیز تھی اور شمسہ تو مزاجاً صلح جو اور فطرتاً مثبت سوچ کی حامل تھیں۔ دونوں جیٹھانی، دیورانی میں اختلاف کی نوبت ہی نہیں آتی تھی جس میں زیادہ کریڈٹ شمسہ کو جاتا تھا۔

شاہ میر بچپن سے ہی شمسہ سے بہت محبت اور لگاوٹ رکھتا تھا۔ وہ شمسہ کا بھی چہیتا اور لاڈلا تھا جس کی نت نئی فرمائشوں کو شمسہ بڑی خوشدلی سے پورا کیا کرتی تھیں، جن کے بنائے بیکری آئٹمز شام کی چائے پر بچے، بڑے سب ہی بہت پسند کرتے تھے۔ وہ سمیر اور شاہ میر کی فیورٹ تھیں۔ شاہ میر تو سارا دن اپنے پورشن سے زیادہ شمسہ کے پورشن میں ہی پایا جاتا تھا۔ اسکول کے بعد اپنی چھوٹی کزن اور دوست شفا کے ساتھ کھیلتا تھا اور شام میں شمسہ کے ساتھ کچن میں کھڑے ہو کر انہیں بیکنگ کرتے دیکھتے ان کی مدد بھی کرتا چھوٹے موٹے کاموں میں اور اسے اس ایکٹوٹی میں مزہ بھی بہت آتا۔ شمسہ بھی اسے بیٹے کی طرح پیار کرتی تھیں۔ وہ بچپن سے ان کی بہت عزت کرتا اور ہر بات مانتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اتنے سالوں بعد اس اجنبی لڑکے سے مل کر شمسہ کو بہت مانوسیت اور اپنائیت محسوس ہوئی۔

شمسہ کی ذات سے لگاؤ کے باعث ہی اس نے یہ پروفیشن چوز کیا تھا جسے وہ ناموں کی مماثلت سمجھ کر اتفاق سمجھ کر اپنے ذہن سے جھٹکتی رہی تھیں۔ اب اچانک ہی انکشاف ہوا تھا کہ وہ مانوس اجنبی کوئی غیر نہیں ان کا اپنا ہی تھا جس کے چہرے کے نقوش سالوں کے سفر میں تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان نہیں سکے تھے لیکن اب سچائی جاننے کے بعد بھی انہیں شاہ میر کی ذات سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ وہ تو آٹھ، نو سال کا معصوم بچہ تھا جس نے اس وقت بھی فاخرہ جہاں کے شمسہ کے ساتھ جھگڑے اور برے برتاؤ پر احتجاج کیا تھا مگر ماں کو اس ظلم و زیادتی سے روک نہیں سکا تھا اور اب حقیقت سامنے آنے کے بعد شمسہ نے فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد کچن میں کھڑے اپنے لیے چائے بناتے، بناتے فیصلہ کیا تھا کہ وہ شاہ میر کو ساری سچائی بتا دیں گی۔ سالوں پہلے ان کے شاہ جہاں لاج کو چھوڑنے کے بعد ان کے پیچھے فاخرہ جہاں نے جانے ان کے بارے میں کیا، کیا الزامات لگا کر خود کو بری الذمہ ثابت کیا ہوگا۔

آج چھٹی کا دن تھا، شفا چھٹی والے دن صبح دیر سے اٹھتی تھی۔ وہ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی شاہ میر سے ساری بات کر لینا چاہتی تھیں تاکہ شفا کو اس بارے میں کچھ پتا نہ چلے اور شاہ میر چپ چاپ یہاں سے چلا جائے، اس وعدے کے ساتھ کہ وہ کراچی واپس جا کر کسی کو ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتائے گا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے برسوں پہلے ہونے والے اس ناخوشگوار واقعے کی اذیت سے خود کو اور اپنی معصوم بیٹی کو باہر نکالا تھا جو آج بھی اس شہر اور اس میں بسنے والے لوگوں کا ذکر

پسند نہیں کرتی تھی۔

فاخرہ بیگم کے ظالمانہ سلوک کو شاہ میر نے بچپن میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بہرحال وہ چائے لے کر معمول کی طرح صبح انیکسی کے باہر برآمدے میں آئیں تو شاہ میر کو پہلے سے وہاں رکھی چیئر پر بیٹھے دیکھ کر وہیں اس کے پاس چلی آئیں۔ انہیں پتا تھا وہ صبح سویرے بیدار ہونے کا عادی ہے۔ شاہ میر نے انہیں آتے دیکھ کر کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی تو اس کے پاؤں کی موچ کے خیال سے شمسہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے کھڑا ہونے سے روک دیا۔ وہ جانتی تھیں وہ ان کے احترام میں ہمیشہ کی طرح کھڑا ہونا چاہتا ہے حالانکہ کل کی ایکسر سائز کی وجہ سے اب اس کے پاؤں کی کنڈیشن بہتر تھی۔ تب ہی وہ خود آہستہ، آہستہ چل کر یہاں آ کر بیٹھا تھا۔ پچھلی رات شمسہ کے خاموشی سے نیند کا بہانہ کر کے اٹھ جانے کی وجہ سے وہ بے چینی کے باعث ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا تھا جبکہ شمسہ اسی خیال سے یہ ارادہ کر کے آئی تھیں کہ اس کے دوبارہ سے وہی سوال [illegible] سے پہلے وہ خود ہی اس کی بے چینی دور کر دیں گی۔ شاہ میر کے سوال کا جواب دینے وہ اس کی سامنے والی چیئر پر بیٹھ گئیں۔

”تم اتنی جلدی اٹھ گئے ہو، میں تو سمجھی تھی کہ دیر سے اٹھو گے۔ چھٹی والے دن شفا بھی دیر سے اٹھتی ہے، میں نے سوچا ناشتا بھی لیٹ ہی بناؤں گی تاکہ گرم، گرم ہی انجوائے کیا جا سکے۔“

”بس آنٹی، رات کو نیند ٹھیک سے نہیں آئی، صبح بھی جلدی آنکھ کھل گئی۔ میں روز اس وقت جاگنگ کے لیے باہر جاتا ہوں مگر پاؤں کی اس کنڈیشن میں جاگنگ کے لیے تو نہیں جا سکتا تھا اس لیے یہاں آ کر بیٹھ گیا۔“

اس کے رات ٹھیک سے نہ سونے کی بات پر شمسہ کو افسوس ہوا۔ اس کی بے چینی کو سمجھتے ہوئے انہوں نے ابھی کچھ تمہید باندھنے کے لیے بولنا چاہا تو کچھ لمحوں کے لیے ان سے کچھ بولا ہی نہیں گیا اور وہ خاموشی سے سوچنے لگیں کہ اٹھارہ سال پہلے تو وہ بچہ تھا، فاخرہ کے لگائے الزام کو سمجھتا نہیں تھا، اب ایک جوان لڑکے کے سامنے ان الزامات کو دُہرانا اور ان کی تردید کر کے اپنی بے گناہی کی سچائی بتانے میں جھجک محسوس کر رہی تھیں۔ ان کی دلی کشمکش سے بے خبر انہیں خاموش دیکھ کر وہ خود ہی گزشتہ رات کی باتوں کے لیے ان سے معذرت کرنے لگا۔

”آئی ایم سوری آنٹی، مجھے کل آپ سے وہ سب باتیں نہیں کرنی چاہئیں تھیں، میں نے آپ کو شاید ڈسٹرب کر دیا ہے۔“ وہ واقعی شرمندہ نظر آ رہا تھا تب ہی شمسہ نے ہمت کرتے ہوئے جواباً کہا تو وہ خاموشی سے ان کی باتیں سننے لگا۔ وہ بے چینی سے انہیں سننے کو بے تاب تھا۔

”تمہیں شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بیٹا کیونکہ تم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ تم سے پہلی بار ملنے کے بعد مجھے بھی کچھ مانوس سا محسوس ہوتا تھا مگر میں ماضی کے بارے میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر ماضی کی یادیں اچھی نہ ہوں یا بہت تکلیف دہ ہوں تو انہیں بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے لیکن تم پریشان مت ہو، میں تمہیں سب کچھ بتا دیتی ہوں مگر تمہیں بھی مجھ سے ایک پرامس کرنا ہوگا۔“

اسے کچھ، کچھ اندازہ تھا مگر ان کی آخری بات پر وہ انہیں سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ شاید بچپن میں دیکھے چہروں کے نقوش ایک طویل عرصے کے بعد دھندلے پڑ جاتے ہیں مگر مٹتے نہیں ہیں۔ اس کے ذہن کے پردے سے بھی مٹے نہیں تھے اور جب شمسہ نے کہنا شروع کیا تو جیسے، جیسے وہ بتاتی جا رہی تھیں خوشی کے احساس کے بجائے اس کا [illegible] ندامت و شرمندگی سے جھکتا چلا جا رہا تھا۔

فاخرہ جہاں کی بدگمانی، ان کے الزامات، یہاں تک کہ ان کی [illegible] بے رحمی کے بارے میں شمسہ کی زبان سے سچائی جاننے کے [illegible] جگہ گنگ بیٹھا رہ گیا۔ بچپن میں تو اسے ان باتوں کا [illegible] ہی نہیں تھا۔ اسے بس اتنا ہی یاد تھا کہ اس کی مما اس روز شمسہ آنٹی سے جھگڑا کر رہی تھیں مگر وہ جھگڑے کی نوعیت اور اس کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ بعد میں بھی فاخرہ جہاں کی زبانی شمسہ کے گھر چھوڑ دینے کی وجہ اور دیگر معاملات سے بچوں کو دور ہی رکھا گیا تھا لہٰذا وہ بھی بے خبر تھا اصل حقائق سے البتہ شمسہ کے اس گھر سے جانے کے بعد فاخرہ جہاں نے جو الزام شمسہ کی ذات پر عائد کیا تھا وہ محض غلط فہمی اور بدگمانی ہی ثابت ہوا تھا۔ شاہ جہاں بیگم نے انہیں ملامت کرتے ہوئے ساری حقیقت سے پردہ اٹھا دیا تھا کہ شمسہ کا نکاح فرجاد سے کر دینے کی صرف شاہ جہاں بیگم کی اپنی خواہش تھی، اس میں شمسہ اور فرجاد کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ فرجاد نے تو سنتے ہی انکار کر دیا تھا کہ وہ

digest.library.com

شمسہ اور اس کی بیٹی کی بڑے بھائی کی حیثیت سے ہمیشہ کفالت کرتے رہیں گے کیونکہ وہ جانتے تھے شمسہ اپنے شوہر اور ان کے مرحوم بھائی سے بہت محبت کرتی تھی۔ وہ دوسرے نکاح کے بارے میں کبھی مان نہیں سکتی تھی۔

سچائی جاننے پر فاخرہ جہاں تو شرمندہ تھیں ہی، وہیں پر معصوم شاہ میر نے روتے ہوئے ماں کے ظلم و زیادتی کی ساری تفصیل باپ اور دادی کو بتادی تھی کہ کس طرح مما نے چاچی سے جھگڑا کر کے ان دونوں ماں، بیٹی کو گھر سے باہر نکال دیا تھا جس پر فرجاد نے بھی بیوی پر نہایت برہمی اور غصے کا اظہار کیا تھا جنہوں نے بنا کسی تحقیق و تصدیق کے سنگین بدگمانی اور شک میں مبتلا ہو کر ان کے مرحوم بھائی کی بے سہارا بیوہ اور معصوم بچی کو دربدر کر دیا تھا اور جب ساس نے فاخرہ کی غلط فہمی اور بدگمانی کو دور کیا تو وہ بھی اپنی اس جلد بازی اور قبیح حرکت پر بہت شرمندہ نظر آرہی تھیں۔ سوتن کے جلاپے اور اپنے اندر پنپتے فطری حسد و جلن کے ساتھ اپنے گھر گرہستی کو داؤ پر لگتے دیکھ کر فاخرہ جہاں شاید انسانیت کے درجے سے بھی گر گئی تھیں حالانکہ شمسہ نے انہیں یقین دلانے کی بارہا کوشش کی تھی مگر فاخرہ کی آنکھوں پر تو اس وقت صرف حسد و جلاپے کی پٹی بندھی ہوئی تھی اور اب حقائق جان کر وہ شوہر اور ساس کے سامنے شرمندہ ہونے کے ساتھ ان کے عتاب کا بھی نشانہ بنی ہوئی تھیں۔

فرجاد تو کچھ دیر بعد انہیں ملامت کر کے بھاوج اور بھتیجی کو ڈھونڈنے اسی وقت نکل گئے تھے مگر شاہ جہاں بیگم ہمیشہ کے لیے ان سے بدظن ہو گئی تھیں اور جب تک وہ زندہ رہیں انہوں نے فاخرہ جہاں کو معاف نہیں کیا جبکہ سب گھر والوں کو سچائی بتانے پر اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی وہ آج تک اپنے بیٹے شاہ میر سے شاکی رہی تھیں۔ اس کی وجہ سے فاخرہ جہاں عمر بھر کے لیے شوہر اور ساس کی معتوب ٹھہری تھیں اور اب شمسہ کی زبانی اتنے سالوں بعد اصل سچائی جان کر شاہ میر کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کن لفظوں میں اپنی ماں کی طرف سے ان دونوں ماں، بیٹی سے معافی مانگ سکے گا۔ ان ماں، بیٹی کے نقصان اور اذیتوں کا ازالہ اب ممکن بھی نہیں تھا مگر وہ جانتا تھا دادی کی زبانی شمسہ کے سچ کی گواہی ملنے کے بعد فاخرہ جہاں اپنے کیے گئے ظلم و زیادتی پر بہت نادم تھیں اور شمسہ سے

نظم

یہ ریگزار بھٹیاں
یہ شعلہ فلک زباں
یہ وحشتوں کا ناچ جو
نگل گیا ہے زندگی
نگل گیا ہے ہر خوشی
ہنسی جو طفلِ نو کی تھی
امید کا پیام تھی
جو تیغ بے نیام تھی
کہاں وہ ضبط کام تھی
لبوں سے وہ بھی نوچ لی ابدن سے
سانس کھینچ لی وہ آگ آسمان سے
لپک کے سب اچک گئی
صدا بھی اب تو کھو گئی اذاں خموش ہو گئی
نہیں ہے انتظار کے
اب آئے گا کوئی نبی
نبی کے پیروں کو بھی
نہ غیرت عہد رہی
نہ جرات مدد رہی
نہ خون ہی میں جوش ہے نہ دین کا خیال ہے
جو دین کا یہ حال ہے
یہ شرم کا مقام ہے
یہ تخت تاج امارتیں
یہ سلطنت یہ کثرتیں
گھٹا رہی ہیں عزتیں
بڑھا رہی ہیں حسرتیں
یہ کہہ رہی ہیں نفرتیں
ہٹو ہماری راہ سے
کہ تم تمہاری سازشیں
تمہارا ڈر تمہارا زر
تمہاری لالچیں تمام
پاؤں کی ہیں بیڑیاں
حوصلے نڈھال ہیں
یہ جراتیں محال ہیں
کہ فیصلے خلال ہیں
وجود بھی وبال ہیں

از: طاہرہ فاروقی، کراچی

معافی بھی مانگنا چاہتی تھیں جبکہ شاہ میر سامنے بیٹھی ہستی کی اعلیٰ ظرفی کا آج بھی دل سے معترف ہوگیا تھا جن کے رویے اور سلوک میں سچائی جاننے کے بعد کل سے اب تک کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ انہوں نے شاہ میر کے سامنے کوئی شکایت نہیں کی تھی، نہ ہی کسی سے نفرت کا اظہار کیا تھا، نہ کچھ برا بھلا کہا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد ہمت کرکے ان کے سامنے بولنے کے قابل ہوا تو بس اپنی شرمندگی اور معذرت کا اظہار ہی کرنے لگا مگر لہجے کی ندامت لفظوں پر حاوی رہی۔

''آئی ایم سوری...... آئی ایم رئیلی سوری چچی جان، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا میری مما اتنی ظالم، کدورت پسند اور بے حس بھی ہوسکتی ہیں لیکن میرا یقین کریں آپ کے وہاں سے جانے کے بعد کسی نے بھی مما کے اس الزام پر یقین نہیں کیا تھا کیونکہ مما خود بھی اصل سچائی سے بے خبر تھیں کہ وہ خواہش صرف دادی جان کی تھی، اس میں آپ کی اور پاپا کی کوئی مرضی شامل نہیں تھی۔ تب مما بھی اپنی [illegible] بہت شرمندہ تھیں اور انہوں نے دادی کے سامنے [illegible] کہ ایک [illegible] اور شفا گھر واپس آجائیں تو وہ ان سے اپنی غلط فہمی اور بدگمانی میں آکر کیے گئے ظلم و زیادتی کی معافی مانگ لیں گی مگر پاپا کے اتنا تلاش کرنے کے باوجود بھی آپ کہیں نہیں ملیں تو سب مایوس ہوکر مما کو ہی ملامت کرتے رہے تھے۔''

یہ جان کر شمسہ کو کوئی خوشی نہیں ہوئی مگر یہ اطمینان ضرور ہوا تھا کہ ساس اور جیٹھ میں سے کسی نے بھی فاخرہ جہاں ...... کے الزامات پر یقین نہیں کیا تھا اور اب شاہ میر کی زبانی سچائی جان کر انہیں کسی سے کوئی گلہ نہیں رہا تھا جبکہ شاہ میر کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح ان کے ساتھ ہوئی اس زیادتی کی تلافی کرے۔ اسے تو یہ سوچ کر ہی دکھ ہو رہا تھا کہ ایک بے سہارا اکیلی عورت نے کیسے ان حالات کا سامنا کیا ہوگا۔ وہ مزید کچھ بھی کہنے یا ان سے نظریں ملانے کے خود کو قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ وہ اس کی دلی کیفیت اور چہرے کے تاثرات سے اس کے جذبات و احساسات کا اندازہ کرسکتی تھیں۔

''بیٹا...... تمہیں اتنا دکھی اور شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔ ''میں جانتی ہوں فاخرہ بھابی کے کسی بھی عمل میں تم میں سے کسی کا بھی کوئی قصور نہیں ہے۔ میں ان تمام پرانی باتوں کو بھلا چکی ہوں اور اب مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ انصاف اور سرخروئی عطا کرنے والی ذات پاک نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ میری بے گناہی ثابت ہوچکی ہے اور اگر اب فاخرہ بھابی اپنے کیے پر شرمندہ ہیں تو مجھے ان سے بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔ تم یہی سمجھو کہ میں نے انہیں معاف کردیا، تم بھی پرانی باتوں کو یاد کرکے دکھی مت ہو کیونکہ تم آج بھی مجھے اپنے بیٹے کی طرح عزیز ہو۔''

اور وہ ان کی اس محبت پر بے ساختہ تڑپ کر بولا۔

''تھینک یو...... چچی جان...... معاف کردینا، بھول جانا واقعی آسان نہیں ہوتا مگر یہ سب کرنے والا واقعی بہت اعلیٰ ظرف اور معتبر مقام کا حامل ہوتا ہے۔ یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی اور بڑائی ہے کہ آپ نے انہیں معاف کردیا ہے لیکن میں پھر بھی مما کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں۔ وہ بھی اپنے کیے پر شرمندہ اور نادم تھیں اور آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھیں اور جب انہیں پتا چلے گا آپ لوگوں کے بارے میں تو وہ آپ لوگوں سے......''

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا شمسہ نے اسے ٹوکتے ہوئے فوراً روک دیا۔

''نہیں بیٹا...... میں نے کہا ناں...... مجھے اب کسی سے کوئی شکوہ [illegible] نہ ہی اب میں وہاں اس گھر میں واپس جانا چاہتی ہوں [illegible] ہوں کہ شفا کو اس بارے میں کچھ بھی پتا نہ چلے کیونکہ [illegible] بہت جذباتی ہے۔ وہ آج تک اس واقعے کو ہی فراموش نہیں کرسکی ہے اور نہ ہی کسی کو معاف کرسکی ہے۔ اب رشتوں پر، لوگوں پر سے اس کا بھروسا اور اعتبار ٹوٹ چکا ہے، وہ چاہ کر بھی اس تکلیف دہ ماضی کو بھلا نہیں سکی ہے۔ وہ بہت حساس ہے...... اس لیے میں نہیں چاہتی کہ اب اتنے سالوں بعد تمہاری پہچان عیاں ہونے پر وہ کسی بھی شدید ردعمل کا اظہار کرے۔ اس لیے تم سے ریکویسٹ ہے میری، تم اس بارے میں شفا سے کوئی بات نہیں کروگے، نہ ہی گھر واپس جاکر ہمارے بارے میں کسی کو کچھ...... بتاؤ گے، اماں جان کو بھی نہیں۔''

''وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں چچی جان......!''

شاہ میر نے بے ساختہ افسردگی سے کہا تو وہ یہ سن کر چند لمحوں کے لیے چپ ہوگئیں مگر چہرے کے تاثرات

digest-library.com

بتا رہے تھے کہ انہیں یہ جان کر بہت دکھ ہوا ہے۔

''مگر جب تک زندہ رہیں آپ کو اور شفا کو یاد کرتی رہیں اور اللہ سے معافی مانگتی رہیں کہ وہ اپنے مرحوم بیٹے کی بیوہ اور اپنی پوتی کو تحفظ اور خوشیاں نہیں دے سکیں مگر مما کی معافی کے بعد بھی وہ ان سے ناراض اور شاکی ہی رہتی تھیں۔''

''اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے لیکن میں کبھی بھی ان کی طرف سے بدگمان نہیں رہی ہوں، میں جانتی تھی اس سارے معاملے میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ انہوں نے تو اپنے طور پر میری بھلائی ہی سوچی ہوگی۔ میرے انکار کے بعد شاید وہ دوبارہ ایسا کچھ کرنے کے بارے میں نہیں سوچتیں...... لیکن اس سے پہلے ہی فاخرہ بھابی نے......!''

ان کی بات ادھوری رہ گئی، شفا ناشتے کے لوازمات کی ٹرالی دھکیلتے وہیں چلی آئی۔ تب ہی اسے وہاں دیکھ کر شمسہ کو خاموش ہونا پڑا۔ انہیں باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ چھٹی والے دن شفا ہی ناشتا تیار کرتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی شمسہ کے ساتھ شاہ میر نے بھی جلدی سے خود کو کمپوزڈ کیا۔ فاصلے کی وجہ سے شفا نے شاید کچھ بھی سنا نہیں تھا۔

''مجھے پتا تھا آپ یہیں پر ہوں گی اس لیے ناشتا یہیں پر لے آئی ہوں۔''

البتہ شاہ میر کو وہاں موجود دیکھ کر وہ اچنبھے میں مبتلا ہوئی کہ اپنے پاؤں کی موچ کے ساتھ وہ یہاں تک کیسے آیا ہوگا، تب ہی شاہ میر نے اس کی حیرانی خود ہی دور کردی۔

''تھینک یو شفا، آپ کے ایکسرسائز والے مشورے کی وجہ سے اب میرے پاؤں کی کنڈیشن بہت بہتر ہے اسی لیے خود چل کر یہاں آکر بیٹھا ہوں۔''

اس کی بات پر وہ جھینپ کر مسکرائی اور شاہ میر نے اسے نظر بھر کے دیکھا جو صبح کی تازگی کی طرح نکھری، نکھری سی تازہ دم ہر تکلیف دہ احساس سے بے خبر فریش نظر آرہی تھی۔ شکر تھا اس نے شمسہ کی خاموشی اور چہرے کی سنجیدگی پر توجہ نہیں دی تھی۔ شاہ میر کو وہ بچپن کی اس شفا سے بالکل مختلف لگ رہی تھی جو اس سے بہت فرینک ہوا کرتی تھی، اس کی سب سے اچھی دوست تھی۔ ان کا سارا بچپن ایک ہی گھر کی چھت تلے ساتھ کھیلتے، پڑھتے اور کھاتے، پیتے گزرا تھا مگر اب وہ بے تکلفی، لگاؤ اور دوستی اجنبیت میں بدل چکی تھی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے، اب آپ کو چلنے پھرنے میں کوئی پرابلم نہیں رہے گی۔'' وہ جواباً بولی تو شاہ میر کو اچھا لگا۔ تب ہی شاہ میر کو شفا کا پرامس یاد آیا۔

''جی...... واقعی اب میں بہت بہتر فیل کررہا ہوں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ بہت اچھی ڈاکٹر ہیں لیکن اب آپ کو اپنا پرامس پورا کرنا ہوگا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں آج جیپ ڈرائیو کرنے میں مجھے کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔''

اس کی بات پر شفا کو اپنا وعدہ یاد آگیا۔ چھٹی والے دن اس نے شاہ میر کو قریبی علاقوں جن میں مشہور ٹورسٹ پوائنٹس شامل تھے، کی سیر پر ساتھ چلنے کی ہامی بھری تھی۔ وہ یاد آنے پر جواباً ہلکا سا مسکرائی تو انہیں باتیں کرتے دیکھ کر شمسہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''بیٹا، میں ابھی کچھ دیر آرام کروں گی، رات کو ٹھیک طرح سے سو نہیں سکی تھی اس لیے تم دونوں ہی ناشتا شروع کرو، میں بعد میں کرلوں گی۔''

''کیا ہوا...... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ماما، ٹمپریچر تو نہیں ہوگیا؟'' شفا نے فوراً اپنا ہاتھ ان کی پیشانی پر رکھ کر بخار کی حرارت چیک کی تو وہ اسے بشاش لہجے میں تسلی دینے لگیں جو واقعی ان کے لیے فکرمند ہوگئی تھی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں بیٹا، کچھ دیر کے لیے سو جاؤں گی تو فریش ہو جاؤں گی۔ تم دونوں ناشتا شروع کرو ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

ان کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر وہ مزید پریشان نہ ہو جائے اسی لیے شمسہ نے جلدی سے بات بناتے ہوئے کہا۔ رات بھر کے رت جگے نے ان کی حالت پژمردہ کردی تھی تو وہ اسے تسلی دے کر اندر کی جانب بڑھ گئیں۔ شفا نا سمجھی سے شاہ میر کو دیکھنے لگی تو اس نے بھی جلدی سے بات بنائی۔

''میرے خیال میں آنٹی جگہ تبدیل ہونے کی وجہ سے رات ٹھیک طرح سے سو نہیں سکی ہوں گی کیونکہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم انسان اپنی ہر شے کے عادی ہو جاتے ہیں، بٹ ڈونٹ وری...... میں آج اوپر اپنے روم میں شفٹ ہو جاؤں گا کیونکہ اب میں واقعی بہتر فیل کررہا ہوں اس لیے آپ لوگوں کی خاطر داری کے لیے بہت شکریہ۔ آپ

Digest Library.com

لوگوں نے واقعی میرا بہت خیال رکھا۔'' شاہ میر نے خیال آنے پر اپنے جذبات و احساسات کا فوراً اظہار کر دیا تو شفا بھی ناشتا ٹھنڈا ہونے کے خیال سے وہاں بیٹھ کر شاہ میر کے لیے سرو کرنے لگی ساتھ ہی ماں کی کہی باتیں دُہرانے لگی۔

''تھینکس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ ماما ٹھیک کہتی ہیں، مہمان واقعی رحمت ہوتے ہیں اللہ کی کیونکہ جب ہم کسی کے لیے آسانی فراہم کرتے ہیں تو اللہ پاک بھی ناگہانی آزمائشوں میں ہمارے لیے آسانی فراہم کرتے ہیں۔ مجھے ماما کی باتیں سمجھ آنے لگی ہیں۔''

اور وہ شمسہ کی سوچ کو دل ہی دل میں سراہے بغیر نہیں رہا تھا جن کی تربیت نے شفا کو اپنے جیسا ہی بنایا تھا۔

''اور آپ فکر مت کریں، مجھے اپنا پرامس یاد ہے اس لیے پلیز...... آپ ناشتا شروع کریں ورنہ واقعی ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

شاہ میر نے اس کی بات پر چیز آملیٹ اور گرما گرم خستہ پراٹھوں کے ساتھ بھاپ اڑاتی چائے کی طرف دیکھ کر خوشد[illegible] ہوئے چائے کا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا [illegible] کافی [illegible] محسوس ہو رہی تھی اور وہ اندر ہی اندر اس نئے احساس [illegible] ہو رہا تھا کہ آج اتنے دنوں بعد یہ لڑکی جواب اسے اپنے دل کے بہت زیادہ قریب محسوس ہونے لگی تھی۔ پہلی بار بِنا کسی جھجک کے اس کے ساتھ خوشگوار موڈ میں بات کر رہی ہے، شاید اس لیے کہ ابھی وہ شاہ میر کی سچائی سے بے خبر ہے۔ اسے لگا کہ شمسہ چچی نے ٹھیک ہی کہا تھا، ابھی شفا کو کسی سچائی کا علم نہیں ہونا چاہیے ورنہ کہیں پھر سے وہ اپنی بچپن کی اس دوست کو کھو نہ دے جواب انجانے میں ہی سہی، پہلے کے مقابلے میں کچھ دوستانہ، کچھ اپنائیت سے بات کر رہی تھی۔

☆☆☆

پھر ناشتے کے بعد اس نے شفا کے ہاتھ کے ذائقے کی بھی بھرپور تعریف کی جس پر شفا صرف جھینپ کر ہی رہ گئی البتہ باتوں، باتوں میں انہوں نے طے کر لیا کہ وہ شمسہ کے آرام کر کے اٹھنے کے بعد ہی انہیں بتا کر سیر کے لیے نکلیں گے مگر انسان واقعی بہت بے خبر اور بے بس بھی ہوتا ہے۔ قدرت کے طے کردہ فیصلوں کے سامنے انسان کی اپنی ساری پلاننگ چاہے وہ لمحوں کی ہو یا پھر برسوں کی، دھری کی دھری ہی رہ جاتی ہے۔ ان دونوں کے آؤٹنگ کے لیے نکلنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی اچانک سے شمسہ کی طبیعت خراب ہوئی۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تو تھیں ہی جب وہ کافی دیر تک کمرے سے باہر نہیں آئیں تو شفا کو تشویش ہوئی۔ کمرے میں پہنچ کر انہیں بے ہوش دیکھ کر شفا کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کے زور، زور سے ماں کو پکارنے پر شاہ میر ان کے کمرے میں پہنچا اور پھر چویشن کو سمجھتے ہوئے لمحے کی بھی دیر کیے بغیر ایمبولینس کال کر لی جو کچھ دیر میں پہنچ گئی اور وہ روتی، بلکتی شفا کو تسلی دیتے ہوئے اس کے ساتھ شمسہ کو ایمبولینس میں لے کر اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ اصولاً تو اب شمسہ کا دل ہلکا ہو جانا چاہیے تھا مگر شاہ میر کے پاس سے اٹھ کر اندر جانے کے بعد انہوں نے نہ جانے کس بات کا اتنا اسٹریس لیا تھا۔ شدید ذہنی دباؤ کی کیفیت نے ان کے دل و دماغ پر جو اثر کیا تھا وہ ہمت ہار بیٹھی تھیں۔

ایمرجنسی میں انہیں لے جایا گیا، انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور ڈاکٹرز کی زبانی شاہ میر ان کی کنڈیشن جان کر بہت پریشان اور دکھی ہو کر نادم بھی ہو رہا تھا کہ [illegible] کوئی سوال جواب نہ کرتا تو شاید ان کی یہ حالت نہیں ہوتی جبکہ [illegible] بے خبر خوفزدہ اور ہراساں دکھائی دے رہی تھی اور [illegible] ہوتی ہوئی شفا کو تسلی دینا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ وہ خود ڈاکٹر تھی، ماں کی کنڈیشن کا اندازہ کرتے ہوئے اس کا دل کیسے، کیسے واہموں اور خدشوں کا شکار ہو رہا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کا سارا اسٹاف بھی اس وقت اسپتال میں موجود شمسہ کی صحت یابی کے لیے دعا کر رہا تھا جبکہ شاہ میر پہلے ہی شہریار آفریدی اور فرجاد احمد کو کال کر کے ساری صورتِ حال بتا چکا تھا۔ وہ دونوں پہلی فلائٹ لے کر یہاں پہنچنے والے تھے۔ شہریار آفریدی انہیں اپنی سگی بہن کی طرح سمجھتے تھے، شاہ میر کی کال پر وہ ضروری بزنس میٹنگ چھوڑ کر فوری روانہ ہو گئے البتہ اسفندیار کو ابھی شمسہ کی بیماری کی خبر نہیں دی گئی تھی۔

شاہ میر نے باپ اور ماں کو سب کچھ بتا دیا تھا اور فرجاد، شمسہ اور شفا کے اتنے سالوں بعد مل جانے کی خوشی کی خبر پر شمسہ کی اس حالت کی وجہ سے پوری طرح خوش بھی نہیں ہو سکے تھے۔ انہیں صرف شمسہ کی زندگی اور خیرد

digest library.com

عافیت کی فکر تھی۔ فاخرہ جہاں بھی اس خبر کو سن کر فوراً مصلیٰ سنبھال کر شمسہ کی زندگی اور صحت یابی کی دعا کرنے میں مگن ہوگئی تھیں۔

اِدھر شفا بار بار روتے ہوئے ایک ہی بات کر رہی تھی۔

"مجھے سمجھ نہیں آرہا...... کل رات تک تو ماما کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی پھر اچانک سے ان کو کیا ہوگیا؟"

یہی سوال تو شاہ میر بھی دل ہی دل میں خود سے کر رہا تھا مگر وہ اس بارے میں شفا سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا سوائے اسے تسلی دینے کے۔

"آنٹی کو کچھ نہیں ہوگا شفا...... ان شاء اللہ...... وہ بالکل ٹھیک ہوجائیں گی، تم بس ان کے لیے دعا کرو اور پریشان مت ہو، میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔ تم دونوں کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔"

بے اختیاری میں اپنے اور اس کے تعلق کی سچائی جاننے کے بعد بے دھیانی میں وہ اسے تسلی دیتے ہوئے کہہ رہا تھا اور شفا روتے ہوئے بھی اس کے تسلی آمیز جملوں اور اپنائیت کے انداز کو شدت سے محسوس کرتے اسے دیکھتے جارہی تھی۔ لبوں پر صرف دعاؤں کا ورد تھا کہ یہ اجنبی شخص چاہے اسے تسلی دینے کے لیے جتنی بھی اپنائیت کا اظہار کرتا مگر وہ جانتی تھی شمسہ کے سوا اس کا دنیا میں کوئی اپنا خونی رشتہ نہیں بچا تھا اور اگر انہیں خدانخواستہ کچھ ہوجاتا تو وہ کیا کرے گی۔ یہی دل دہلانے والا احساس اسے اندر ہی اندر سہار رہا تھا۔

وہ دونوں ایمرجنسی روم کے باہر بینچ پر بیٹھے شمسہ کے لیے دعاؤں میں مصروف تھے مگر انسان واقعی قدرت کے فیصلوں کے سامنے انتہائی بے بس ہوتا ہے۔ شمسہ دوران ٹریٹمنٹ حوصلہ ہار بیٹھیں۔ ڈاکٹرز ان کی سانسوں کی ڈور مشینوں کی مدد سے بحال کرنے میں مصروف تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے شمسہ کے کمزور دل نے مزید حرکت کرنی بند کردی جس کے ساتھ ان کی سانسوں کی ڈور بھی ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر نے بڑے افسوس اور دکھ کے ساتھ باہر بیٹھی شفا کو یہ خبر سنائی تھی۔

"آئی ایم سوری ڈاکٹر شفا...... ہم آپ کی مدر کو نہیں بچاسکے۔ مجھے آپ کے لیے بہت دکھ اور افسوس ہے مگر اللہ کی رضا اور فیصلے کے سامنے ہمارا سارا علم اور ہنر سب بے بس ہوجاتے ہیں۔" ڈاکٹر سرفراز اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے وہاں سے افسردہ چلے گئے جو پتھرائی ساکت نگاہوں سے شاک کی سی کیفیت میں انہیں دیکھ رہی تھی اور وہ یہ سوچ کر آگے بڑھ گئے تھے کہ ساتھ کھڑا شخص یقیناً اس کا کوئی قریبی رشتے دار ہی ہوگا جو اسے اس مشکل وقت میں سنبھال لے گا۔ ڈاکٹر سرفراز کے وہاں سے جاتے ہی گھٹی گھٹی سسکیوں سے روتی شفا کو دلاسا اور تسلی دینا شاہ میر کے لیے بہت مشکل ہوگیا۔

وہ خود اس اچانک صدمے سے خود کو سنبھال نہیں پا رہا تھا مگر اسے روتے، بلکتے دیکھنا بھی اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بے اختیاری میں اسے تسلی دیتے ہوئے خود سے لگاتے دلاسا دینے لگا۔

"پلیز شفا...... اپنے آپ کو سنبھالو، حوصلہ کرو، صبر سے کام لو۔ تم اکیلی نہیں ہو، میں ہوں تمہارے ساتھ مگر ہمیں آنٹی کو گھر لے جانا ہوگا۔ میں نے شہریار انکل کو فون کردیا ہے وہ بس پہنچتے ہی ہوں گے۔"

شفا اپنے حواسوں میں کب تھی جو شاہ میر کے اس لب و لہجے کی گہرائی میں اترنے کی سعی کرتی جبکہ اسپتال کا اسٹاف شمسہ کی ڈیڈ باڈی ہینڈ اوور کرنے کے حوالے سے ضروری انتظامات کر رہے تھے۔ شاہ میر کو بھی شمسہ کو اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچانے کے لیے ان کے ساتھ تعاون کرنا تھا مگر شفا کو بھی وہ اس وقت اس حال میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کے دل نے شدت سے دعا کی کہ اس وقت اس کے پاپا یا پھر سمیر یہاں فوری آجاتے تو اس کے لیے شفا کو ان کے سہارے چھوڑنا آسان ہوجاتا اور اس کی دعا کو قبولیت ملی تھی۔ شہریار آفریدی چند گھنٹوں بعد اسپتال پہنچ گئے۔ انہوں نے دور سے ہی شفا کو پکارا جس نے برستی آنکھوں کے ساتھ بے ساختہ چہرہ اٹھا کر سامنے دیکھا پھر شاہ میر کی گرفت سے ہاتھ چھڑا کر تیزی سے بھاگتی شہریار آفریدی کے پاس پہنچی جو اسے کندھے سے لگا کر سر پر ہاتھ پھیرتے تسلی دینے لگے۔

"آئی ایم سوری بیٹا...... میں نے تو ایمرجنسی بکنگ کرواکے بہت جلدی یہاں پہنچنے کی کوشش کی تھی مگر مجھے دیر ہوگئی لیکن تم حوصلہ کرو بیٹا...... صبر کرو۔ اللہ کی رضا کے آگے ہم انسان بے بس ہوتے ہیں لیکن تم اکیلی نہیں ہو، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے اسے تسلی دے رہے تھے اور وہ بس سسکیوں سے

Digest Novels Lovers

بے آواز آنسو بہا رہی تھی۔ آنسوؤں کی یورش سے گلا رندھ چکا تھا۔ شاہ میر نے ہی آگے بڑھ کر انہیں اسپتال سے لیگل فارملیٹیز کے بارے میں بتایا کہ وہ شفا کو لے کر ریسٹ ہاؤس چلے جائیں، وہ شمسہ کی ڈیڈ باڈی ساتھ لے جانے کے لیے ساری لیگل فارملیٹیز پوری کر کے وہیں پہنچ جائے گا۔ اب یہ فیصلہ تو بعد میں ہونا تھا کہ ان کی ڈیڈ باڈی کو کراچی لے جانا ہوگا یا پھر یہیں پر سپردِ خاک کیا جائے گا۔ یہ سب شفا کی رضامندی سے ہی طے پانا تھا جبکہ شفا بڑی مشکل سے شمسہ کو اپنے ساتھ لیے بغیر وہاں سے جانے پر تیار ہوئی تھی۔ شمسہ کو ایمرجنسی میں اسپتال لے کر آنے سے لے کر ایڈمٹ کروانے اور علاج کے دوران اس نے جس طرح شفا کا حوصلہ بڑھایا تھا اسے شاہ میر پر بھروسا تھا کہ وہ شمسہ کی ڈیڈ باڈی کلیئر کرانے سے لے کر آگے کے تمام معاملات بھی نہایت ذمّے داری سے سنبھال لے گا۔ محض چند گھنٹوں کے ساتھ میں وہ ماں کے حوالے سے اس کی ذات کے لیے جس خلوصِ نیت کا مظاہرہ کر چکا تھا شفا اس کی گواہ تھی۔

رات ہونے تک فرجاد اور سمیر بھی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے شہریار آفریدی کو اپنے اور شفا کے رشتے کے حوالے سے ساری سچائی بتا دی۔ وہ چاہتے تھے کہ شمسہ کو ان کے شوہر کے پہلو میں ہی دفنایا جائے جو کراچی میں ان کے رہائشی علاقے کے قریب کے قبرستان میں مدفون تھے۔ شہریار آفریدی نے بنا کسی اعتراض کے یہ فیصلہ شفا کی مرضی پر چھوڑ دیا جسے سچائی بتانے کی ذمّے داری بھی شہریار آفریدی کو سونپی گئی۔ وہ تو صدمے سے نڈھال شفا کو سامنے دیکھ کر اسے دلاسا دینے کی بمشکل ہمت کر سکے تھے۔ اسے سچائی اپنی زبان سے بتانے کا حوصلہ نہیں تھا کہ جانے وہ اس ذہنی صدمے میں کس طرح کا ردِّعمل دے۔ وہ اس کے اور شمسہ کے لیے بہت دکھی اور افسردہ تھے کہ انہوں نے پہنچنے میں دیر کر دی تھی۔ انہیں آخری بار شمسہ سے معافی مانگنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ وہ اس تاسف میں مبتلا تھے کہ کاش شاہ میر اس سچائی کو جانتے ہی انہیں بروقت اطلاع کر دیتا تو وہ آج یوں ندامت و پچھتاوے میں مبتلا نہ ہوتے مگر شاہ میر کو بھی کیا خبر تھی کہ تقدیر یوں آناً فاناً اچانک سے اس کے سارے ارادوں کو خاک میں ملا دے گی جو سوچ رہا تھا کہ شمسہ چاہے کراچی واپس نہ جانا چاہیں مگر وہ ماں کو یہاں لا کر ان کے ساتھ کی گئی اپنی زیادتی کے لیے شمسہ سے معذرت کرنے کی خواہش کو ضرور پورا کرتا کیونکہ وہ جانتا تھا حقیقت جاننے کے بعد سالوں سے فاخرہ جہاں اپنی زیادتی پر شرمندہ اور نادم تھیں اور شمسہ سے معافی بھی مانگنا چاہتی تھیں تب ہی تو مرتے وقت شاہ جہاں بیگم نے بھی انہیں معاف کر دیا تھا اور اب تقدیر کے فیصلے کے سامنے اسے اپنے ارادے اور پلاننگ پر شرمندہ ہونا پڑا تھا۔ بے شک سب سے بڑا منصوبہ ساز ہمارا رب ہی ہے جس نے ہم سب انسانوں کی تقدیر کی پلاننگ بہت پہلے ہی کر رکھی ہے۔

شفا تو اپنے دکھ اور نقصان کے صدمے میں اس قدر ڈوبی ہوئی تھی کہ ماں کی ڈیڈ باڈی ریسٹ ہاؤس پہنچنے پر ان شناسا چہروں جن میں فرجاد احمد اور سمیر بھی شامل تھے اپنے اتنے قریبی رشتوں کے پاس ہونے پر ابھی تک انہیں پہچان نہیں سکی تھی۔ وہ تو بس یہی جانتی تھی کہ اسفند یار کے دوست کی حیثیت سے شاہ میر کی فیملی کے شہریار آفریدی کی فیملی سے دوستانہ مراسم ہیں اسی لیے وہ لوگ یہاں اس موقع پر ساتھ موجود ہیں مگر جب شمسہ کے کمرے میں ان کے بیڈ پر بیٹھی شفا کو شہریار آفریدی نے فرجاد صاحب کے بارے میں ساری حقیقت بتائی اور یہ کہ شمسہ نے اپنی زندگی میں ہی شاہ میر کے سامنے سب کچھ بھلا کر فاخرہ جہاں کی غلط فہمی اور بدگمانی کا سبب جان کر انہیں معاف کر دیا تھا تو اسے پہلے دن سے لے کر شمسہ کے اسپتال میں ایڈمٹ ہونے تک شاہ میر کے خلوصِ نیت اور دوستانہ رویے کو دیکھتے ہوئے اس لمحے کو یاد کیا جب شاہ میر ان ماں، بیٹی کے لیے آسانیوں کا باعث بنا تھا پھر شمسہ کی طبیعت خراب ہونے پر جس طرح اس نے اسپتال میں نہ صرف سارے معاملات اکیلے ہی سنبھالے تھے بلکہ وہ اسے بھی تسلی و دلاسے دے کر سنبھالتا رہا تھا، اپنے ساتھ کا یقین دلاتا رہا تھا۔ وہ اس مشکل وقت میں اسے تنہا نہیں چھوڑے گا کیونکہ وہ شفا اور شمسہ کے ساتھ اپنے خونی رشتے اور مضبوط تعلق کو جان چکا تھا، اگر نہیں بھی جانتا تب بھی شفا کو یقین تھا کہ شاہ میر اسی طرح ان کا ساتھ دیتا۔ شمسہ یوں ہی تو اس کی تعریفیں نہیں کیا کرتی تھیں۔ انہیں لوگوں کی بہت پہچان تھی۔

سب حقیقت جان کر اس نے اپنی ماں اور اللہ کی

رضا کی خاطر ان سب کو معاف کر دیا جو اس کی ماں کے لیے اذیت و دکھ کا باعث بنے تھے۔ وہ چاہتی تھی اس کی طرف سے یہ معافی اور اعلیٰ ظرفی اس کی ماں کے لیے مغفرت و عافیت کا ذریعہ بن جائے، البتہ جب شہریار صاحب نے اپنی اگلی خواہش اور فرجاد کی گزارش بھی اس کے سامنے رکھی تو وہ حیرانی میں مبتلا ضرور ہوئی تھی۔

''میں جانتا ہوں بیٹا...... یہ وقت ان باتوں کے لیے بالکل بھی مناسب نہیں ہے لیکن کیا کریں کہ مجبوری ہے۔ اب شمسہ بہن کے جانے کے بعد میں اور فرجاد کوئی بھی تمہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ فیصلہ تم خود ہی کرو۔ فرجاد کی فیملی سے تمہارا خونی رشتہ اور مضبوط تعلق بنتا ہے جبکہ خدا گواہ ہے کہ میں نے بھی ہمیشہ شمسہ بہن کو اپنی سگی بہن اور تمہیں اپنی بھانجی ہی سمجھا ہے۔ اگر شمسہ بہن کو مہلت ملتی تو میں ضرور ان سے یہ بات کرتا، میں تو بس اسفندیار کے اپنے بزنس میں سیٹلڈ ہونے کا انتظار کر رہا تھا تا کہ اس کے بعد ہی شمسہ بہن سے تمہارے لیے اسفندیار کے رشتے کے لیے بات کر سکوں۔''

وہ ایک لمحے کے لیے رک گئے تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ اس نے کبھی اسفندیار کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا تھا۔ مگر وہ خاموش رہی تب ہی وہ مزید بولنے لگے۔

''کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ شمسہ کے جانے کے بعد اب تم ہمیشہ کے لیے میری بیٹی بن کر میرے ساتھ کراچی چل کر رہو جبکہ فرجاد بھی ایسا ہی چاہتا ہے۔ وہ تمہارے والد کا بڑا بھائی ہے۔ اس کا بھی تم پر حق بنتا ہے لہٰذا وہ وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ تم یہاں سے اس کے گھر جا کر ہمیشہ کے لیے رہو جو تمہارا بھی گھر ہے۔ تمہارا حق بنتا ہے اس گھر اور ان کے بزنس پر، میں بھی......''

''لیکن مجھے ان کے اس گھر اور بزنس میں سے کچھ نہیں چاہیے ماموں...... نہ اپنا شرعی حصہ اور حق، نہ ہی کوئی جائداد......!''

چاہے وہ ماں کی خاطر سب کو معاف کر چکی تھی مگر اس وقت اور اپنی ماں کو دی جانے والی اس تکلیف اور دکھ کی اذیت کو اب تک نہیں بھلا سکی تھی اس لیے برجستہ سوگوار لہجے میں بولی تو وہ آخری بات بھی اسے بتانے لگے۔

''بیٹا...... میں نے کہا ناں...... میں تمہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کروں گا، جو تم چاہو گی ویسا ہی ہوگا مگر فرجاد نے بھی اپنے چھوٹے بیٹے شاہ میر کے لیے میرے سامنے تمہارا پروپوزل دیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اس کی بہو بنو۔''

اور ان کے اس انکشاف پر وہ واقعی حیران ہوئی تھی۔ کیا یہ فیصلہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے کے لیے کیا گیا ہے یا پھر صرف اس لیے کیا گیا ہے کہ کہیں وہ شہریار آفریدی کے ساتھ رہنے کا فیصلہ نہ کر لے۔ اس نے بنا سوچے سمجھے ہی شہریار کے ساتھ ان کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تب وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے بولے تھے۔

''تم چاہے جو بھی فیصلہ کرو، تم ہر صورت میں ہمیشہ میری بیٹی ہی رہو گی۔''

''میں آپ کے ساتھ آپ کے گھر میں رہوں گی ماموں...... مجھے اب اس گھر میں واپس نہیں جانا ہے جہاں سے سالوں پہلے مجھے اور میری ماما کو بے دخل کیا گیا تھا۔''

وہ اس وقت واقعی بہت جذباتی اور حساس ہو رہی تھی۔ یوں بھی شہریار آفریدی اور ان کی فیملی سے کوئی خونی رشتہ یا تعلق نہ ہونے کے باوجود اس وقت انسانیت کے ناتے ان ماں، بیٹی کا ساتھ دیا تھا جب اس کے اپنوں نے ان سے منہ موڑ لیا تھا اور اب اس کا فیصلہ جان کر شہریار آفریدی نے محبت سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر تھپتھپاتے ہوئے وہاں سے اٹھنے کی اجازت لی تھی کیونکہ ابھی ان لوگوں کو جلد ہی شمسہ کی ڈیڈ باڈی کو کراچی لے جانے کے فوری انتظامات کرنے تھے۔

شفا اس وقت جس صدمے سے دوچار تھی اس کا دل و دماغ کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا، البتہ شہریار آفریدی کی زبانی فرجاد اور سمیر کو شفا کے فیصلے کا علم ہوا تو ان دونوں کو بڑی مایوسی اور دکھ ہوا۔ فرجاد تو اپنے مرحوم بھائی، بھاوج کی نشانی کو یعنی شفا کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ بیٹی بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ انہیں اس کے دکھ اور اذیت کا بھی احساس تھا مگر پھر بھی وہ ہر حال میں اتنے برسوں کی جدائی اور تکلیفوں کی جو شمسہ اور شفا نے ان کے ساتھ کے بغیر تنہا اٹھائی تھیں ازالہ کرنا چاہتے تھے لیکن شفا کے فیصلے کے سامنے انہیں ہار ماننا پڑی جبکہ شاہ میر تو خود بھی اندر تک ٹوٹ گیا تھا۔ اسے شفا سے شکایت نہیں تھی، وہ اپنی جگہ حق بجانب تھی لیکن اس بات کا اسے زیادہ افسوس تھا کہ اس نے شفا کے سامنے اپنے دلی جذبات کا

Digest Library .Com

پہلے اظہار کیوں نہیں کیا۔ جس لڑکی کو وہ ہمیشہ سے اپنے دل کے سب سے قریب تر سمجھتا تھا وہ ان حالات میں مل کر بھی اس کے دل کی اولین خواہش بن گئی تھی۔ پہلے وہ صرف بچپن کی دوست اور ساتھی تھی مگر اب اس کی محبت بن چکی تھی اور اس جذبے کا احساس اسے ہو چکا تھا مگر شمسہ کی آناً فاناً طبیعت خرابی کے بعد اسے مہلت ہی نہیں ملی شفا کے سامنے اپنے جذبوں کو آشکار کرنے کی...... اور اب یہ جان کر کہ اس نے شہریار آفریدی کے ساتھ ان کے گھر جا کر رہنے کا فیصلہ کیا ہے اسے واقعی بڑی اذیت محسوس ہو رہی تھی اور یہ بھی کہ اب شفا کے سامنے اپنے جذبوں کا اظہار کرنا بے معنی لگ رہا تھا۔ سو وہ دل کی خواہش اور جذبات کو دل ہی میں چھپا کر خاموش رہا تھا۔

شام تک کراچی جانے کے سب انتظامات ہو گئے اور فلائٹ کے لیے ائرپورٹ کے لیے نکلنے سے پہلے بھی فرجاد صاحب نے اسے گلے لگا کر فاخرہ کی طرف سے معافی مانگی تھی اور یہ بھی یقین دلایا کہ انہوں نے اسے اور شمسہ کو ڈھونڈنے کی تب بھی بہت کوشش کی تھی، یہاں تک کہ ایبٹ آباد میں شمسہ کے ننھیالی رشتے داروں سے بھی پتا کیا تھا مگر شمسہ وہاں نہیں پہنچی تھیں اور یہ سچ تھا۔ شمسہ ڈھم ٹور میں شہریار آفریدی کے ریسٹ ہاؤس میں پناہ لینے کے بعد اپنے رشتے داروں کے پاس نہیں گئی تھیں اسی لیے فرجاد کو مایوس ہونا پڑا تھا لہٰذا انہوں نے اس کا فیصلہ جاننے کے بعد بھی اس سے گزارش کی تھی کہ وہ کبھی کبھار ان لوگوں سے ملنے شاہ جہاں لاج ضرور آئے تو شفا نے فی الوقت تو ہامی بھر لی بعد میں اسے کیا کرنا تھا وہ خود نہیں جانتی تھی۔

شام میں وہ ان سب کے ساتھ ہی ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوئی مگر وہ شہریار آفریدی کی Hilux میں ان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ شمسہ کی بیکری کا انتظام و انصرام ملازم کے سپرد کر دیا گیا تھا کہ شفا جیسے چاہے فیصلہ کرے البتہ اسپتال سے اپنا استعفیٰ لکھ کر شفا نے گل مینہ کے حوالے کر دیا تھا۔ مزید کسی فارملیٹی کے لیے وہ دوبارہ کراچی سے یہاں آسکتی تھی۔ گل مینہ نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا اور اس سے فون پر رابطے میں رہنے کا وعدہ لیا البتہ شاہ میر کی اداسی اور حد سے زیادہ خاموشی کو اس نے ضرور نوٹس کیا۔

شاہ میر نے اس کے شہریار آفریدی کی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اسے جن اداس نظروں سے دیکھا تھا شفا کو راستے بھر ایک عجیب بے چین کر دینے والے احساس نے اپنے حصار میں لے لیا تھا جیسے کوئی احساسِ زیاں یا پھر کوئی اہم شے کھو دینے کا احساس۔ وہ خود بھی اپنی فیلنگز کو ٹھیک سے سمجھ نہیں سکی تھی تو مزید کیا سوچتی۔

کراچی پہنچنے کے اگلے دن ظہر کی نماز کے بعد شمسہ کو شاہ جہاں لاج سے ہی ان کی آخری آرام گاہ لے جا کر سپردِ خاک کر دیا تھا اور اسی روز شام تک شفا، شہریار آفریدی کی پوری فیملی کے ساتھ ہی شاہ جہاں لاج سے چلی گئی۔ البتہ اس سے پہلے فاخرہ جہاں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے معافی مانگی تھی۔

''میرا یقین کرو بیٹا...... جب مجھے شمسہ کی بے گناہی کا علم ہوا تھا تب سے لے کر آج تک میں اپنے ضمیر کی عدالت میں خلش اور اذیت و تاسف کے ساتھ پچھتاوے اور ندامت میں سالوں سے مبتلا ہوں۔ میری جلد بازی اور بے خبری کی وجہ سے میرے ہاتھوں اتنا بڑا ظلم ہو گیا جس کے لیے میں نے آج تک خود کو معاف نہیں کیا مگر شاید عورت ہونے کی حیثیت سے تم کبھی اس بات کو سمجھ سکو کہ سوتن کے وجود اور اپنے شوہر اور گھر بار کو بانٹنے کی اذیت کوئی عورت بھی برداشت نہیں کر سکتی اور شمسہ تو مجھ سے ہر لحاظ سے برتر تھی۔ اماں جان کی خواہش جان کر میں انجانے میں عدم تحفظ کا شکار ہو کر شمسہ کی ذات سے بدظن ہو گئی تھی۔ مجھے لگا تھا کہ اماں جان، فرجاد کو مجبور کر کے ان کا شمسہ کے ساتھ دوسرا نکاح کرا کے فرجاد کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھین لیں گی، مجھے کیا پتا تھا کہ شمسہ اور فرجاد پہلے ہی اماں جان کو اس بات کے لیے انکار کر چکے ہیں مگر جب سچائی معلوم ہوئی تو میں شمسہ اور تم سے معافی مانگنا چاہتی تھی لیکن میں اتنی بدنصیب ہوں کہ شمسہ کی زندگی میں اس سے اپنی زیادتی کی معافی بھی نہیں مانگ سکی اور وہ اتنی عظیم عورت تھی کہ اس نے شاہ میر کے سامنے سب کچھ بھول کر میری زیادتی کو معاف کر دیا۔ میں اس کا یہ احسان مرتے دم تک نہیں بھولوں گی اس لیے اب تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ ہو سکے تو مجھ نادان عورت کو معاف کر دو، میں واقعی اٹھارہ سالوں سے ندامت کی آگ میں جل رہی ہوں۔ تمہاری اور شمسہ کی معافی ہی مرنے سے پہلے مجھے اب اس آگ میں مزید جھلنے سے بچا سکتی ہے۔'' وہ اس سے عمر میں اتنی بڑی تھیں پھر بھی انہوں نے سب کے

سامنے شفا کے آگے اپنے دونوں ہاتھوں کو معافی کے لیے جوڑ دیا تھا اور اس نے آگے بڑھ کر فاخرہ جہاں کے ہاتھوں کو تھام کر کہا۔

''آپ ایسا مت کریں۔ ماما آپ کو پہلے ہی معاف کر چکی ہیں اس لیے میں نے بھی آپ کو معاف کر دیا ہے۔ مجھے اب کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے لیکن میں پھر بھی یہاں نہیں رک سکتی۔ مجھے شہریار ماموں کے ساتھ ان کے گھر جانا ہے۔''

وہ شمسہ جیسی اعلیٰ ظرف اور نیک عورت کی بیٹی جس نے اس کی مثالی تربیت کی تھی اس کی اس بات پر شاہ میر نے ایک بار پھر اداس آنکھوں سے اسے دیکھا مگر فاخرہ جہاں نے اس کی بات سن کر بے ساختہ اسے گلے سے لگا لیا۔

''میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی میری بچی...... لیکن مجھے یقین ہے جب تم دل سے سب کچھ فراموش کر دو گی تو اس گھر میں ضرور واپس آ جاؤ گی کیونکہ یہی تمہارا اصل گھر ہے اور یہ تمہارے ماں، باپ کا بھی گھر ہے اور مجھے اس دن کا انتظار رہے گا۔''

شفا نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور پھر وہ اس سے الگ ہو کر اسے شہریار کے ساتھ اس امید پر رخصت کر رہی تھیں کہ وہ ایک دن لوٹ کر یہیں آئے گی جبکہ شاہ میر، ماں کی اس امید پر مزید افسردہ ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا اسفندیار سے شادی کے بعد وہ کبھی اس گھر میں لوٹ کر نہیں آسکے گی اور یہ اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا، البتہ یہ جان کر شفا کو بھی اچھا لگا تھا کہ عنایا کا رشتہ سمیر کے ساتھ طے تھا اور ان دونوں کی شادی شمسہ کی ڈیتھ کی وجہ سے ملتوی کر دی گئی تھی۔ ان چند دنوں میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ سمیر اسے بہت خوش رکھے گا۔ وہ اس کے مزاج سے بچپن سے واقف تھی۔ وہ اپنے باپ کی طرح نرم خو اور صلح پسند تھا، رشتوں کو عزت اور ان کا مقام دینا خوب جانتا تھا۔ یہاں کراچی آ کر ہی اسے عنایا اور سمیر کے رشتے کے بارے میں پتا چلا تھا۔ پہلے تو وہ یہی جانتی تھی کہ عنایا کی منگنی شہریار آفریدی کے فیملی فرینڈز میں ہوئی ہے، اب یہ جان کر اور خوشی ہوئی کہ عنایا اس کے خاندان کا حصہ بننے جا رہی ہے جنہوں نے شمسہ اور شفا کو کبھی غیر نہیں سمجھا تھا۔

شاہ جہاں لاج سے واپس آنے کے بعد اس نے کراچی کے ایک بڑے اسپتال میں جاب اپلائی کر دی تھی۔ اب وہ یہیں رہ کر کام کرنا چاہتی تھی اور اس بھاگ دوڑ میں اسے شاہ جہاں لاج جانے کا خیال ہی نہیں رہا تھا حالانکہ اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان لوگوں سے ملنے آتی رہے گی اور اب تو شمسہ کے چالیسویں کے بعد عنایا اور سمیر کی شادی کی ڈیٹ بھی فکس کر دی گئی تھی لہٰذا وہ کبھی کبھار عنایا کی شاپنگ میں مدد بھی کر دیا کرتی تھی۔

آج بھی وہ عنایا کے ساتھ ڈیزائنر کے پاس سے ہو کر تھکی ہوئی واپس آئی تھی جب پتا چلا کہ فرجاد تایا اس سے ملنے آئے بیٹھے ہیں۔ وہ فریش ہونے کا ارادہ بعد پر رکھ کر سیدھا ڈرائنگ روم میں چلی آئی جہاں شائستہ بیگم اور شہریار صاحب کے پاس فرجاد احمد بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے سب کو مشترکہ سلام کیا اور فرجاد صاحب نے صوفے پر سے اٹھ کر سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا پھر وہ ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر باتیں کرنے لگی تو شائستہ بیگم ان لوگوں کے کھانے کا انتظام دیکھنے کا کہہ کر وہاں سے اٹھ گئیں۔ شہریار صاحب بھی فون سننے کچھ دیر بعد وہاں سے اٹھ کر چلے گئے تو فرجاد صاحب اسے سمیر کی شادی کے حوالے سے انوائٹ کرنے لگے۔ شائستہ تو وہ سمیر کی چچا زاد بہن تھی، وہ سب بھی چاہتے تھے کہ شفا سمیر کی شادی میں ان کی طرف سے شریک ہو۔ سمیر کی بھی یہی خواہش تھی۔

''بیٹا! پہلے مجھے اس بات کی تکلیف تھی کہ میرے ہوتے ہوئے اب تم ہمارے ساتھ اپنے گھر میں رہنے کے بجائے کسی اور جگہ پر رہو لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ شاید تم نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا کیونکہ جس طرح شہریار اور اس کی فیملی نے تمہیں اور شمسہ بھابی کو سپورٹ کیا ہے، ہر مشکل میں تم لوگوں کا ساتھ دیا ہے تو ان کا بہت حق بنتا ہے، اس پر اب مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ جب بھی اسفندیار کے ساتھ تمہاری شادی ہو تو تم اپنے حقیقی گھر سے ہم سب کی دعاؤں کے سائے میں رخصت ہو۔ شاید اسی فرض کو ادا کر کے میں سجاد اور شمسہ بھابی کی روح کے سامنے سرخرو ہو سکوں۔''

ان کی اس بات پر وہ یک دم ناسمجھی سے انہیں دیکھنے لگی پھر یاد آنے پر کہ فرجاد چچا نے بھی اپنے بیٹے شاہ میر کا پروپوزل اس کے لیے دیا تھا۔ یہ بات وہ جانتی تھی کہ

digest-library.com

شہریار آفریدی بھی اسفندیار کے حوالے سے اسے اپنی بہو بنانے کی بات فرجاد صاحب سے کر چکے ہیں لیکن فرجاد یہ نہیں جانتے تھے کہ کراچی آنے کے بعد بھی شہریار نے فیصلہ شفا کی مرضی پر چھوڑ دیا تھا اور انہوں نے اس بارے میں گھر میں کسی سے بات نہیں کی تھی۔ وہ پہلے عنایا کی شادی سے فارغ ہونا چاہتے تھے، شفا نے فی الحال جاب کرنے کا فیصلہ کیا تھا البتہ شاہ میر کے پروپوزل کا سن کر اس بات کی لاشعوری طور پر منتظر تھی کہ شاہ میر بھی اس حوالے سے کوئی بات ضرور کرے گا یا پھر یہ خواہش صرف فرجاد چچا کی ہی تھی کہ وہ لوگ اسے اپنے ساتھ اس گھر میں ہمیشہ کے لیے رکھنے کی وجہ سے ایسا چاہتے ہیں۔ محض اس جواز پر تو وہ زبردستی کسی پر مسلط ہونے کے حق میں ہرگز نہیں تھی۔ بہرحال وہ اس معاملے میں خاموش ہی رہی تو فرجاد کو یاد آیا کہ وہ کس مقصد سے یہاں آئے تھے۔

''ایک بات تو میں تم سے کرنا ہی بھول گیا، دراصل ہم سب یہ چاہتے ہیں، خاص طور پر سمیر کی یہ خواہش ہے کہ اس کی شادی پر تم ہماری طرف سے اس کی بہن کی حیثیت سے دولھا کی بہن کے اسپیشل پروٹوکول کے ساتھ شریک ہو تو ہم سب کو بہت خوشی ہوگی۔''

عنایا اسے بہنوں کی طرح عزیز تھی۔ اس کی شادی پر اسے وہاں رہتے ہوئے ان ہی کی طرف سے شرکت کرنی تھی، اب تایا کی خواہش جان کر اس نے ان کی طرف سے بھی کسی فنکشن میں شریک ہونے کی ہامی بھرلی تھی۔ کیا کرتی، وہ انہیں منع نہیں کرسکتی تھی۔

''جی ضرور تایا جان! سمیر سے کہیے گا کہ میں ضرور اس کی خواہش پوری کروں گی، آخر میں اس کی بہن ہوں اس لیے وہ بےفکر رہے، بہنوں والے سارے نیگ وصول کر کے اس کی ساری پاکٹ میں نے ہی خالی کروانی ہے۔''

شفا کی اس بات پر فرجاد صاحب پہلی بار خوشی اور اطمینان کے تاثر کے ساتھ ہلکا سا مسکرائے۔ اس کی بات سے انہیں بھرپور اپنایت کا احساس ہوا۔

''ضرور بیٹا، سارے حق تمہارے ہی بنتے ہیں، تم نے ہامی بھر کے مجھے بہت خوشی دی ہے۔ جانے سے پہلے میں تمہیں تمہاری امانت دینا چاہتا ہوں تاکہ تم اسے سنبھال کر اپنے پاس رکھ سکو۔''

یہ کہہ کر فرجاد صاحب نے ایک فائل اس کی طرف بڑھائی تو وہ ناسمجھی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہ کیا ہے تایا جان...... یہ کس چیز کی فائل ہے؟''

''بیٹا، یہ خاندانی پراپرٹی میں سجاد کے حصے کی فائل ہے جس میں تمام ضروری ڈاکیومنٹس موجود ہیں اور اب اس پر تمہارا حق بنتا ہے۔ سجاد کی یہ امانت جو میں نے سالوں سے سنبھال کر رکھی تھی اب تمہارے حوالے کررہا ہوں۔'' وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

ایک لمحے کے لیے وہ خاموش رہ گئی۔ وہ تو یہی سوچتی تھی کہ تائی جان نے سالوں پہلے اسے اور اس کی ماں کو گھر سے بےدخل اسی لیے کیا تھا تاکہ اس کے باپ کے حصے کی جائداد پر وہ اکیلے ہی قبضہ کرسکیں مگر یہاں پر اس کی سوچ غلط ثابت ہوئی تھی۔ فاخرہ جہاں نے جو کچھ ان ماں، بیٹی کے ساتھ کیا اس میں فرجاد صاحب کا کوئی قصور نہیں تھا اور اگر فاخرہ جہاں کدورت پسند اور حاسد ہونے کے ساتھ غاصب بھی ہوتیں تو کبھی فرجاد صاحب کو یہ جائداد کے پیپرز شفا کے حوالے کرنے نہیں دیتیں۔ یہ جان کر اس کا دل تائی جان کی طرف سے مزید صاف ہوگیا اور اپنی ماں کی مغفرت و سکون کے لیے اس نے انہیں کھلے دل سے معاف کردیا تھا پھر بھی وہ اس فائل کو فرجاد تایا کو واپس کرنا چاہتی تھی۔ اسے کسی چیز کی خواہش نہیں تھی۔

''میں اس کا کیا کروں گی تایا جان؟ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، ماما نے اپنی محنت سے صرف میری پرورش و تربیت ہی نہیں کی بلکہ اعلیٰ تعلیم دلوا کر مجھے اپنے پیروں پر بھی کھڑا کیا ہے۔ میرے لیے ان کی دعائیں اور اللہ کا کرم ہی کافی ہے۔''

اس کی بات سن کر فرجاد صاحب آبدیدہ لہجے میں بولے۔

''ہاں بیٹا، اس میں کوئی شک نہیں کہ شمسہ بھابی نے تمہاری پرورش میں ماں اور باپ دونوں کا فرض ادا کیا جبکہ سجاد کے جانے کے بعد یہ میری ذمّے داری بنتی تھی لیکن بدقسمتی سے مجھے اپنی یہ ذمّے داری پوری کرنے کا موقع نہیں مل سکا مگر اب میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دوں گا اور یہ تمہارا جائز، قانونی اور شرعی حق بنتا ہے جسے تمہیں قبول کرنا ہی ہوگا تاکہ مرنے کے بعد میں اپنے اللہ کے سامنے سرخرو ہوسکوں۔''

یہ کہہ کر انہوں نے فائل شفا کی گود میں رکھ دی تو وہ بےساختہ بولی۔

"اللہ آپ کو سلامت رکھے تایا جان، آپ کا سایہ ہم پر ہمیشہ قائم رہے، آپ کے سوا میرا اب ہے ہی کون۔"

وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ٹھیک ہے بیٹا، اب میں چلتا ہوں، تم اپنا خیال رکھنا اور وہ گھر ہمیشہ سے تمہارا بھی ہے، تم جب چاہو وہاں رہنے، ہم سے ملنے آسکتی ہو بیٹا...... اور میں یہ چاہتا ہوں کہ عنایا اور سمیر کی شادی میں شرکت کے لیے تمہارے حصے کی شاپنگ میری طرف سے ہو۔ تمہارے پاس جو بھی ٹائم ہو مجھے فون کر دینا، میں اپنی بیٹی کو خود شاپنگ پر لے کر جاؤں گا۔"

اور وہ ان کے اتنے خلوص اور محبت پر اثبات میں سر ہلا کے رہ گئی۔

"بہت شکریہ بیٹا، تم جہاں بھی رہو ہمیشہ میری دعاؤں کی چھاؤں میں رہو گی اور میری دعا ہے خدا تعالیٰ تمہیں دنیا جہاں کی خوشیاں نصیب کرے۔"

وہ اس کا سر تھپتھپاتے ہوئے وہاں سے خدا حافظ کہہ کر چلے گئے اور وہ گود میں رکھی فائل کو دیکھتے سوچ رہی تھی کہ اللہ پاک بڑا رحیم و کریم ہے، بے شک وہ اپنے بندے کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا، اس کے صبر و حوصلے کا صلہ گمان سے بڑھ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے رب کی مہربانی پر شکر گزار تھی۔

☆☆☆

قسمت کی کتنی بڑی ستم ظریفی تھی کہ جب وہ شفا سے اپنے حقیقی رشتے اور تعلق سے بے خبر تھا تو وہاں ڈھم ٹور میں وہ اس کی آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ وہ جب چاہتا اسے دیکھ سکتا، باتیں کر سکتا تھا مگر اب جب وہ شہریار آفریدی کے گھر شفٹ ہو گئی تھی اور ہمیشہ وہیں رہنے والی تھی، اپنی کزن ہونے کے ناتے بھی وہ آفریدی ہاؤس اس سے ملنے جلنے، اسے دیکھنے کی خواہش کے باوجود ایک بار بھی وہاں اس سے ملنے نہیں گیا تھا۔

گھر میں سمیر کی شادی کی تیاریاں چل رہی تھیں مگر شاہ میر ہر بات سے بے نیاز اپنی نئی جاب میں مگن تھا۔ شمسہ کی دائمی جدائی کا دکھ اپنی جگہ مگر ایک مستقل اداسی اور سوگواری نے اس کے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ شفا کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے کا دکھ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ فرصت میسر آتے ہی سمیر نے اس کی کلاس لی تھی کہ اپنی جاب روٹین میں وہ شادی کی کسی تیاری میں حصہ لینے کے بجائے سب سے الگ تھلگ رہ کر ہی باقی کا وقت گزار رہا تھا مگر سمیر بھی اس کا بڑا بھائی تھا، اس کی اداسی اور مایوسی کی وجہ اس کی زبان سے اگلوا کر ہی دم لیا اور جب اسے سچائی کا علم ہوا تو وہ شاہ میر سے ہمدردی کرنے کے بجائے الٹا اسے ملامت کرنے لگا۔

"آئی ایم سوری شامی...... مگر تو واقعی بڑا اسٹوپڈ واقع ہوا ہے، مجھے تجھ سے اس بزدلی کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ ارے جب محبت کی ہے تو پھر اس کا اظہار کرنے میں بزدلی دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ تجھے تو اسی وقت ہی شفا کو اپنے دلی جذبات سے آگاہ کر دینا چاہیے تھا تاکہ شہریار انکل کی خواہش جاننے کے بعد اسے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو جاتی مگر تو نے تو یہ بزدلی دکھا کر اپنے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کی ہے، مگر اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تو اب بھی شفا کو اپنی فیلنگز کے بارے میں سب کچھ بتا سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے سچائی جاننے کے بعد اس کا فیصلہ بدل جائے۔"

سمیر کی بات سن کر وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ جانے سمیر کو سمجھ کیوں نہیں آرہا تھا کہ شہریار انکل کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر کے شفا نے سب پر یہ واضح کر دیا تھا کہ اسے شاہ میر کے بجائے اسفندیار کا پروپوزل قبول ہے۔ شاہ میر نے شفا کے شہریار انکل کے ساتھ جانے اور ان کے ساتھ رہنے کے فیصلے پر یہی اخذ کیا تھا اسی لیے اب وہ سمیر کی بات سن کر بیزاری سے بولا۔

"کم آن برو...... تم جانتے ہو اب یہ ممکن نہیں ہے پھر اس طرح کا فضول مشورہ کیوں دے رہے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ پاپا کی خواہش جاننے کے بعد بھی شفا نے شہریار انکل کے ساتھ ان کے گھر جا کر رہنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس کا تو یہی مطلب ہوا ناں کہ شفا کو بھی اسفندیار کے پروپوزل پر کوئی اعتراض نہیں ہے، پھر یہ سب جانتے ہوئے میں کیسے شفا پر اپنی خواہش زبردستی مسلط کر سکتا ہوں۔"

جواباً سمیر نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کم آن یار...... تجھے اتنی سی بات سمجھ کیوں نہیں آرہی کہ اگر شفا کی مرضی اسفندیار کے پروپوزل میں ہوتی تو شہریار انکل کب کے ان دونوں کی منگنی اناؤنس کر چکے ہوتے تب سے! اہم بات یہ ہے کہ اسفندیار تیرا سب سے

Digest Library .com

اچھا دوست ہے، اگر وہ شفا کی ذات میں انٹرسٹڈ ہوتا تو دوست ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے تجھے اس بارے میں پتا ہوتا، اسفندیار تیرا جگری یار ہے، وہ تجھ سے یہ بات کبھی نہیں چھپاتا۔ اگر تجھے اب بھی ایسا کوئی خدشہ ہے تو، تو اسفندیار سے خود اس بارے میں بات کیوں نہیں کر لیتا، سب کچھ تیرے سامنے کلیئر ہو جائے گا۔ اس طرح بعد میں تجھے کم از کم یہ افسوس تو نہیں رہے گا کہ تو نے اصل معاملہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔''

اس نہج پر تو شاہ میر نے سوچا ہی نہیں تھا۔ یک دم ہی اس کے دل ودماغ پر سے مایوسی ودکھ کے چھائے بادل چھٹ گئے اور اس نے بے ساختہ ہی سمیر کو گلے سے لگا لیا۔

''تھینک یو برو...... تھینک یو سوچ...... اس بارے میں تو واقعی میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔''

''تو اب سوچ لے میرے بھائی۔ اور اس معاملے میں مزید دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے نکاح کے چھوہاروں کے ساتھ تجھے پھر اسفندیار اور شفا کے نکاح کے چھوہارے بھی کھانے پڑ جائیں۔''

اور سمیر کی اس شرارت پر شاہ میر نے اسے گھور کر دیکھا پھر وہاں سے تیزی سے چلا گیا۔ پیچھے اسے سمیر کی آواز سنائی دی۔

''بیسٹ آف لک مائی اسٹوپڈ براور!''

اور سمیر کو جواب دینے کے لیے شاہ میر واپس مڑا نہیں تھا، اسے سمیر کو جواب دینے سے زیادہ شفا اور اسفندیار کا معاملہ کلیئر کرنے کی جلدی تھی۔

☆☆☆

شفا کے آفریدی ہاؤس شفٹ ہونے کے بعد فرجاد صاحب تو اکثر ان کے گھر اس سے ملنے جاتے رہتے تھے مگر اب وہ کس دل سے اس لڑکی کا وہاں سامنا کرتا جسے وہ نہ چاہ کر بھی اپنے دوست اسفندیار کی امانت سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا حالانکہ اسے دیکھنے، اس سے ملنے کی خواہش دل میں شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ تو اس کا کزن بھی تھا مگر شفا کے ایک فیصلے نے اسے کسی بھی نہج پر سوچنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ شکر تھا کہ اس نے آج سمیر کے سامنے اپنے دل کی بات شیئر کر دی اور سمیر کے سمجھانے پر ہی وہ مایوسی کا دامن جھٹک کر آج اسفندیار سے ملنے آفریدی ہاؤس آن پہنچا تھا۔

اسفندیار اسے لان میں ہی فون پر کسی سے بات کرتا مل گیا۔ شاہ میر کو دیکھ کر اس نے کال مختصر کر کے فون آف کر کے اس کی طرف قدم بڑھائے اور بڑی گرمجوشی سے آ کر اس سے ملا۔

''تھینک گاڈ...... تجھے بھی یہاں آ کر اپنا چہرہ دکھانے کی فرصت مل گئی ہے ورنہ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ تو نے بھی سمیر بھائی کی طرح مایوں بیٹھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ سمیر بھائی کے ساتھ تیرا بندوبست بھی تو نہیں ہو گیا؟''

اسفندیار کی اس بات پر وہ جھینپ کر کھسیانے لگا۔

''عنایا بھی مجھ سے شکایت کر رہی تھی کہ تو اس کی شادی کی تیاریوں میں بالکل بھی حصہ نہیں لے رہا اسی لیے وہ تجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔ اب اس بیچاری کو کیا پتا کہ تو اپنی ہونے والی سسرال میں ابھی سے چکر لگانے سے کترا رہا ہے۔''

اسفندیار کی اس بات پر وہ بدک کر اس کے گلے سے الگ ہوا اور برجستہ بولا۔

''کیا مطلب ہے تیری اس بات کا؟ شفا نے تو شہریار انکل کے ساتھ اس گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا تو اس کا یہی مطلب ہوا ناں کہ اس نے تیرے پروپوزل کے لیے ہاں کی ہے۔''

اور اس بار بدک کر پیچھے ہٹنے کی باری اسفندیار کی تھی۔ اس نے ناگواری سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا فضول بکواس ہے شامی...... شفا کو میں عنایا کی طرح اپنی بہن ہی سمجھتا ہوں اور شفا کے پروپوزل کے لیے میں نے پاپا سے پہلے ہی انکار کر دیا تھا۔ میں تو اپنے لیے لائف پارٹنر پسند کر چکا ہوں اور شفا نے بھی میرے پروپوزل کے لیے پاپا کو منع کر دیا تھا کہ وہ مجھے اپنے سگے بھائی کی طرح سمجھتی ہے اسی لیے میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اب اس کی شادی تجھ سے ہی ہو گی کیونکہ اس کے لیے دوسرا پروپوزل تیرا ہی پیش کیا گیا تھا۔ تو کیا شفا نے اب تک تیرے پروپوزل کے لیے ہامی نہیں بھری حالانکہ تو، تو اچھا خاصا ہینڈسم بھی ہے۔''

اسفندیار نے شرارتاً افسوس کا اظہار کیا تو شاہ میر کی اس انکشاف کو سن کر جان میں جان آئی مگر اسے خود پر غصہ بھی آیا کہ شفا کے شہریار انکل کے ساتھ آفریدی ہاؤس آنے پر اس نے خود ہی شفا کے بارے میں یہ سمجھ لیا کہ

اس نے آفریدی ہاؤس جانے کا فیصلہ کر کے اسفندیار کے پروپوزل کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ شہریار آفریدی نے بھی بیٹی کی شادی کے انتظامات میں بزی ہو کر شفا سے اب تک اس دوسرے پروپوزل کے بارے میں اس کی مرضی نہیں پوچھی تھی۔ اس کے جاب کرنے کے فیصلے پر وہ یہی سمجھے تھے کہ ابھی وہ شادی کرنا نہیں چاہتی ہے اور اب اسفندیار کے اس نئے اور جاں فزا انکشاف نے اس کے دل میں گہرائی تک سرشاری ہی سرشاری بھر دی تھی وہیں اسفندیار کی طرف سے لائف پارٹنر پسند کرنے کے اس انکشاف پر بھی وہ اس کی کلاس لینا چاہتا تھا تب ہی شفا لان میں داخل ہوئی [illegible] دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گیا سوائے اسے مسلسل دیکھنے کے اور اسفندیار نے اس کی یہ چوری پکڑلی تھی تب ہی شاہ میر کے کان میں سرگوشی کرتے شرارتاً بولا۔

"مجھے تو لگتا ہے کہ فرجاد انکل نے شفا کے لیے تو پروپوزل تیری مرضی اور پسند جاننے کے بعد ہی دیا ہوگا تب ہی تو، تو شفا کو اس طرح گھور رہا ہے مگر میں تجھے یوں دن دیہاڑے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی بہن کو تاڑنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا جب تک شفا خود اور گھر کے بزرگ شرعی اور قانونی طور پر تجھے اس طرح تاڑنے کا اجازت نامہ نہ دے دیں۔"

اسفندیار نے شرارت کے ساتھ مصنوعی گھوری مارتے ہوئے سرگوشی کی تو شاہ میر نے اس کے کندھے پر دھپ رسید کی، تب تک شفا وہاں ان کے پاس آچکی تھی۔ اسفندیار نے جھینپ کر اپنا کندھا سہلایا۔

"السلام علیکم!"

شفا نے اتنے دنوں بعد اسے اس گھر میں اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر کچھ اور سمجھ نہیں آیا تو فوراً سلام کر ڈالا۔ شاہ میر نے اس کا خوشدلی سے جواب دیا۔

"وعلیکم السلام...... کیسی ہیں آپ؟"

شاہ میر کو بھی اسے یوں اچانک سامنے پا کر کچھ نہ سوجھی تو فوراً سلام کے جواب کے بعد اس کی خیریت دریافت کرلی۔

"جی...... میں ٹھیک ہوں، بس عنایا کے ساتھ اس کی شاپنگ میں بزی تھی۔"

اور اس سے پہلے اسفندیار دونوں کو بات کرنے کا موقع اکیلے میں دینے کے لیے کوئی جواز سوچتا، اس نے فوراً ہی فرجاد انکل کی بات یاد آنے پر شفا کو مخاطب کیا۔

"ارے ہاں یاد آیا...... وہ فرجاد انکل کا فون آیا تھا، وہ کہہ رہے تھے کہ وہ کچھ بزی ہیں اس لیے انہوں نے شاہ میر کو تمہارے ساتھ شاپنگ پر جانے کے لیے بھیجا ہے۔ ویسے بھی تم نے عنایا کی شادی کے لیے کچھ تیاری نہیں کی ہے اس لیے میرا مشورہ ہے لڑکی...... آج اس شاہ میر کا اچھا خاصا بینک بیلنس خالی کرنے کا بہت نادر چانس مل رہا ہے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور
ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے
بیرونِ ممالک کے لیے زرِ سالانہ 30,000 روپے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین
یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں
رابطہ:
مرزا ثمر عباس
0334-5498977
0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

تمہیں اس لیے اسے مس کرنے کا سوچنا بھی مت بلکہ فوراً سے پیشتر شاپنگ پر جانے کے لیے تیار ہو کر آجاؤ۔“

اور اسفندیار کے اس جھوٹ پر جہاں شاہ میر کا پہلا تاثر اس کی طرف ہونقوں کی طرح دیکھنے کا تھا مگر اس کے بعد اسفندیار کا جھوٹ اپنے حق میں جاتا دیکھ کر اسے دل ہی دل میں اپنے یار کی دوستی پر پیار آیا تھا اور جی چاہ رہا تھا کہ اسے ایک بار پھر سے گلے سے لگالے۔ اس کی بینک بیلنس والی بات پر شفا اور شاہ میر دونوں ہی بیک وقت مسکرائے۔

شفا نے تائید کے لیے شاہ میر کی طرف دیکھا کہ آیا اسفندیار ٹھیک بھی کہہ رہا ہے کہ اسے فرجاد تایا نے ہی بھیجا ہے، سو شاہ میر نے شفا کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ہامی بھرلی۔

”اگر آپ بزی نہ ہوں تو اسفندیار کی آفر بلا جھجک قبول کرسکتی ہیں کیونکہ مجھے اپنا بینک بیلنس واقعی میں خالی ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

جواباً شفا کوئی بات کیے بغیر ہلکا سا مسکرائی اور ساتھ کھڑے اسفندیار نے شاہ میر کو معنی خیز نگاہ سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، حالات بھی اس کے حق میں ہیں۔

”اب کھڑی کیا ہو لڑکی، فوراً سے پیشتر اس آفر کو قبول کرکے جلدی سے تیار ہوجاؤ، کہیں ایسا نہ ہو اس کنجوس مکھی چوس کا ارادہ ہی بدل جائے۔“

اس بار شاہ میر کھل کر مسکرایا تھا اور شفا جھینپ کر واپس پلٹ کر اندر کی جانب چلی گئی تو اگلے لمحے شاہ میر نے واقعی آگے بڑھ کر دوسری بار اسفندیار کو بھینچ کر گلے سے لگاتے شکریہ ادا کیا۔

”تھینک یو میرے یار...... تھینک یو سو مچ۔“

شاہ میر کے دل کی بات کو سمجھتے ہوئے اسفندیار نے خوشدلی سے اس سے الگ ہوتے مشورہ دے ڈالا۔

”کم آن یار، میرا شکریہ ساری زندگی ادا کرتے رہنا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر ابھی اس شاپنگ کے موقع کا فائدہ اٹھا کر شفا کو ضرور پرپوز کردینا، ہوسکتا ہے وہ اپنا جواب آج ہی دے دے۔ سو میری طرف سے بیسٹ آف لک، میرے جگری یار!“

اسفندیار نے آخر میں اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے مشورہ دیا تو وہ اس بار کھل کر مسکرایا۔ اداسی اور مایوسی کے بادل یکایک چھٹ گئے تو شاہ میر کے دل کی طرح سارے وجود پر بھی سرشاری کا سرسبز موسم اتر آیا۔

اس نے مسکرا کر خوشدلی سے اسفندیار کو دیکھا۔

☆☆☆

شفا کو سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح کا ڈریس اپنے لیے سلیکٹ کرے۔ اسپتال کی جاب کی وجہ سے وہ مخصوص ڈریسنگ ہی کرتی تھی اور اس سے پہلے خاندان میں کسی قریبی رشتے دار کی شادی میں شرکت کا موقع ہی نہیں آیا تھا، اب بارات اور ولیمے کے فنکشن کے لیے اسے خود ہی ڈریسز پسند کرنے تھے ورنہ عنایا نے تو اپنے ساتھ اسے مایوں، مہندی کے لیے اپنی پسند سے کپڑے دلوادیے تھے۔ وہ منع بھی کرتی رہی تھی کہ وہ اتنے لش پش ڈریسز کو سنبھال نہیں سکے گی مگر اس نے اسے یہ کہہ کر چپ کروادیا تھا کہ ابھی اسے عنایا کی مرضی سے ہی ڈریسنگ کرنی پڑے گی، بعد میں وہ اپنی شادی پر اپنی مرضی سے ڈریسز بنوالے عنایا کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور شفا کو اس وقت اس کی ضد پر چپ ہونا پڑا تھا اور اب سمیر کی بارات اور ولیمے کے لیے فرجاد تایا نے اسے اپنی طرف سے ڈریسز اور دوسری ضروری چیزوں کی شاپنگ کے لیے کہا تھا تو اب اسے ڈیزائنر بوتیک میں بیٹھے بہت سے تیار جوڑے دیکھ کر بھی چوائس کرنی مشکل ہورہی تھی تو شاہ میر اس کے پاس چلا آیا۔

”کیا ہوا، آپ نے اب تک کوئی ڈریس سلیکٹ نہیں کیا؟“

اور کنفیوز سی بیٹھی شفا نے جواباً اپنی مشکل بیان کردی۔

”آئی ایم سوری...... لیکن مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے، یہاں تو سارے ڈریسز ہی اتنے ہیوی ہیں، میں نے اس سے پہلے کبھی ٹرائی نہیں کیے اس لیے چوز کرنا مشکل ہورہا ہے۔“

”کیا میں آپ کی ہیلپ کرسکتا ہوں؟“ شفا کی بات پر وہ دوستانہ لہجے میں بولا۔

شفا نے فوراً ہی اثبات میں سرہلادیا کہ مزید دیر نہ ہو۔ وہ خود تو فیصلہ کرنے میں کافی وقت ضائع کرچکی تھی، اب یہ کام شاہ میر کی اس آفر پر اسی پر ڈال کر پرسکون ہوگئی کہ پسند نہ آیا تو منع کردے گی۔

اور پھر شاہ میر نے ایک بہت ہی یونیک سے ڈیزائنر سوٹ کو سلیکٹ کرکے شفا کی رائے لینی چاہی۔ وہائٹ کلر پر ڈل گولڈن لائٹ کلر کی ایمبرائڈری والی لانگ

فراک ٹراؤزر کے ساتھ بڑا سا دوپٹا جس کے کنارے پر ڈل گولڈن کلر کی ہلکی سی ایمبرائڈری کے ساتھ دوپٹے کے چاروں کونوں پر پرلز لٹک رہے تھے جبکہ ولیمے کے فنکشن کے لیے انگوری کلر کی لانگ اسٹریٹ شرٹ پر تنگ پاجامہ اور بڑا سا دوپٹا جس پر شاکنگ پنک کلر کی ہلکی ایمبرائڈری ہوئی تھی۔ یہ دونوں ڈریسز ہیوی بھی نہیں تھے مگر شادی کے اہم فنکشنز کی مناسبت سے پرفیکٹ نظر آرہے تھے اسی لیے اس کے مزاج کو سمجھتے ہوئے پسند کیا تھا۔

''یہ دونوں ڈریسز کیسے رہیں گے شفا؟''

شاہ میر کے ڈسپلے پر موجود ڈریسز کی طرف اشارہ کرنے پر شفا نے دل ہی دل میں اس کی پرفیکٹ چوائس کو سراہا۔ وہ شاید ایسی ہی ڈریسنگ چاہتی تھی جو اسے پہن کر بہت ہیوی اور آکورڈ نہ لگے۔ اس نے فوراً سے پیشتر دونوں آؤٹ فٹس کو اوکے کر دیا۔

''جی ٹھیک ہے، آپ کی چوائس واقعی پرفیکٹ ہے، بس ان ہی دونوں کو پیک کروالیں۔''

اور شفا کے ستائشی جملوں نے شاہ میر کے دل میں یک گونہ خوشی سی بھر دی۔ اس نے کاؤنٹر پر جانے سے پہلے ایک بار پھر شفا سے یقین دہانی چاہی۔

''پلیز آپ کرٹسی سے کام مت لیں، اگر کسی اور ڈیزائنر ہاؤس چلنا چاہیں تو مجھے کوئی پرابلم نہیں ہے، آپ تسلی سے دیکھ کر ہی اوکے کریں۔''

اور شاہ میر کی اس بات پر اسے اچھا محسوس ہوا تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ ٹائم ویسٹ ہونے کے خیال سے جلد بازی میں اپنی پسند سے ہٹ کر شاپنگ کرے مگر بعد میں وہ چیزیں ناپسندیدہ ہونے کی وجہ سے دل سے اتر جائیں جبکہ ابھی، ابھی اسے اس بات کا بھی احساس ہوا تھا کہ شفا کی پسند، ناپسند نہ جاننے کے باوجود شاہ میر نے اس کے لیے پرفیکٹ ڈریسز کا انتخاب کیا تھا جس کے بعد وہ اس مشکل کے اتنی جلدی حل ہو جانے پر خوش اور پرسکون بھی نظر آرہی تھی۔ تب ہی جواباً پرسکون لہجے میں بولی۔

''نہیں شاہ میر...... مجھے کہیں اور نہیں جانا ہے۔ یہ ڈریسز واقعی مجھے بہت پسند آئے ہیں، تھینک یو...... آپ کی ہیلپ نے ہمیں مزید تھکنے سے بچالیا ہے ورنہ میں تو اپنی کنفیوژن میں شاید کچھ بھی سلیکٹ نہیں کر پاتی۔''

اور شاہ میر نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے سر کو خم کے انداز میں جھکاتے ہوئے برجستہ کہا۔

''تھینکس تو مجھے آپ کو کہنا چاہیے ورنہ لڑکیاں تو اس قسم کے فنکشنز تو کیا عام شاپنگ میں بھی سچ مچ اپنے جوتے گھسا کر بھی مطمئن نہیں ہوتی ہیں۔ عنایا بھابی نے بھی شادی کی شاپنگ میں سمیر بھائی کے جوتے گھسوا دیے ہیں مگر آپ نے تو ایک ہی وزٹ میں سب کچھ اوکے کر دیا ہے۔ رئیلی...... I appreciate you''

اور شاہ میر کی بات پر وہ بس مسکرا کے رہ گئی۔ پھر شاہ میر نے جلد ہی دونوں ڈریسز پیک کروا کے شاپنگ بیگز اٹھائے اور دونوں شاپ سے باہر نکل آئے۔ بس اب میچنگ جیولری، کلچ اور سینڈلز باقی تھے، اس میں بھی شفا نے زیادہ ٹائم نہیں لگایا۔ وہ شاپنگ مکمل کر کے باہر پارکنگ ایریا میں داخل ہوئے تو شاہ میر نے جھجکتے ہوئے شفا کو مخاطب کیا۔

''ایکسکیوز می شفا!''

وہ جو گاڑی کی جانب بڑھ رہی تھی پلٹ کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ایکچوئیلی...... میں یہ سوچ رہا تھا کہ اسفندیار ٹھیک کہہ رہا تھا، مجھے نئی جاب کے بعد آپ لوگوں کو ٹریٹ ضرور دینی چاہیے تھی۔ اب اسفندیار تو ہمارے ساتھ ہے نہیں، تو کیا میں آپ کو لنچ کے لیے انوائٹ کر سکتا ہوں۔ آپ تھک بھی گئی ہوں گی اور بھوک بھی لگ رہی ہوگی۔''

وہ شاہ میر کے درست اندازے پر ہلکا سا مسکراتے ہوئے اسفندیار کی شرارت یاد آنے پر بولی۔

''مجھے لگتا ہے شاہ میر...... آپ نے اسفی بھائی کی شرارت کو سیریس ہی لے لیا ہے مگر سچ میں میرا آپ کی پاکٹ خالی کروانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ آپ نے پہلے ہی اتنی اچھی شاپنگ کروادی ہے، یہ کافی ہے مگر بھوک تو واقعی لگ رہی ہے اس لیے انکار نہیں کر سکتی۔''

اور شفا کے ہلکے پھلکے موڈ میں دیے گئے جواب نے اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ وہ پہلی بار اسے اتنے لائٹ اور اپنائیت بھرے موڈ میں دیکھ رہا تھا۔

''تھینکس شفا...... مگر بے فکر رہیں میری جاب کا سیلری پیکیج بہت شاندار ہے۔ اسفندیار سے کہیے گا کہ مجھے اسے ٹریٹ دینے میں کوئی پرابلم نہیں ہوگی، اینی ٹائم اینڈ اینی ویئر!''

اس نے مسکراتے ہوئے شفا کے لیے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولا تو وہ بھی مسکراتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی تھا جس کے ساتھ ہی شاہ میر نے شاپنگ بیگز گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھتے ہی کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھادی۔ شاہ میر اسے اپنے فیورٹ ریسٹورنٹ لے کر جا رہا تھا اور شفا سارا وقت اس کی کمپنی میں بہت کمفرٹیبل محسوس کر رہی تھی۔

شاپنگ کے بعد ایک بہترین لنچ کو انجوائے کر کے وہ شام تک ہی گھر پہنچے تھے۔ شاہ میر نے اسے آفریدی ہاؤس ڈراپ کر دیا تھا مگر گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی اسے کسی قسم کی فارمیلیٹی میں پڑنے سے روک دیا تھا کیونکہ شفا واقعی اسے تھینکس کہنا چاہتی تھی۔ تب وہ اس شخص کی ایک اور خوبی سے آگاہ ہوئی اور اس نے دل میں تسلیم کیا کہ اس کی ماما کو واقعی اچھے لوگوں کی پہچان تھی۔ وہ بہت اچھی فیلنگز کے ساتھ گھر لوٹی تھی۔ عنایا اور بیگم آفریدی نے شاہ میر کی چوائس (شاپنگ) کو بہت سراہا۔

اگلے دن مہندی، مایوں کا کمبائن فنکشن تھا اس لیے وہ کچھ دیر ریسٹ کرنے کے بعد عنایا کی فائنل تیاریوں میں اس کی مدد کر رہی تھی البتہ سمیر کی طرف سے فون کال پر اصرار کرنے پر اس نے اس کی خوشی کے لیے بارات میں اس کی طرف سے دولھا کی بہن کے اسپیشل پروٹوکول کے ساتھ شریک ہونے کی ہامی بھر لی تھی۔ مایوں، مہندی اور ولیمے میں اسے آفریدی فیملی کی طرف سے شامل ہونا تھا۔

☆☆☆

آج سمیر کی بارات تھی اس لیے اسفندیار، شفا کو ناشتے سے فارغ ہوتے ہی شاہ جہاں لاج ڈراپ کر گیا تھا۔ فاخرہ جہاں نے تو پہلے سے ہی اس کا کمرا نئی سیٹنگ کے ساتھ تیار کروادیا تھا۔ بچپن میں وہ اسی کمرے میں رہتی تھی، بعد میں شمسہ اسے سجاد کی ڈیتھ کے بعد اپنے بیڈ روم میں سلانے لگی تھیں۔

وہ شام میں اپنے اسی بیڈ روم میں تیار ہو رہی تھی جبکہ فاخرہ نے اسے پارلر سے تیار ہونے کو کہا تھا لیکن اس نے معذرت کر لی کہ سیلون میں شادی کے فنکشن پر بہت اوور میک اپ کر دیا جاتا ہے۔

جب شام میں وہ تیار ہو کر کمرے سے باہر آئی تو سب سے پہلے فاخرہ جہاں نے ہی ماشاء اللہ کہہ کر اس کی تعریف کرتے ہوئے ماتھے پر پیار بھی کیا تو ان کے لمس سے اسے محسوس ہوا کہ شاید ساری ماؤں کا لمس ایک جیسا ہوتا ہے۔ اسے اپنی ماما کی یاد آ گئی مگر اس خوشی کے موقع پر اس نے اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھا ورنہ سب نے اسے روتا دیکھ کر پریشان ہو جانا تھا۔ اس کے بعد فرجاد صاحب اور سمیر نے بھی اس کی تعریف کی اور ڈریس چوائس کو بھی سراہا۔ اب وہ کیا بتاتی کہ چوائس تو شاہ میر کی تھی مگر اسے بھی بہت پسند آیا تھا۔ فرجاد صاحب نے اس کے سر کو شفقت سے تھپتھپاتے ہوئے دعا دی۔

تایا اور تائی کے ڈریس بھی میچنگ کے تھے اور سمیر تو تھا ہی آج کے فنکشن کا چیف گیسٹ تو عنایا کے برائیڈل ڈریس سے میچنگ اناری ریڈ شیروانی کے ساتھ بلیک پاجامہ اور بلیک کلاہ کے ساتھ وہ کسی ریاست کے شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ ماں نے باقاعدہ اس کی نظر اتاری تھی۔

سمیر نے اسے شادی پر نیگ کے طور پر خاصی بڑی اماؤنٹ کا چیک یہ کہہ کر گفٹ کیا تھا کہ وہ بارات سے واپسی پر نیگ اور رسموں کے نام پر رات دیر تک مصروف رہنے سے بچ جائے گی اسی لیے اس نے ابھی سے ساری ہونے والی رسموں کے نیگ دے دیے تھے البتہ ایک اسپیشل گفٹ اسے عنایا کی بہن اور فرینڈ ہونے کی حیثیت سے بارات والے دن اسٹیج پر ہی ملنا تھا جو اس کے لیے سرپرائز تھا اور وہ ان سب کی طرف سے اسے سمیر کی بہن بلکہ دولھا کی بہن والا اسپیشل پروٹوکول ملنے پر بہت خوشی محسوس کر رہی تھی۔

وہ سب اسے بہت مان دے رہے تھے، لگ ہی نہیں رہا تھا کہ کبھی وہ اس گھر سے گئی بھی تھی۔ سب کو تیار دیکھ کر اسے ایک ہی شخص کا خیال آ رہا تھا جو ابھی تک تیار ہو کر سامنے نہیں آیا تھا۔ تب ہی فاخرہ جہاں کو اس کا خیال آیا اور وہ شوہر سے استفسار کر رہی تھیں۔

''ارے بھئی یہ شاہ میر کہاں رہ گیا ہے، وہ اب تک تیار نہیں ہوا کیا؟''

''مما، وہ تو کب سے تیار باہر پورچ میں کھڑا مجھے میسج کر رہا ہے کہ ہم لوگوں نے تیار ہو کر کب تک باہر آنا ہے۔''

تب ہی سمیر نے انہیں بتایا۔ سمیر کی بات پر سب ہی بے ساختہ مسکرائے کہ وہ بیچارہ باہر کھڑا ان سب کا انتظار

کر رہا تھا۔

''ہاں تو دیر کس بات کی ہے؟ چلو باہر، ہمیں ٹائم پر بینکویٹ پہنچنا ہے۔''

اور پھر سب سے زیادہ پھرتی سمیر نے ہی دکھائی تھی۔ وہ سب سمیر کی Hilux میں آ کر بیٹھ چکے تھے تب ہی سیل فون پر کسی سے بات کرتا شاہ میر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا مگر سمیر کی نظریں اس کے وہائٹ کلر کے ٹو پیس ہاف شیروانی سوٹ پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے پلٹ کر.... بے ساختہ فاخرہ کے ساتھ بیٹھی شفا کے ڈریس پر نظر ڈالی، وہ بھی وہائٹ کلر کے ڈریس میں تیار تھی البتہ شاہ میر کی ہاف شیروانی کے کالرز اور سلیوز پر ڈل گولڈن لائٹ ایمبرائڈری تھی۔ سمیر نے ساتھ بیٹھے شاہ میر کو کہنی مارتے ہوئے سرگوشی میں شرارت کی۔

''واہ یار...... تو نے تو ابھی سے شفا کے ساتھ ڈریس میچنگ اسٹارٹ کر دی ہے۔ لگتا ہے اس نے پروپوزل کے لیے ہاں کر دی ہے۔''

اور سمیر کی اس شوخ شرارت پر شاہ میر نے اسفندیار کو خدا حافظ کہتے ہوئے کال ڈس کنیکٹ کر کے جھینپ کر سمیر کو دیکھا اور بے نیازی سے بولا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے برو...... اب اسے بھی یہی کلر پسند ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ویسے بھی بچپن میں ہم دونوں کی بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی شاید اسی وجہ سے ہم دونوں کی پسند ملتی جلتی ہے۔''

اور اس سے پہلے کہ ان دونوں کو لڑکیوں کی طرح آپس میں کھسر پھسر کرتے دیکھ کر فاخرہ بیگم ٹوکتیں، شاہ میر... نے واچ مین کے گیٹ کھولنے پر گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اور سمیر اس کے جواب پر لاجواب ہو کر مسکرانے لگا مگر شاہ میر کے خوشگوار چہرے اور لبوں پر بڑی دلفریب سی مسکراہٹ دیکھ کر پیچھے بیٹھی شفا بھی ڈریس کلر کے اس اتفاق پر عجیب سے احساس کا شکار ہو رہی تھی، اوپر سے وہ سائڈ مرر میں مسکراتے تاثر کے ساتھ بہت مگن اور خوش صاف نظر آ رہا تھا اور شفا دل ہی دل میں شکر کر رہی تھی کہ میچنگ ڈریسنگ کے اس اتفاق پر فاخرہ اور فرجاد صاحب نے غور ہی نہیں کیا تھا ورنہ خوامخواہ اسے شرمندہ ہونا پڑتا۔

بارات کا شاندار استقبال کیا گیا۔ چونکہ مہندی کی رسم سے پہلے ہی نکاح ہو گیا تھا لہٰذا کچھ دیر بعد اسٹیج پر شہزادیوں کی سی آن بان کے ساتھ عنایا کو لے جا کر سمیر کے ساتھ بٹھایا گیا تو ہر طرف سے ماشاء اللہ اور پرفیکٹ کپل کے نعرے لگنے شروع ہو گئے۔ یہ عنایا کے کزنز تھے۔ بارات کی مخصوص رسمیں شروع ہوئیں تب ہی یہ شور ینگ پارٹی کی طرف سے تھا اور جب دودھ پلائی کی رسم کے لیے دودھ والا گلاس ڈیکوریٹڈ ٹرے میں لیے شفا اسٹیج پر آئی تو عنایا نے بھی اسے اور قریب ہی کھڑے شاہ میر کو خوشگوار حیرت سے دیکھا جبکہ شاہ میر کی تو سارا وقت نظریں شفا کے دلکش روپ وسروپ پر ہی اٹکی رہیں۔ وہ لائٹ میک اپ میں بھی اسے اپنے دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی اور اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آج ہی اس لڑکی کے سامنے اپنی فیلنگز کا اظہار کرتے ہوئے فرجاد صاحب کی طرف سے پیش کیے گئے پروپوزل کا جواب خود ہی شفا سے مانگ لے۔

اسٹیج پر موجود عنایا کے کزنز نیگ میں ملنے والے بھاری گفٹ پر جو ایک ویلویٹ جیولری باکس تھا شور مچا رہے تھے کہ ان کو بھی اتنا ہی قیمتی نیگ چاہیے لیکن سمیر کے جواب نے جہاں سب کی بولتی بند کر دی وہیں شفا کا مان اور بھرم دونوں بڑھا دیے۔ سمیر نے عنایا کے تمام کزنز کو نیگ کے لیے نوٹوں کے بند لفافے ان میں بانٹتے ہوئے کہا تھا کہ شفا تو اس کی سگی بہن ہی نہیں اس کی سالی بھی ہے تو واقعی سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور سب نے ہنسی خوشی اپنا نیگ قبول کر لیا۔ نیگ کی رقم چیک کرنے کے بعد عنایا کی کزنز نے عنایا کو فخر سے بتایا کہ سمیر اسے بہت سخی شوہر ملا ہے، شاپنگ کی کرنزی کی عنایا کے تو وارے نیارے ہو گئے ہیں جسے سن کر عنایا بھی مسکرا کر ساتھ بیٹھے اپنے دولہا کو دیکھنے لگی اس پر بھی لڑکوں کی طرف سے باقاعدہ سیٹیاں بجنی شروع ہو گئیں۔ دلہن اسٹیج پر ہی مہمانوں کی موجودگی میں اپنے دولہا کو چوری، چوری دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اسفندیار اپنے کزنز کے ٹولے میں سے نکل کر شاہ میر کی طرف آیا جو اسٹیج پر ایک طرف کھڑا خاموشی سے عنایا کے کزنز کی اس شوخ نوک جھونک سے محظوظ ہو رہا تھا۔ شفا بھی نظروں کے سامنے تھی، اسے اور کیا چاہیے تھا۔

''واہ یار...... تو تو بڑا ہی چھپا رستم نکلا ہے۔ شفا کو شاپنگ پر لے جانے کا کیا زبردست فائدہ اٹھایا ہے، کیا

digest Library.com

شاندار میچنگ ڈریسنگ ہے تم دونوں کی اور مجھے یقین ہے شفا کو یہ ڈریس کلر لینے کا مشورہ تو نے ہی دیا ہوگا ورنہ میری سیدھی سادی معصوم سی بہن اتنا زبردست شاپنگ سینس کہاں رکھتی ہے۔''

اور اسفند یار کے پرفیکٹ اندازے پر شاہ میر صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اب اتنے لوگوں کی موجودگی میں اپنے دل کا راز دوست پر کیسے عیاں کرسکتا تھا، یہ راز تو صرف اس لڑکی کی امانت تھا جو اس کی اصل حقدار تھی۔

تب ہی اسفند یار کی طرف سے ایک اور مشورہ آیا۔

''قسم سے شامی...... آج بہت اچھا چانس ہے۔ تو آج ہی جا کر شفا کو پروپوز کردے اس کے جواب کے انتظار کی کوفت سے بچ جائے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس فنکشن میں موجود کسی پرنس چارمنگ کی مما، شفا کو بہو کے طور پر پسند کرکے تیرے چانس کو ڈس مس نہ کردے۔''

اسفند یار کی اس شرارت پر شاہ میر نے اسے گھور کے دیکھا تو وہ برجستہ بولا مگر سرگوشی کے انداز میں۔

''کم آن یار...... صرف ڈراموں میں نہیں عام لائف میں بھی شادیوں کے فنکشنز پر لڑکوں کی مامز لڑکیوں کو تاڑ رہی ہوتی ہیں۔ بہتر ہے کہ تو یہاں کھڑے ہو کر اور دیر مت کر ورنہ......!''

جواباً شاہ میر نے اس کے کندھے پر زوردار دھپ رسید کی مگر یہ سچ تھا شاپنگ والے دن وہ شفا سے بات نہیں کرسکا تھا پھر اس نے اسٹیج پر شفا کو نہ پا کر ادھر اُدھر ڈھونڈنا چاہا مگر وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ شاہ میر نے گھبرا کر نگاہیں سارے بینکویٹ ہال میں دوڑائیں اور وہ اسے ہال کے انٹرنس پر پھولوں کے گھنے بنچ کے پاس کھڑی فون پر مصروف نظر آئی تو وہ تیزی سے اسٹیج سے نیچے اتر کر اس کی جانب بڑھا۔ پیچھے کھڑا اسفند یار اس کی اس پھرتی پر ہنسے بغیر نہیں رہا مگر شاہ میر نے پیچھے مڑ کر اسے دیکھ کر اپنا مذاق نہیں بنوانا تھا۔ بس وہ تیزی سے بڑھتا شفا کے قریب پہنچ گیا۔ شفا بھی اپنی بات ختم کرکے گل مینہ کو خدا حافظ کہہ رہی تھی جو فون پر شفا سے ڈھم ٹور میں ملنے والے ہینڈسم کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ شفا نے اس کے پروپوزل کے بارے میں اب تک جواب کیوں نہیں دیا اور شاہ میر کو وہاں دیکھ کر شفا کو کال مختصر کرکے فوری ڈس کنیکٹ کرنی پڑی البتہ گل مینہ جان چکی تھی کہ وہ ہینڈسم، شفا کا کزن ہے۔

''آئی ایم سوری...... میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا؟''

شفا نے نفی میں سر ہلایا۔ اسے گل مینہ کی تاکید یاد آنے لگی۔

''آئی ایم سوری...... میں نے تمہیں ایبٹ آباد سے واپس آنے کے بعد ایک بار بھی کانٹیکٹ نہیں کیا حالانکہ مجھے تمہیں ایک سچائی بتانی تھی جو بہت پہلے بتا دینی چاہیے تھی۔'' شاہ میر نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا۔

اس کی اس غیر متوقع بات پر شفا... اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ وہ کس سچائی کی بات کررہا ہے۔ اپنے اور اس کے خاندان کے تعلق اور رشتے کی ساری سچائیاں تو وہ جان چکی تھی۔ سب سے اہم بات...... وہ اچانک آپ جناب سے تم پر آ گیا تھا۔ ایسی بے تکلفی تو ان کے درمیان کبھی نہیں رہی تھی سوائے بچپن کے دور کے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی وہ مزید بولا کیونکہ وہ بھی منتظر تھی۔

''کیا کرتا...... وہاں ایبٹ آباد میں مجھ پر جس سچائی کا انکشاف ہوا تم سے نظریں ملانے کا حوصلہ نہیں رہا تھا پھر کس منہ سے یہ بات کرتا، کیسے یہ سچائی بتاتا کہ میں......!''

وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ وہ اس موقع پر کوئی دل دکھانے والی بات کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تب ہی اس کی گمبھیر چپ کے وقفے سے گھبرا کر شفا بےساختہ پوچھ بیٹھی۔

''کیسی سچائی...... آپ کس سچائی کی بات کررہے ہیں؟''

''یہی سچائی جو میری زندگی کے سب سے خوب صورت لمحوں کی کہانی ہے۔ جب ڈھم ٹور کی اس خوب صورت وادی کی سرسبز سڑک کنارے پہلی بار برستی بارش کی شام میں بھیگتی اس لڑکی کو دیکھا تھا تو وہ پہلی نظر میں ہی دل ونگاہ میں سما گئی تھی۔''

اور شاہ میر کے بدلتے لب و لہجے کے حصار میں بندھی شفا یہ سن کر بے ساختہ ہی سر جھکانے پر مجبور ہوئی۔ اسے بھی وہ شام یاد آ گئی جو سارے راستے اس کی گرم شال کے حصار میں قید مہکتی ہوئی اسے اپنے بہت پاس محسوس ہوتی رہی تھی۔

''تم مجھے اپنی تمام تر بے اعتنائی اور اجنبی تاثر کے ساتھ بھی بہت اچھی لگی تھیں۔ بعد میں شمسہ چچی سے ملنے کے بعد تم سے اپنائیت کا احساس بھی ہونے لگا تھا حالانکہ تب میں تمہارے اور اپنے تعلق کی سچائی کے بارے میں

Digest Library.com

کچھ نہیں جانتا تھا مگر آہستہ، آہستہ وہ اجنبی لڑکی مجھے دل سے اچھی لگنے لگی اور جب مجھے احساس ہوا کہ میں اس لڑکی کو پسند کرنے لگا ہوں تو مجھے اس کا اظہار کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ تمہیں اپنے ساتھ کراچی لے جانے کے لیے شہریار انکل نے پاپا کے سامنے تمہارے لیے اسفندیار کا پروپوزل دے دیا اور جب تم نے پاپا کے بجائے شہریار انکل کے ساتھ ان کے گھر جانے کا فیصلہ کیا تو میں یہی سمجھا کہ تم نے اسفندیار کے پروپوزل کے حق میں فیصلہ دیا ہے اور اس پر میں بہت زیادہ ہرٹ ہوا، بہت مایوس اور افسردہ بھی تھا اسی لیے فون پر بھی تم سے کوئی رابطہ کرنے کی ہمت نہیں کرسکا۔ بچپن کے بعد تمہیں پھر سے کھونے کا حوصلہ باقی نہیں رہا تھا۔''

اس بار شفا نے ہمت کر کے چہرہ اٹھا کر شاہ میر کی آنکھوں میں دیکھنے کی جرأت کی تھی جہاں اسے اپنے لیے ایک خاص اور بہت دلفریب جذبہ لہراتا محسوس ہوا مگر وہ اس کی پوری بات سننے کی منتظر خاموش رہی۔

''تھینک گاڈ...... ابھی اس روز تمہیں شاپنگ پر لے جانے سے پہلے ہی اسفندیار کی زبانی پتا چلا کہ تم نے اس کے پروپوزل کو اسی وقت منع کردیا تھا اور میں نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا مگر پاپا نے بھی تمہارے لیے میرا پروپوزل پیش کیا تھا پھر تم نے اب تک اس بارے میں کوئی فیصلہ کر کے اپنا جواب کیوں نہیں دیا کیونکہ صرف میں ہی نہیں گھر میں سب ہی تمہارا جواب جاننے کے لیے بہت بے چین ہیں۔''

اور وہ ایک بار پھر سے چہرہ جھکا گئی۔ اب شاہ میر کی محبت کے اس جاں فزا اظہار کے بعد اسے کچھ بھی سمجھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی تب ہی وہ بے ساختہ بولا تاکہ وہ بھی کچھ کہہ سکے۔

''سمیر بھائی نے ٹھیک کہا تھا مجھے ڈھم ٹور میں ہی تمہیں پروپوز کردینا چاہیے تھا تاکہ تمہیں فیصلہ کرنے میں اتنا ٹائم نہیں لگتا۔''

شفا نے بھی بے ساختہ ہی اس بار پھیلی آنکھوں سے شاہ میر کی طرف دیکھا۔

''تو چلو...... آج اور ابھی پروپوز کررہا ہوں۔ شفا...... تمہیں میری چاہت کے ساتھ عمر بھر کے لیے میرا ساتھ قبول ہے؟''

جواباً شفا نے اس کی اتنی لمبی چوڑی تمہید اور وضاحتیں سننے کے بعد ہلکے سے مسکراتے ہوئے ایک بار پھر سے سر جھکا دیا تو اس کے اس شرمیلے سے اعتراف قبولیت پر شاہ میر خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شفا کا اس اقرار بھری خوشی بخشنے پر شکریہ کہتا اسفندیار اسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آن دھمکا۔

''تو یہاں کھڑا کیا کررہا ہے شامی...... وہاں پاپا، عنایا کی رخصتی کے لیے مجھے ڈانٹ رہے ہیں کہ عین موقع پر میرا جگری یار اور عنایا کے دوسرے بھائی صاحب بلکہ دیور جی کہاں غائب ہیں۔ وہ تشریف لائیں تو اس کی رخصتی کی رسم کی جاسکے اور تو یہاں!''

اسفندیار کے شکایتی انداز پر شاہ میر اور شفا دونوں ہی ایک ساتھ مسکرائے۔ تب ہی اسفندیار نے روٹھے پن سے گھورتے ہوئے اس کا بازو پکڑا۔ وہ کچھ بول جو نہیں رہا تھا۔

''اب تو خود چل رہا ہے یا میں زبردستی پکڑ کر پاپا کے سامنے لے جاکر کھڑا کردوں۔ بھئی وہ تو سب کی موجودگی میں ہی میری انسلٹ کرنا شروع کردیں گے۔ تو تو اب ان کا چہیتا بن چکا ہے۔''

اور اسفندیار کے اس اشارے کو شفا کے حوالے سے سمجھتے ہوئے شاہ میر نے بھی اپنا بازو چھڑاتے اکڑتے ہوئے کہا تاکہ ہونے والے سالے جی پر کچھ رعب جما سکے۔

''مجھے زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود آرہا ہوں شفا کو لے کر۔''

جس پر اسفندیار نے معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''واقعی میں...... تو اس کا مطلب ہے تو نے میری بہن کو پروپوز کردیا ہے اور اس بیوقوف نے ہاں بھی کردی ہے۔''

اور اسفندیار کی اس بات پر شاہ میر نے اسے ایک بار پھر گھور کے دیکھا مگر شفا مسکراتے ہوئے سر جھکا گئی جبکہ اسفندیار نے بے ساختہ شاہ میر کو کھینچ کر گلے سے لگالیا۔ شاہ میر کی اب ساری خفگی لمحوں میں غائب ہوگئی اور کچھ دیر بعد وہ تینوں خوشگوار موڈ میں مسکراتے ہوئے اسٹیج کی جانب بڑھ گئے۔

(ختم شد)

digestlibrary.com

خسارہ

رخسار احمد

Digest Novels Group

"ہائے......" فون پر میسج کی بیپ سن کر اس نے فون اٹھایا۔ خرم کا میسج تھا۔

"ہیلو......" اس نے جوابی میسج ٹائپ کیا۔

"کیسی ہو؟" اگلا میسج فوراً موصول ہوا۔ جس سے مقابل کی بے قراری صاف عیاں ہوتی تھی۔

"ہمیشہ کی طرح حسین......" وہ اٹھلائی۔

"زہے نصیب' اس بات میں تو کوئی شک نہیں، اب ذرا اپنے اس حسین مکھڑے کا دیدار تو کروا دیجیے تاکہ اس ناچیز کی پیاسی نگاہوں کو کچھ قرار آجائے۔" میسج کے نیچے جڑے ہوئے ہاتھوں کی ایموجی بھیجی گئی۔

اس نے مسکراہٹ دبائی۔ پھر ٹائپ کیا۔

''زیادہ پھیلو مت..... اور ذرا بتاؤ آخر سارا دن کہاں غائب تھے۔ میں نے اتنی کالز کیں، میسجز کیے مگر تم نے ایک کا بھی ریپلائی نہیں کیا۔''

''وہ بس ذرا بزی تھا۔ ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا، اسی کے ساتھ اسپتال میں تھا سارا دن، موبائل بھی سائلنٹ پر تھا اسی لیے تمہاری کالز اور میسجز کا پتا نہیں چل سکا۔'' اس بار جواب قدرے توقف کے بعد آیا تھا۔

''اوہ..... اب کیسا ہے تمہارا دوست؟'' وہ تیزی سے ٹائپ کر رہی تھی۔

''ہاں..... اب وہ پہلے سے بہتر ہے، اچھا یار چھوڑو ان باتوں کو تم وڈیو کال کرو..... مجھے۔'' ہمیشہ کی طرح اس کی تان وڈیو کال پر آ کر ٹوٹی۔

''جی نہیں، مجھے نیند آرہی ہے، میں سونے لگی ہوں.....'' اس نے جمائی لیتے ہوئے جواب لکھا۔ اسے واقعی اب نیند آنے لگی تھی۔

''بڑی ظالم ہو یار تم..... چلو وڈیو کال نہ سہی کم از کم اپنی ایک پیاری سی پکچر ہی سینڈ کر دو تاکہ تمہاری دید کی چاہ میں تڑپتے میرے اس بیچارے دل کو کچھ تو تسلی ملے۔'' میسج کے نیچے ٹوٹے ہوئے دل کی ایموجی دیکھ کر فروا نے مسکراہٹ دبائی۔ پھر ایک نظر اپنے سلوٹ زدہ کپڑوں پر ڈالی۔ چلو خیر کوئی بات نہیں.....'' اس نے سر جھٹکا اور اسنیپ چیٹ کیمرے سے پکچر کھینچ کر اسے سینڈ کر دی۔

''اچھا میرے موبائل میں پانچ سو روپے کا بیلنس تو لوڈ کروا دو پلیز اوکے..... اب میں سونے جا رہی ہوں، کل بات ہوگی، اللہ حافظ.....'' وہ آف لائن ہوگئی تھی۔

''شرم نہیں آتی تمہیں اس طرح کی گھٹیا حرکتیں کرتے ہوئے۔ ابا کو جس دن تمہاری ان حرکتوں کا علم ہوگیا ناں تو وہ اس دن کو پچھتائیں گے جس دن تمہارے رونے دھونے سے مجبور ہو کر انہوں نے تمہیں یہ موبائل دلوایا تھا۔'' صبا جو اپنے بستر پر لیٹی بڑی دیر سے اس کے انداز و اطوار ملاحظہ کر رہی تھی۔ اسے فون رکھتا دیکھ کر ملامت آمیز لہجے میں بولی۔

''ارے یار ایسا بھی کیا کر دیا ہے میں نے جو تم مجھے اتنی باتیں سنا رہی ہو۔'' اس کے انداز میں حد درجہ بے پروائی تھی۔

''رات گئے تک نامحرم لڑکوں سے بات کرنا انہیں اپنی بے پردہ تصویریں دینا اور پھر انتہائی چیپ اور سطحی پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہانے، بہانے سے ان سے پیسے اینٹھنا یہ شریف اور عزت دار لڑکیوں کے کام ہیں؟'' صبا نے غصے سے باور کروایا تو فروا کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''ارے یار..... تم تو اچھی طرح جانتی ہو اماں جو پاکٹ منی کے نام پر چند سو روپے ہاتھ میں پکڑاتی ہیں، وہ مہینے کے شروع میں ہی ختم ہو جاتے ہیں، اس کے علاوہ اگر ان سے پیسے مانگو تو آگے سے جوتیاں کھانے کو ملتی ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ، میں اپنی چھوٹی، چھوٹی ضروریات کے لیے بھلا کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں..... دیکھو صبا ہم جیسے مڈل کلاس لوگوں کی زندگیوں میں ہوتا ہی کیا ہے، سوائے ایک نہ ختم ہونے والے مسائل کے انبار کے۔ ایسے میں محض ذرا سی تفریح، تھوڑی سی انجوائے منٹ سے اگر اس بے رنگ زندگی میں کچھ رنگ بھر جاتے ہیں تو اس سے تمہیں کیا پرابلم ہے، جسٹ چل یار..... سب کرتے ہیں.....'' اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے اس کے خیالات جان کر صبا کو حقیقتاً بہت دکھ ہوا تھا۔ اس نے تاسف بھری نگاہ بہن کے مطمئن چہرے پر ڈالی پھر سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

''سب اپنے کیے کے خود ذمے دار ہیں فروا تم اپنی بات کرو، تم جو اماں کی نرمی اور ابا ان کی ڈھیل کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کی عزت کو یوں رسوا کر رہی ہو۔'' فروا نے اس کی بات کاٹی۔

''صبا تم یہ کس قسم کی باتیں کر رہی ہو۔ میں اکیسویں صدی کی ایک پڑھی لکھی سمجھدار اور حقیقت پسند لڑکی ہوں..... یہ فیس بک اور انٹرنیٹ کے ذریعے پروان چڑھنے والی تھرڈ کلاس محبتوں کی حقیقت کا بخوبی علم ہے مجھے، اگر میں محض وقتی انجوائے منٹ کے لیے لڑکوں سے بات کر لیتی ہوں تو اس کا ہرگز بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ لڑکے میری محبت میں دیوانے ہوئے

جارہے ہیں یا میں ان کے عشق میں اندھی ہو کر ان کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کا ارادہ رکھتی ہوں...... بھئی اس میں اماں، ابا کی عزت کو رسوا کرنے کی بات کہاں سے آ گئی؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اسے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

''جس دن تمہاری یہ وقتی تفریح اور انجوائے منٹ تمہارے گلے پڑ گئی ناں تو اس دن تمہیں پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔''

''اچھا میری ماں...... بخش دو مجھے، تم سے تو بحث کرنا ہی فضول ہے۔ اب مجھے سونے دو......'' اس نے بیزاری سے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور بستر پر لیٹ کر چادر سر تک تان لی۔

☆☆☆

''ابے یار...... اس بار تو تو نے بہت لمبا ہاتھ مارا ہے، لڑکی واقعی کسی اپسرا سے کم نہیں، بے حد معصوم، ان چھوئی سی۔'' ذیشان، خرم کے کمرے میں موجود اس کے بیڈ پر لیٹا ہوا، اس کا ہی موبائل ہاتھ میں تھامے فروا کی ابھی کچھ دیر قبل بھیجی گئی پکچر پر اپنی [illegible] ہوئی نگاہیں جمائے بے باک انداز میں تبصرہ کر رہا تھا۔

''مگر یار...... دیکھنے میں تو کسی شریف گھرانے کی معلوم ہی ہوتی ہے، اتنی آسانی سے تیرے دام میں نہیں آئے گی۔'' ارسل نے جوس کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے خرم کا چہرہ دیکھا۔

''شریف...... ہونہہ......'' خرم نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ ''اس کیٹیگری کی لڑکیاں ہرگز بھی شریف نہیں ہوتیں، ہاں، اپنی ڈیمانڈ بڑھانے کے لیے وہ شرافت کا لبادہ ضرور اوڑھ لیتی ہیں، دس دن......'' اس نے چٹکی بجائی۔ ''دس دن میں اگر اسے بھی گزشتہ باقی لڑکیوں کی طرح لائن پر نہ لے آیا تو میرا نام بھی خرم جمشید نہیں۔'' اس کا انداز چیلنجنگ تھا۔

''ویسے یار یہ چھوٹے گھروں میں رہنے والی لڑکیاں کتنی چالاک اور لالچی ہوتی ہیں۔'' ذیشان کا اشارہ فروا کے بیلنس لوڈ کروانے والی بات کی جانب تھا۔

''ہاں...... ٹھیک کہہ رہے ہو تم...... لیکن تم فکر مت کرو کیونکہ میں بھی سب کچھ سود سمیت وصول کروں گا......'' خرم کی بات پر ارسل اور ذیشان نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر قہقہہ لگا کے ہنس دیے۔

☆☆☆

فروا کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا خواب یوں بھی سچ ہوتے ہیں، آرزوئیں اس طرح بھی پوری ہو جاتی ہیں۔'' اس نے سوچا۔

''لڑکا نہایت سلجھا ہوا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، یہ بڑا گھر، گاڑی، اچھے کھاتے پیتے خاندانی لوگ ہیں، فیملی بھی مختصر سی ہے، لڑکے کے ماں، باپ اور ایک چھوٹا بھائی، نہ تو نندوں کا جھنجٹ اور نہ ہی لمبی چوڑی سسرال کی فکر...... بھئی میں نے تو تمہاری دونوں بیٹیوں کی ہی تصویریں لڑکے کی ماں کو دکھائی تھیں مگر لڑکے نے خود اپنی فروا کا نام لیا ہے، ارے تمہاری فروا کے تو مانو نصیب جاگ گئے ورنہ آج کل کے زمانے میں خالی اچھی شکل صورت کو کون پوچھتا ہے بھلا...... اس سے پہلے میں تمہاری لڑکیوں کے جتنے بھی رشتے لے کر آئی، ایک [illegible] دوبارہ کسی نے پلٹ کر اس گھر کا رخ نہیں کیا [illegible] یہاں تو لڑکے کی ماں نے خود جہیز لینے سے انکار کر دیا ہے، کہہ رہی تھیں کہ جس نے بیٹی دے دی اس نے سب کچھ دے دیا۔'' [illegible] بوا چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھاتے ہوئے اماں کو تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھیں، جن پر شادی مرگ طاری تھی، ان کے بوسیدہ سے گھر میں ایسے اچھے رشتے کی آمد ان کے رب کی عطا کردہ عنایت کے سوا اور کچھ نہیں تھی اور وہ اپنے اللہ کے اس احسان پر اس کا جتنا بھی شکر ادا کرتیں کم تھا۔ ابا بھی رشتے کی تفصیلات جان کر حد درجہ خوش ہوئے۔ مگر وہ کچھ تامل کا شکار تھے، بڑی بیٹی کے ہوتے ہوئے چھوٹی کو بیاہ دینا...... انہیں لوگوں کی باتوں کا خوف تھا مگر اماں نے ان کو قائل کر کے ہی دم لیا تھا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے تصویر نکالی جو صبا ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کو چھیڑتے ہوئے اس کے تکیے کے نیچے رکھ گئی تھی۔ اس نے تصویر کو سیدھا کر کے دیکھا گہری سیاہ آنکھیں گندمی رنگت،

digestlibrary.com

وجیہہ چہرے پر ہلکی بڑھی ہوئی شیو..... پہلی نگاہ میں ہی افراسیاب سیدھا اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ تبھی موبائل کی گھنٹی پر وہ خیالوں سے باہر نکلی، خرم کا نام دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے، بیزاری سے کال ریسیو کی۔

''ہیلو..... فروا..... کہاں ہو یار تم؟ اتنے دنوں سے تمہیں کال کر رہا ہوں مگر تم میری ایک بھی کال ریسیو نہیں کر رہیں..... اور نہ ہی میرے کسی میسج کا جواب دے رہی ہو؟ سب خیریت تو ہے ناں.....'' دوسری طرف خرم کی بے قرار آواز سنائی دی۔

''بس کچھ مصروف تھی.....'' اس نے ٹالا۔

''ایسی بھی کیا مصروفیت کہ ایک کال کا بھی ٹائم نہیں نکال سکیں، یار تم تو جانتی ہو، میں جس دن تمہاری آواز نہ سنوں، میرا دن نہیں گزرتا.....'' اس کے عاشقانہ انداز پر وہ چڑ گئی۔

''کہا ناں، کچھ مصروف تھی اور یہ ہر وقت فلمی ہیرو کی طرح ڈائیلاگز نہ جھاڑا کرو۔''

''کیا بات ہے، تم اتنی روڈ کیوں ہو رہی ہو؟'' خرم ٹھٹکا۔ فروا نے گہری سانس لی پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر روٹھنے کے انداز میں بولی۔

''دیکھو خرم! میرے ماں، باپ نے میرا رشتہ طے کر دیا ہے، چند دنوں میں میری شادی ہونے والی ہے، اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ تم دوبارہ مجھے کال نہ کرنا سمجھے۔'' اس نے فون بند کر دیا اور سم ہی توڑ کر پھینک دی۔ اور پھر باقی کے مراحل انتہائی تیزی اور خوش اسلوبی سے طے ہوتے چلے گئے اس کی بری دیکھ کر خاندان کی عورتوں نے دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ لڑکیاں رشک و حسد سے بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔ ہر آنکھ میں ان کے لیے ستائش تھی۔ ہر کوئی ان دونوں کی جوڑی کو چاند سورج کی جوڑی ہی قرار دے رہا تھا۔ ٹی پنک شرارے میں ملبوس فروا اس وقت خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھ رہی تھی۔ اور یوں والدین کی دعاؤں کے سائے میں رخصت ہو کر اس نے اپنے شوہر کے عالیشان گھر میں قدم رکھا جہاں اس کا والہانہ استقبال کیا گیا تھا۔ رسموں کے بعد افراسیاب کی خالہ اس کو کمرے میں پہنچانے کی غرض سے آگے بڑھی تھیں کہ تبھی ہال کا دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔ افراسیاب نے گردن گھما کر دیکھا اور نو وارد پر نگاہ پڑتے ہی ایک خوشگوار مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی، وہ تیزی سے اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور آگے بڑھا اور انتہائی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی سے بغلگیر ہو گیا۔

''اور سناؤ، سفر کیسا گزرا.....؟ کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔'' اس کی خیر خیریت دریافت کرتے ہوئے وہ اس کی معیت میں چلتا ہوا فروا کے قریب چلا آیا۔

''ڈیئر وائف ان سے ملیے..... یہ ہے میری جان، میرا چھوٹا بھائی خرم جمشید جو کہ ایک انتہائی اہم کام کے سلسلے میں امریکا گیا ہوا تھا اسی لیے ہماری شادی میں شرکت نہیں کر سکا۔'' افراسیاب نے کہا۔

''بھئی خرم تم نے آنے میں بڑی دیر کر دی۔'' اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور اسے یوں لگا کہ جیسے ٹرین پوری رفتار سے چلتی ہوئی اس کے اوپر سے گزر گئی ہو، اس کے وجود کے پرخچے اڑ گئے۔ سامنے کھڑا خرم چبھتی ہوئی نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔

''نہیں بھائی! آپ غلط کہہ رہے ہیں، میں نے آنے میں دیر نہیں کی بلکہ میں تو بالکل ٹھیک وقت پر پہنچا ہوں.....'' خرم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے انتہائی سرد لہجے میں کہا تو فروا کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔

''جس دن تمہاری یہ وقتی تفریح اور انجوائے منٹ تمہارے گلے پڑ گئی ناں تو اس دن تمہیں پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔'' صبا کی آواز اس کے آس پاس ابھری تھی..... کاش کہ وہ اس وقت سمجھ جاتی کہ جو وہ کر رہی ہے اس کے بعد سوائے خسارے کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا..... مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ماضی میں محض ہنسی مذاق اور تفریح کے طور پر کی جانے والی خطائیں حال میں اس قدر بھیانک روپ دھار کر نمودار ہوں گی جو مستقبل کی تمام تر خوشیوں کو نگلتے ہوئے اس کے گلے کا طوق بن جائیں گی۔

❁❁❁

Digest Library Copy

معاملہ نازک تھا اور صورتِ حال گمبھیر...... شفیق احمد کی چھوٹی بیٹی رباب یونیورسٹی میں اپنے ساتھ پڑھنے والے ایک ایسے نوجوان سے شادی کی ضد باندھے بیٹھی تھی جسے شفیق احمد مسترد کر چکے تھے۔

شفیق احمد خاندانی آدمی تھے۔ ان کا کنبہ پانچ نفوس پر مشتمل تھا۔ شفیق احمد خود، ان کی بیگم حجاب، بڑی بیٹی سحاب، اس سے چھوٹا اکلوتا بیٹا انیق اور سب سے چھوٹی بیٹی رباب، شفیق احمد کے خاندان میں سبھی لوگ پڑھے لکھے، معزز اور مہذب تھے۔ خاندانی پن ان کے چہروں اور طور طریقوں سے جھلکتا...... کسی خوشی، غمی میں جب سارا خاندان اکٹھا ہوتا تو ہمہ خانہ آفتاب است کے معنی سمجھ میں آتے۔ کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر، کوئی جج، کوئی وکیل، کوئی سرکاری عہدہ دار تو کوئی غیر سرکاری عہدہ بردار۔ خاندان کے ایک بزرگ فخریہ کہا کرتے کہ ان کے خاندان کے تو کتے، بلے بھی خاندانی ہوتے ہیں۔ ہنگامہ ہائے روز و شب سے گزرے بعض بزرگوں میں ایسی ہی رعونت اور تمکنت آجایا کرتی ہے۔

شفیق احمد خود ایک اعلیٰ افسر تھے۔ ان کی بیگم شادی سے قبل ایک کالج میں لیکچرار تھیں۔ شادی کے بعد انہوں نے شوہر کی خواہش پر ملازمت ترک کر کے فقط گھر سنبھال لیا تھا۔ شفیق احمد کی بڑی بیٹی سحاب گرافک ڈیزائنر تھی اور ایک قومی ادارے سے

دادی، دادی

ناہید سلطانہ اختر

ناولٹ

Digest Novels Lovers group

وابستہ...... بیٹا اتیق احمد انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے کچھ عرصہ قبل ہی یورپ گیا تھا...... چھوٹی بیٹی رباب... بی ایس کے آخری سمسٹر میں تھی۔

بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹی ہونے کے ناتے رباب اپنے والدین ہی کی نہیں بڑی بہن اور بھائی کی بھی چہیتی تھی۔ اکیس سال کی ہو چکی تھی مگر اپنے قد و قامت اور جسامت سے اپنی اصل عمر سے چھوٹی نظر آتی۔ بلا کی ذہین تھی۔ موبائل، کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ پر اپنی دسترس میں بڑی بہن اور بھائی کو پیچھے بٹھاتی۔ یونیورسٹی میں اپنے ساتھیوں میں ایسی مقبول تھی کہ جس دن کسی باعث یونیورسٹی سے چھٹی کرلیتی اس کا موبائل فون بار، بار... تھر تھرانے لگتا۔ ابھی ایک دوست کی کال تو کچھ دیر بعد دوسری کال...... رباب کی ایک نہیں چار بیسٹ فرینڈز تھیں...... راحمہ، اشفیہ، زینب اور نسرین...... رباب اور ان چار لڑکیوں میں اتنی دوستی تھی کہ ان کے دوسرے ہم جماعت ان میں سے ہر ایک کو انفرادی نام سے مخاطب کرنے کے بجائے "فائیوز" کہہ کر پکارتے۔

پانچ دوستوں کے اس گروپ میں شامل زینب نامی لڑکی رباب کے گھر کے نزدیک ہی دوسرے محلے میں رہتی تھی۔ یونیورسٹی بس پہلے رباب کو اس کے اسٹاپ سے لیتی پھر زینب کو...... زینب کے اسٹاپ سے ان دونوں کا ایک اور ہم جماعت بھی اسی بس میں یونیورسٹی جاتا...... نام اس کا ولید مظفر تھا۔ خاصی ٹپ ٹاپ میں یونیورسٹی جاتا۔ "فائیوز......" پکارے جانے والے گروپ کی اشفیہ اور نسرین دوسرے روٹس کی یونیورسٹی بسوں سے آتی جاتیں۔ راحمہ کو کبھی اس کا بھائی تو کبھی والد یونیورسٹی لاتے لے جاتے...... علیحدہ، علیحدہ آنے والی یہ دوستیں یونیورسٹی پہنچ کر شیر و شکر ہو جاتیں۔

مخلوط تعلیمی اداروں میں ایک ساتھ پڑھنے والے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے باہم میل جول میں مرد و زن کی تخصیص عموماً نہیں رہتی اور فی زمانہ تو یہ میل جول نہایت عام...... سو ہم مکتب اور ہم جماعت ہونے کے ناتے ولید سے رباب کی بھی، کبھی ضرورتاً تو بات چیت رہتی تھی لیکن پانچویں، چھٹے سمسٹر کے دوران دونوں میں بات چیت بڑھ کر پہلے بے تکلفی پھر دوستی میں بدل گئی اور رباب اکثر اپنے گروپ کی باقی چار لڑکیوں سے علیحدہ ہو کر زیادہ تر ولید کے ساتھ یونیورسٹی میں اِدھر اُدھر بیٹھنے اور گھومنے پھرنے لگی۔ تاڑنے والے تاڑ گئے کہ دال میں کچھ کالا ہونے لگا تھا۔ رباب کی دوست زینب نے اسے ولید سے پینگیں نہ بڑھانے کا مشورہ دیا تو رباب تیوری چڑھا کر بولی۔

"تمہیں ولید سے کیا دشمنی ہے؟"

"مجھے ولید سے کوئی دشمنی نہیں تم سے دوستی ہے اس لیے سمجھا رہی ہوں کہ اس سے دوستی نہ بڑھاؤ۔ وہ اچھا لڑکا نہیں ہے۔"

"کیا اچھا نہیں ہے...... پوری کلاس میں اس جیسا ویل ڈریسڈ کوئی اور ہے بولو۔ تمیز سے رہتا ہے، ڈیسنٹ ہے...... ہر ایری غیری چھچھوری لڑکی کو لفٹ نہیں کراتا۔"

"یونی میں ڈیسنٹ دکھتا ہے مگر ہمارے محلے میں ان کی ریپوٹیشن اچھی نہیں ہے...... اس کے گھر والے بھی بس ایسے ہی ہیں...... محلے میں آئے دن ان کے جھگڑے چلتے رہتے ہیں۔"

"تم مجھے یہ سب کچھ اس لیے کیوں بتا رہی ہو......" رباب نے زینب سے اکھڑے لہجے میں کہا۔

"کیونکہ اب میں تمہیں اس سے بہت بے تکلف ہوتے دیکھ رہی ہوں......"

"مجھے وہ اچھا لگتا ہے۔"

"اسی لیے بتا رہی ہوں......" زینب نے کہا۔

"تمہارے یہ بتانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا...... وہ مجھے پھر بھی اچھا ہی لگے گا۔" رباب نے کہا۔

"تمہاری مرضی......!" زینب نے شانے اچکائے۔ "میرا فرض تھا تمہیں بتانا۔"

"تھینک یو......" رباب نے زینب کا مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔

رباب اور ولید کے درمیان دوستی اس حد تک بڑھی

digest library.com

کہ دونوں میں شادی کا وعدہ ٹھہرنے تک بات جا پہنچی۔

ولید نے رباب سے کہا کہ وہ اس سے شادی کا پیام دینے کو اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجنا چاہتا تھا مگر اس سے پہلے رباب کو اپنے گھر والوں کو آمادہ کر لینا چاہیے تا کہ وہ اس کے گھر والوں سے غائبانہ متعارف ہو جائیں۔

رباب نے اپنی بڑی بہن سحاب سے بات کی اور سحاب نے والدہ کو بتایا۔ وہ ہڑ بڑا گئیں۔

”ابھی تو رباب کی تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ شادی کا قصہ کہاں اٹھ کھڑا ہوا۔“

”امی وہ اور رباب ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں...... آخری سمسٹر کے بعد لڑکا چونکہ باہر جانے کی تیاری کر رہا ہے اس لیے چاہتا ہے کہ جانے سے پہلے اس کی رباب سے شادی ہو جائے۔“

”بڑی تم ہو کہ رباب...... پہلے تمہاری شادی ہونی چاہیے۔“

”چھوڑیں امی...... آپ یہ نہ دیکھیں کہ کیا ہونا چاہیے...... یہ دیکھیں کہ کیا کرنا چاہیے...... رباب کچھ زیادہ ہی سیریس لگتی ہے اس معاملے میں۔“

”اس کے سیریس لگنے سے کیا ہوتا ہے...... ہوگا وہی جو تمہارے ابو چاہیں گے۔“

”تو آپ ابو سے بات کریں ناں......“

”پہلے تو میں رباب سے بات کرتی ہوں...... یونیورسٹی ہم نے اسے پڑھنے کے لیے بھیجا تھا یا رشتہ لانے کے لیے......“

”امی ہو جاتی ہے کبھی، کبھی ساتھ پڑھنے والوں میں اس طرح کی انڈر اسٹینڈنگ۔“ سحاب نے ماں کے تیور دیکھ کر انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”تمہاری کیوں نہ ہوگئی......“

”میری بات چھوڑیں......“

”کیسے چھوڑ دوں...... رباب کو اپنے رشتے کی بات کرتے ہوئے شرم نہ آئی۔“

”امی پیاری یہ آپ کا زمانہ نہیں ہے۔“

”ہمارے زمانے میں بھی سب کچھ ہوتا تھا مگر ہمیں اپنے خاندان اور ماں باپ کی عزت کا لحاظ ہوتا تھا۔“

”اچھا، آپ ناراض نہ ہوئیے گا رباب پر۔“

”تمہیں سفارش کرنے کی ضرورت نہیں......“

سحاب چپ ہوگئی۔

امی نے رباب سے بات کی تو اس کے تیور دیکھ کر وہ حیران و پریشان رہ گئیں...... رباب بنا لحاظ و شرم نہایت بے باکی سے بات کر رہی تھی۔

”وہ باہر جانے کی تیاری کر رہا ہے...... شادی ہو جائے گی تو میں بھی اس کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔“

امی یہ تو جانتی تھیں کہ رباب بڑی بہن اور بھائی کے مقابلے میں خود سر، منہ پھٹ اور ضدی ہے مگر اس حد تک...... اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا۔

”تمہیں معلوم ہے کہ تم کس سے بات کر رہی ہو......“ امی کو غصہ آ گیا۔

”اپنی ماں سے۔“

”کوئی بیٹی اپنی ماں سے اس بے باکی سے اپنی شادی کے لیے بات کرتی ہے؟“ امی نے اسے غصے سے گھورا۔

”فار گاڈ سیک امی...... آپ اربوں سال پرانی ماں نہ بنیں...... کسی لڑکی کا اپنی ماں سے اپنی شادی کی بات کرنا کوئی گناہ تو نہیں......“

”بے شرمی تو ہے۔“

”کوئی بے شرمی نہیں...... بے شرمی تب ہوتی جب میں آپ کو بتائے بغیر اس سے شادی کر لیتی۔“

اس کی بات پر امی اپنے ہوش کھونے لگیں...... انہوں نے رباب کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور بے حد دل شکستگی سے بولیں۔ ”پتا نہیں تمہاری تربیت میں کہاں چوک ہوگئی مجھ سے۔“

”امی پلیز اس قسم کے جذباتی ڈائیلاگ نہ بولیں۔“

امی کو اور صدمہ ہوا...... کیسی زبان بول رہی تھی رباب۔

”اسے اور اس کے گھر والوں کو بلا کر مل لیں ان سے...... مجھے اسی سے شادی کرنی ہے بس ورنہ......“

”ورنہ......؟“ امی نے اس کی بات کی تکمیل چاہی۔

”میں وہ کروں گی جو آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔“

’’کیا کرو گی...... کورٹ میرج کرلو گی اس سے؟‘‘
’’بہت معمولی بات ہے...... میں اس سے بھی بڑھ کر کچھ کرسکتی ہوں......‘‘ امی کو خوف نے آ لیا۔
رباب کے تیوروں نے انہیں شوہر سے بات کرنے پر مجبور کردیا۔
’’میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنی خودسر ہوگی...... خدا بیڑا غرق کرے اس موبائل کا...... بچوں کو ایسے بگاڑ کر رکھ دیا ہے کہ خدا کی پناہ...... کورٹ میرج سے آگے کی بات کیا ہوسکتی ہے بھلا...... اللہ نہ کرے کچھ کھا پی کر پڑ گئی تو پھر بھی ہمارا ہی منہ کالا ہوگا......‘‘
شفیق صاحب سوچ میں پڑ گئے۔
’’بلا کر مل لیں لڑکے سے اور اس کے گھر والوں سے...... ہوسکتا ہے آپ کو پسند آجائیں۔‘‘
’’بلالو......‘‘ شفیق صاحب نے بادلِ ناخواستہ کہا۔
ولید اپنے والدین اور ایک شادی شدہ بہن کے ہمراہ رباب کے گھر والوں سے ملنے آیا مگر شفیق صاحب کو ان سے مل کر کچھ خاص خوشی نہ ہوئی۔ ولید سے بہتر رشتے تو رباب کے لیے ان کے اپنے خاندان میں موجود تھے...... ان کے سگے چچا کا بیٹا تنویر جس نے ایم بی اے کیا تھا اور ایک ملٹی نیشنل ادارے میں ملازمت کررہا تھا...... امی کی سیکنڈ کزن کا اکلوتا بیٹا فرحان جو اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی گیا تھا اور اب وہیں ملازمت کررہا تھا...... خود شفیق صاحب کی پھوپی زاد بہن کرن آپا کا بیٹا جو ایک غیر ملکی بینک میں اچھے عہدے پر تھا...... شفیق صاحب کو اندازہ تھا کہ تینوں گھرانے ہی رباب سے رشتہ کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے...... ولید ان میں سے کسی کی ٹکر کا بھی نہ تھا...... کیا ضرورت تھی خاندان سے باہر ایک ایسے گھرانے میں رباب کا رشتہ کرنے کی جو ہر اعتبار سے خاندانی رشتوں سے کمتر تھا۔
شفیق صاحب نے ولید اور اس کے گھر والوں سے اچھی طرح ملنے اور مناسب خاطر تواضع کے بعد انہیں رخصت کیا اور اپنا فیصلہ سنا دیا کہ یہ رشتہ نہیں ہوسکتا۔
رباب نے رونا پیٹنا ڈال دیا...... کھانا پینا چھوڑ دیا۔
امی نے شفیق صاحب کی منت سماجت کی...... انہیں سمجھایا کہ رباب کی ضد ہے تو مان جائیں وہ اچھا برا خود بھگتے گی۔
’’اِدھر کی دنیا اُدھر ہوجائے‘ میں یہ رشتہ نہیں کروں گا......‘‘ شفیق صاحب نے کہا۔
باپ، بیٹی میں ٹھن گئی...... دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھنا اور بات کرنا بھی چھوڑ دیا۔
ایک ہی گھر کے باسی تھے۔ سامنا ہوتا بھی تو ایک دوسرے سے نظر چرا کر گزر جاتے۔ گھر کی فضا میں ایسا تناؤ آگیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا...... کبھی کسی بات پر گھر کے افراد کو ایک دوسرے سے رنجش ہو بھی جاتی تو دو چار دن رہ کر ختم ہوجاتی مگر اب تو ہر اگلے دن تناؤ پہلے سے زیادہ بڑھا ہوا محسوس ہوتا۔
امی کی جان پر بنی ہوئی تھی...... کبھی رباب کو سمجھانے کی کوشش کرتیں کبھی شوہر کی منت سماجت کرتیں...... انہیں رباب کی طرف سے خدشات سہائے رکھتے وہ کوئی جواز کوئی تاویل سننے کو تیار نہیں تھیں...... البتہ شوہر ان کے منت سماجت کرنے پر ولید اور اس کے خاندان کے بارے میں چھان بین کرانے اور بہتر رپورٹ ملنے پر رباب کے معاملے میں ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوگئے مگر اسی دوران شفیق صاحب کو اپنی والدہ کے کراچی سے اسلام آباد آنے کی خبر ملی۔

☆☆☆

شفیق صاحب اور گھر والوں کو والدہ کے اسلام آباد میں مستقل قیام کے لیے آمد کی خبر تو کافی عرصے سے تھی مگر بوجوہ ان کی آمد میں تاخیر ہوتی رہی تھی مگر اب تو وہ آہی رہی تھیں۔ گھر کی بحرانی صورت حال میں شفیق صاحب کی بیگم اور ان کی بیٹیوں کو دادی کی آمد ایک نئی افتاد کے مترادف لگی۔ شفیق صاحب تو بہرحال خوش تھے کہ والدہ طویل عرصے بعد ان کے ہاں مستقل قیام کے لیے آرہی تھیں مگر بیگم ساس کی آمد کے خیال سے ناخوش تھیں اور دونوں پوتیاں فکر مند کہ آخر دادی ان کے گھر پڑاؤ ڈالنے کیوں آرہی تھیں۔ کراچی میں

اپنی اکلوتی بیٹی کے گھر میں بھی تو رہ سکتی تھیں۔

دادی کئی سال سے کراچی میں ہی اپنے چھوٹے بیٹے عتیق احمد کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ کراچی سے دادی کو عشق تھا۔ وہیں پلی بڑھیں...... وہیں شادی ہوئی...... بچے ہوئے، دو بیٹے اور ایک بیٹی...... بچوں کے رشتے بھی کراچی میں ہی ہوئے...... بڑے بیٹے شفیق احمد کو ملازمت اسلام آباد میں ملی لہٰذا شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کو اسلام آباد ہی لے گئے...... چھوٹے بیٹے کی شادی کراچی میں ان کی والدہ کے ایک دوست گھرانے میں ہوئی۔ بیٹی بیاہ کر سگی خالہ کے گھر گئی لہٰذا والدہ نے بڑے بیٹے کے چاہنے کے باوجود اسلام آباد میں جا کر رہنے کے بجائے چھوٹے بیٹے کے ساتھ کراچی میں ہی رہنا پسند کر لیا کہ یہاں دو بچے تھے اور اسلام آباد میں صرف ایک بیٹا جس کی بیوی کو ساس سے کچھ خاص رغبت نہیں تھی۔

شومئی قسمت عتیق احمد کا دل کے دورے سے صرف بیالیس سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ والدہ نے بیوہ بہو اور اپنی یتیم پوتی کے ساتھ کئی سال نہایت حسنِ سلوک کے ساتھ گزارہ کیا۔ بہو کے بہن، بھائی برسا برس سے امریکا میں قیام پزیر تھے۔ انہی کی بنیاد پر بہو اور اس کی بیٹی کا بھی امریکا جانے کا بندوبست ہو گیا۔ ان کے جانے کے بعد والدہ کا اکیلے رہنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ بیٹی کی خواہش کے باوجود وہ اس کے گھر رہنے کے حق میں نہیں تھیں اس لیے انہیں اسلام آباد میں بڑے بیٹے کے گھر مستقل قیام کا فیصلہ کرنا پڑا۔ ان کے اسلام آباد آنے کی خبر تو کافی عرصے سے تھی مگر اس خبر کا عمل پزیر ہونا ایسے وقت ہوا جب شفیق صاحب کی فیملی رباب کی ضد کی وجہ سے پریشانی میں تھی...... اور شفیق صاحب کی بیگم کے لیے اس پریشانی سے بھی بڑی پریشانی یہ تھی کہ بچوں کی دادی آخر ایسے وقت کیوں آ رہی ہیں جب ان کے بیٹے کی فیملی کو ایک بحران کا سامنا ہے۔

''دادی کو پتا نہ چلے......'' شفیق صاحب کی بیگم نے دونوں بیٹیوں کو ہدایت جاری کی۔

''پتا چل بھی جائے تو میں ڈرتی نہیں......'' رباب ان دنوں بدتمیزی کا بہانہ ڈھونڈتی تھی۔

''ڈرو مت...... شرم تو کرو......'' امی نے غصے سے کہا۔

''اپنی پسند سے شادی کرنا میرا حق ہے۔''

''میرے خدا......'' امی نے اپنا سر پکڑ لیا...... ''سات پشتوں میں ایسی لڑکی نہ ہوئی ہوگی۔''

''اب تو ہو گئی......'' رباب چپ نہ ہوئی۔

''چپ کرو رباب...... تمہیں ہو کیا گیا ہے......'' سحاب نے بہن کو ڈانٹا۔

''میں نے کہہ دیا ہے اسی سے شادی کروں گی......''

''فار گاڈ سیک رباب...... کسی اور کا نہیں تو امی ہی کا خیال کرو...... ان کا بی پی ہائی ہو جاتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کسی کو......''

''اچھا چپ کرو...... فی الحال یہ سوچو کہ دادی آ رہی ہیں...... انہیں کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔''

''دادی آئیں یا جائیں...... آئی ڈیم کیئر...... جب میری کسی کو پروا نہیں تو میں کسی کی پروا کیوں کروں......''

دادی کی آمد کی خبر کا ایک مثبت اثر یہ سامنے آیا کہ شفیق صاحب کے بگڑے تیور کسی حد تک سنبھل گئے...... گھریلو ملازم کی مدد سے انہوں نے والدہ کے لیے دونوں بیٹیوں کے مشترکہ کمرے سے متصل کمرا ان کی ضرورت کے مطابق آراستہ کر دیا...... دونوں کمروں کی مشترکہ دیوار میں ایک کھڑکی تھی جس کے ذریعے والدہ ضرورت کے وقت پوتیوں سے فوری رابطہ کر سکتی تھیں...... پچھتر چھہتر سال کی بوڑھی خاتون کو کسی بھی وقت کسی ضرورت کے تحت کسی فردِ خانہ کی ضرورت ہو سکتی تھی۔

دادی آئیں تو ان کے ذاتی اسباب کے علاوہ امریکا گئی ہوئی رمیسا کی ایک ایرانی بلی بھی ان کے ہمراہ تھی...... دودھ کی طرح سفید رنگ کی یہ بلی رمیسا کو اس کی ایک سہیلی نے بطور تحفہ دی تھی۔ رمیسا نے اس کا نام ڈیبی رکھا تھا۔ دادی نے بتایا کہ ڈیبی کوئی دو سال قبل رمیسا کے پاس آئی تھی۔ اس وقت اتنی بڑی اور پھولی

پھولی نہ تھی۔ ریمسا نے اسے نہایت پیار سے رکھا تھا اس کی اچھی کھلائی پلائی کی تھی۔ ڈیبی دودھ پیتی تھی...... پیکٹ والا دودھ نہیں...... فریش ملک...... کچے گوشت کو وہ منہ لگا کر چھوڑ دیتی...... چکن کی ابلی ہوئی بوٹیوں کا نرم گوشت ریشہ، ریشہ کر کے اسے ہاتھ سے کھلایا جاتا تھا...... اس کے لیے کیٹ فوڈ آتا تھا...... ہفتہ میں دو تین مرتبہ ڈیبی کو غسل دیا جاتا...... تولیے سے اس کا جسم خشک کر کے اس کے بالوں میں برش کیا جاتا...... پھر اسے باڈی اسپرے کیا جاتا...... ڈیبی نرم گدیلے پر سوتی تھی...... اسے مچھروں اور کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کے گدیلے پر مچھر دانی لگائی جاتی...... رفع حاجت کے لیے ڈیبی کو ایک ٹب کی سہولت میسر تھی جس میں بچھی خاص ریت روزانہ تبدیل کی جاتی...... ڈیبی کو طبی معائنے کے لیے جانوروں کی ایک پرائیویٹ کلینک بھی لے جایا جاتا۔ دادی کے بقول گزشتہ برس اچانک ہی ڈیبی کے بال جھڑنے لگے تھے...... اسے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا تو اس نے بتایا ڈیبی کو الرجی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے علاج کے لیے اپنی کلینک میں داخل کر لیا۔ دو دن ڈیبی وہاں رہی...... ڈاکٹر نے اس کے جسم کے تمام بال مونڈ کر اسے عجیب سی ناتواں مخلوق کی صورت ڈسچارج کیا...... ریمسا اسے اس حال میں دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوئی۔ ڈیبی کو گھر لانے کے بعد ریمسا نے اس کا ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق پورا خیال رکھا...... ڈیبی دوبارہ بھلی چنگی ہوگئی۔ اس کے جسم پر دوبارہ رواں آ گیا اور وہ پہلے کی طرح نرم و ملائم بالوں والی بلی بن گئی...... ڈیبی کے نخرے بھی خوب تھے...... اسے زکام ہو جاتا اور کبھی بخار بھی...... ڈاکٹر اسے ویسی ہی دوائیں دیتا جیسی انسان مریضوں کو دی جاتی ہیں......

دادی کے بقول ڈیبی کوئی عام بلی نہیں تھی جو گلیوں میں رُل کھل کر جیتی ہیں اور کچرے میں جھوٹا، باسی، تباسی کھانا منہ مار کر تلاش کرتی اور اپنا پیٹ بھرتی ہیں...... ڈیبی وی آئی پی بلی تھی اور چونکہ ریمسا کو پیاری تھی لہٰذا دادی کو بھی اچھی لگتی تھی لیکن ریمسا کے جانے کے بعد دادی ڈیبی کا اس طرح سے خیال نہیں رکھ سکتی تھیں جیسے ریمسا رکھتی تھی۔ سو وہ ڈیبی کو ایرانی بلی پالنے کے کسی شوقین کے حوالے کر دینے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ کراچی میں انہیں ایسا کوئی شوقین نہ مل سکا تھا انہیں یقین تھا کہ اسلام آباد میں ڈیبی کو کوئی نہ کوئی اڈاپٹ کر لے گا۔

رباب کو دادی کے ارادے کا علم ہوا تو اس نے ڈیبی کو خود رکھنے کی خواہش ظاہر کی...... دادی خوش ہو گئیں کہ ان کی عزیز ترین..... پوتی ریمسا کی بلی کو رباب اپنا لے تو اس سے اچھی کیا بات...... حقیقت یہ تھی کہ ریمسا کے امریکا جانے کے بعد انہیں خود بھی ڈیبی سے بہت لگاؤ ہو گیا تھا۔ اس بلی کو دیکھ کر انہیں ریمسا کے بھی کہیں آس پاس ہونے کا احساس ہوتا تھا...... سچ ہے اپنے پیاروں سے وابستہ ہر چیز پیاری لگتی ہے۔

”امی کو گھر میں بلی، کتا رکھنا سخت ناپسند تھا مگر انہوں نے یہ سوچ کر کہ شاید ڈیبی کی دیکھ بھال میں لگ کر رباب کے ذہن سے ولید کا بھوت اتر جائے رباب کا ڈیبی کو پالتو بنا لینا چپ چاپ برداشت کر لیا۔

ڈیبی کو رباب کی پالتو کا درجہ لے کر وہ تمام سہولتیں اسے فراہم کر دی گئیں جن کی ریمسا اسے عادی بنا گئی تھی۔ دادی اس کا کچھ سامان تو اپنے ساتھ ہی لے آئی تھیں۔ کچھ یہاں سے خرید لیا گیا۔ ڈیبی نہایت ناز و نعم میں پلنے لگی۔ رباب جو یونیورسٹی سے آنے کے بعد یا تو اپنے کمرے میں گھسی رہتی تھی یا اپنی بات نہ مانے جانے پر اِدھر کی چیزیں اُدھر پٹخ کر اپنے غصے کا اظہار کرتی تھی اب ڈیبی کی دیکھ بھال میں لگی رہنے لگی۔ وہ اسے گود میں اٹھائے پھرتی۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی...... اس کی دودھ اور کھانے کی کٹوریاں دھوتی...... اس کا بستر صاف رکھتی۔ اسے نہلاتی دُھلاتی...... اس کے بالوں میں برش کرتی...... اس کے ساتھ کھیلتی۔ ڈیبی کچھ ہی دنوں میں رباب سے از حد مانوس ہو گئی تھی...... رباب گھر میں نہیں ہوتی تو امی کو ڈیبی کا خیال رکھنا پڑتا...... امی نے اسے...

باولِ ناخواستہ ہی سہی قبول کرلیا تھا...... ڈیبی کے اس گھر میں لاڈ گھر کے چھوٹے بچے کی طرح اٹھائے جاتے...... رباب اسے اکثر اپنے پاس ہی سلا لیتی...... لیٹتی تو اسے اپنے سینے پر بٹھا لیتی اور کبھی، کبھی جوشِ محبت میں اس کے منہ پر پیار بھی کرلیتی...... دادی نے کئی مرتبہ رباب کو سمجھایا کہ بلی سے اتنی زیادہ قربت اور اس کے منہ پر پیار کرنا اس کی اپنی صحت کے لیے بھی خطرہ بن سکتا ہے...... مگر رباب ان کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتی...... دادی کی باتیں رباب کو ویسے بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتی تھیں...... ایک تو دادی کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی نصیحت ضرور ہوتی تھی...... گھر میں کیسی ہی بات ہوتی دادی کو کوئی پرانا قصہ ضرور یاد آجاتا اور وہ اس قصے کو گھر کے تازہ ترین معاملے سے جوڑ دیتیں...... ولید والا معاملہ دادی سے راز رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی جارہی تھی۔

☆☆☆

انسان ہو یا جانور...... نسل اپنا اثر دکھاتی ہے...... ڈیبی اچھی نسل کی بلی تھی...... گلی، محلے میں آوارہ گھومنے والی بلیوں سے قطعاً مختلف...... نہایت تمیزدار اور سویلائزڈ...... خاندانی پن اس کی حرکتوں سے جھلکتا...... اس کی سبزی مائل بھوری آنکھیں انگوٹھی میں جڑے نگینوں کی طرح دمکتیں...... اپنے تنومند وجود کے ساتھ وہ دھیرے، دھیرے چلتی تو ''کیٹ واک'' کے معنی سمجھ میں آتے...... گھر سے باہر اول تو وہ خود بھی نہیں نکلتی اور اگر کبھی غلطی سے قدم گھر سے باہر نکالنے کی کوشش کرتی بھی تو گھر کا کوئی نہ کوئی فرد اسے اندر واپسی کا راستہ دکھا دیتا...... ڈیبی ٹیرس کی منڈیر پر چڑھ جاتی اور گلی میں آتے جاتوں کو دیکھنے لگتی...... اس کی آواز تو نکلتی ہی نہیں تھی۔ گلی میں گھومتی عام بلیوں کی طرح وہ نہ تو میاؤں، میاؤں کرتی، نہ کبھی اونچی آواز نکالتی بہت ہوا تو مبہم سی غراہٹ بس...... شاید تمام ایرانی بلیاں ایسی ہی کم سخن ہوتی ہوں...... ڈیبی واقعی خاندانی بلی تھی۔

☆☆☆

اگرچہ دادی سے ولید والے قصے کو قطعاً راز رکھا گیا تھا مگر دادی جہاندیدہ تھیں۔ انہوں نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے تھے...... زندگی کا طویل سفر انہوں نے لوگوں کے چہرے پڑھتے اور رویّوں سے حالات کو سمجھتے گزارہ تھا۔ جب سے وہ شفیق احمد کے گھر آئی تھیں گھر والوں سے رباب کی کشیدگی اور شفیق احمد کے اس بیٹی سے کھنچاؤ کو چپ چاپ دیکھ رہی تھیں...... تاڑ گئی تھیں کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ کچھ دن خاموشی سے دیکھتی رہیں پھر انہوں نے ایک دن بیٹے سے کہا۔

''شفیق کیا بات ہے سحاب سے تو تم خوب باتیں کرتے ہو...... چھوٹی سے بات کرتے نہیں دیکھا میں نے تمہیں......؟''

''اماں جان! ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' شفیق احمد نظریں چراتے ہوئے بولے۔

''تم بتاؤ یا نہ بتاؤ...... میرا بھی کچھ تجربہ ہے زندگی کا...... کوئی مسئلہ ضرور ہے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں اماں۔'' شفیق احمد مکر گئے۔

''چلو...... مانے لیتی ہوں۔''

''بیٹا! سحاب تو باپ کے بہت قریب ہے...... تم دور، دور کیوں رہتی ہو اپنے باپ سے ؟'' دادی نے رباب سے پوچھا۔

''دادی! میں کسی سے زیادہ فری نہیں ہوتی۔'' رباب نے کہا۔

''میں کسی کی نہیں، تمہارے باپ کی بات کررہی ہوں...... بیٹیاں تو باپ کے بہت نزدیک ہوتی ہیں۔''

''بس دادی اپنی، اپنی عادت کی بات ہوتی ہے...... میں ہر ایک سے ریزرو رہتی ہوں۔'' رباب نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''ڈیبی کو تو تم اپنی جان سے لگائے رکھتی ہو۔''

''وہ میری پیٹ ہے ناں دادی۔''

''شفیق بھی تو تمہارا باپ ہے۔''

''مجھے ان کا احترام کرنا پڑتا ہے۔''

’’احترام اور دوری میں بڑا فرق ہوتا ہے بیٹا۔‘‘

’’مجھے ابو سے پیار ہے دادی۔‘‘

’’پیار ہے تو اس کا اظہار بھی کیا کرو...... سحاب کرتی ہے کہ نہیں...... کبھی باپ کو چائے بنا کر دے رہی ہوتی ہے کبھی اس سے اپنے دفتر کے معاملے میں صلاح مشورہ لے رہی ہوتی ہے۔‘‘

’’دادی جب میں جاب کروں گی تو میں بھی لے لوں گی صلاح مشورہ۔‘‘ رباب کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔

’’چائے تو تم اب بھی بنا کر دے سکتی ہو۔‘‘ دادی بھی اسی کی دادی تھیں۔

’’سحاب چائے زیادہ اچھی بناتی ہے دادی۔‘‘

’’کوشش کرو...... تم اس سے بھی اچھی بنانے لگو گی۔‘‘

’’بہت چالاک ہیں تمہاری دادی...... اگلوانے کی کوشش کر رہی ہیں گی۔‘‘ امی کو یہ ساری بات معلوم ہوئی تو وہ بولیں۔

’’آپ لوگ موقع کیوں دے رہے ہیں...... کر دیں اس سے میری شادی۔‘‘ رباب کو تو اں موقع ملا۔

’’تم اپنی ضد سے باز نہ آنا۔‘‘ امی نے رباب کو غصے سے دیکھا۔

’’ابھی تو آپ دادی کو پتا نہ چلنے دینے کی بات کرتی ہیں...... میری بات نہ مانی تو ایسا کروں گی کہ دادی تو کیا ساری دنیا کو پتا چل جائے گا۔‘‘

’’کیا کرو گی؟‘‘ امی لال پیلی ہوئیں۔

’’جب وقت آئے گا تو دیکھ لیجیے گا کیا کرتی ہوں۔‘‘ رباب پاؤں پٹختی چلی گئی۔

’’دیکھ رہی ہو...... دیکھ رہی ہو...... یہ کیسے میرے منہ کو آ رہی ہے۔‘‘ امی سحاب سے شکایتی لہجے میں بولیں۔

’’امی پلیز آپ ابو کو سمجھائیں...... کر دیں اس کا رشتہ اس سے...... خود ہی بھگتے گی۔‘‘ سحاب نے کہا۔

’’یہ کیا بھگتے گی...... ہم سب بھگتیں گے...... تمہارے ابو کو تو لڑکا اور اس کے گھر والے پہلی ملاقات میں ہی پسند نہیں آئے پھر بھی میرے کہنے سننے پر انہوں نے اس کے محلے سے پوچھ گچھ کرالی تھی...... بیکار لوگ ہیں...... ایک دم تھرڈ کلاس...... باپ، بھائی اور وہ لڑکا خود سب نہایت لڑاکو، جھگڑالو...... لڑکے کا بھی آئے دن کچھ نہ کچھ چکر ہی رہتا ہے...... کسی کے پیسے ہڑپ کر لیے...... کسی لڑکی کو چھیڑ دیا...... کسی سے ہاتھا پائی...... کسی سے چھینا جھپٹی...... جانتے بوجھتے مکھی نہیں نگلی جاتی۔ تم بڑی بہن ہو سمجھاؤ اسے۔‘‘

’’اُف امی آپ کو کیا معلوم کتنا سمجھاتی ہوں...... سمجھ کر ہی نہیں دیتی وہ۔‘‘

’’آدمی کی کم بختی آئے تو اس کی عقل پر یونہی پردہ پڑ جاتا ہے۔‘‘ امی نے غصے سے کہا۔

☆☆☆

ڈیبی بیمار ہو گئی تھی۔ امی، سحاب اور رباب باجماعت اسے پالتو جانوروں کے ایک پرائیویٹ اسپتال لے گئیں۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح اس کا معائنہ کیا اور وہی دوائیں تجویز کیں جو انسان مریضوں کو بخار اور انفیکشن میں دی جاتی ہیں۔ رباب دو تین دن اس کی تیمارداری میں مصروف رہی...... یونیورسٹی بھی نہیں گئی۔ ولید کا فون بھی مسلسل بند ملتا رہا...... یونیورسٹی گئی تو پتا چلا ولید ایک مسروقہ کار کے کاغذات پر فروخت کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا اور حوالات میں تھا۔ رباب نے اپنے گھر میں اس بات کا کسی سے ذکر نہیں کیا...... کسی سے کیا بس سحاب ہی سے کہہ سکتی تھی اسے بھی نہ بتایا۔

ولید گلوخلاصی کے بعد یونیورسٹی آیا تو قسمیں کھا، کھا کر ساتھیوں کو اپنی بے گناہی کا یقین دلاتا رہا۔

’’ہم نے تو گاڑی خریدی تھی...... دوسری گاڑی خریدنے کے لیے اسے بیچنے گئے تو پتا چلا کاغذات جعلی تھے۔‘‘

’’جس سے گاڑی خریدی تھی اسے پکڑواتے تم لوگ۔‘‘ رباب نے کہا۔

’’یار وہ تو کرایے کے مکان میں رہتا تھا...... مکان چھوڑ کر پتا نہیں کہاں چلا گیا۔‘‘ مگر ولید کی محلے دار زینب کا کہنا تھا ولید اور اس کا باپ ایک مرتبہ پہلے بھی مسروقہ کار فروخت کرتے پکڑے گئے تھے مگر انہوں نے مک مکا

digest-library.com

کر کے جان چھڑا لی تھی۔ ان کا دھندا یہی تھا۔

''بکواس کرتی ہے زینب...... ایسا کچھ نہیں ہوا...... ابو پارٹ ٹائم گاڑیوں کی سیل پرچیز کا بزنس بھی کرتے ہیں۔ اس کام میں، میں بھی ابو کا ہاتھ بٹاتا ہوں...... اس سے پہلے ہمارے ساتھ کبھی ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔'' رباب نے یہ بات ولید کو بتائی تو وہ زینب کو برا بھلا کہنے پر اتر آیا۔

مگر زینب کا کہنا تھا اس کے محلے میں یہی مشہور ہے کہ ولید کی فیملی دو نمبر ہے۔ اس کے باپ کا کوئی مستقل ذریعۂ معاش نہیں۔ الٹے سیدھے دھندے کرتا ہے اور اس کے غلط کاموں میں ولید بھی گھر کا بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ زینب نے مزید بتایا کہ اس کے علاقے میں برسوں سے خالی پڑے ایک پلاٹ کو ولید کے باپ نے جعلی کاغذات پر فروخت کر دیا تھا۔ پلاٹ کا اصل مالک جو امریکا میں رہتا تھا پاکستان آیا تو اپنے پلاٹ پر دو منزلہ مکان تعمیر دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ بقول زینب اس شخص نے تو ولید کے باپ کے نام پرچہ بھی کٹوا دیا تھا۔ کافی عرصہ کیس چلتا رہا پھر نہ جانے کیونکر رفع دفع ہوا۔

رباب نے یہ بات بھی ولید کو بتائی تو وہ زینب اور اس کی بہن کی کردار کشی پر اتر آیا۔

''اپنے عیب چھپانے کو وہ مجھ پر اور میری فیملی پر الزامات لگا رہی ہے...... یہ اور اس کی بہن...... محلے کے کتنے ہی لڑکوں سے ان کے چکر ہیں...... دونوں شام کو اپنے گھر کی چھت سے محلے کے لڑکوں کو لائنیں مارتی ہیں...... مجھے بھی ٹریپ کرنے کی کوشش کی تھی مگر ہم شریف لوگ ہیں...... ایسی تھرڈ کلاس لڑکیوں کے چکر میں نہیں آتے...... مجھے تو تم جیسی شریف، باحیا اور خاندانی لڑکی سے شادی کرنی تھی...... تھینکس گاڈ کہ ہم دونوں کی لائن مل گئی...... تمہارے ابو کچھ راضی ہوئے؟''

''نہیں ولید...... انہی کی وجہ سے پرابلم بنی ہوئی ہے۔''

''یار مناؤ ناں انہیں...... دیکھو میں تو لاسٹ سمسٹر مکمل ہوتے ہی باہر جانے کی تیاری کر لوں گا۔''

''اکیلے کیسے!'' رباب نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں، ہاں...... تمہارے بغیر تھوڑی...... مگر تم اپنے گھر والوں کو مناؤ تو......''

''کوشش کر رہی ہوں ولید''

''اگر نہ مانے تو؟''

''ہاں، یہی فکر مجھے بھی ہے۔''

''ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔''

''اللہ سے اچھی امید رکھو۔''

''اللہ سے تو امید ہے ہی...... اللہ کی بندی بھی تو اپنے پیرنٹس کو پریشرائز کرے۔''

''تمہیں کیا پتا میں کتنی ڈٹی ہوئی ہوں۔''

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔ سحاب اور رباب اپنے مشترکہ کمرے میں ڈبل بیڈ پر پہلو بہ پہلو لیٹی باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے اور دادی کے کمرے کی مشترکہ دیوار میں موجود کھڑکی رات کو کھلی رکھی جاتی مبادا دادی کو کسی وقت انہیں پکارنے کی ضرورت پڑ جائے۔ دادی عشا کی نماز پڑھتے ہی سونے کو لیٹ جاتیں۔ بوڑھی تھیں نیند آہستہ آہستہ ہی آتی۔ دادی سوتے میں خراٹے لینے کی عادی تھیں۔ کبھی زور، زور سے خراٹوں کی آواز سنائی دیتی کبھی رک جاتی۔ جب دادی کے خراٹوں میں وقفہ آتا تو رباب مذاقاً سحاب سے کہتی۔

''دادی کی خراٹے ایکسپریس کسی اسٹیشن پر رک گئی ہے۔''

''بدتمیز دادی کا مذاق اڑاتے شرم نہیں آتی تمہیں۔'' سحاب اسے پیار سے گھُرکتی۔

اس وقت بھی دادی کے زور شور سے جاری خراٹے یکایک رک گئے تھے اور دونوں بہنوں نے دادی کے خراٹے رکنے کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔

''تم دیکھ لینا سحاب اگر ابو نے میری بات نہ مانی تو میں وہی کروں گی جو ولید کہتا ہے۔'' رباب نے کہا۔

''پاگل مت بنو...... کوئی شریف لڑکا کسی لڑکی کو

ماں باپ سے بغاوت پر نہیں اکساتا۔'' سحاب بولی۔
''ابو کیوں مجھے میرے حق سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔'' رباب کا لہجہ جارحانہ تھا۔
''کون سا حق؟ کس حق کی بات کرتی ہو؟''
''میں ولید کو پسند کرتی ہوں..... اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں میرا حق ہے کہ میری شادی میری پسند کے بندے سے کی جائے..... دین بھی اس کی اجازت دیتا ہے۔''
''ابو، ولید کو تمہارے لیے مناسب نہیں سمجھتے رباب۔''
''ان کے مناسب نہ سمجھنے سے کیا ہوتا ہے..... زندگی تو مجھے گزارنی ہے..... مجھے وہ پسند ہے۔''
''دیکھو امی کے کہنے پر ابو نے اس کے اور اس کی فیملی کے بارے میں ان کے علاقے سے پوچھ گچھ کرائی تھی..... اچھی رپورٹ نہیں ملی۔'' سحاب نے کہا۔
''مجھے تو اچھی لگتی ہے اس کی فیملی..... ولید کی امی مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔''
''تمہیں کیسے معلوم کہ وہ تم سے پیار کرتی ہیں۔''
''بس معلوم ہے۔''
''پتا تو چلے کیسے معلوم ہے؟''
''کہہ دیا ناں بس معلوم ہے۔''
''جب تک بتاؤ گی نہیں میں آگے بات نہیں کروں گی۔''
''میں ایک روز گئی تھی اُن کے گھر۔''
''کب... کیوں؟'' سحاب چونک کر بولی۔
''کچھ دن پہلے۔''
''لیکن کیوں... کیوں گئی تھیں تم؟''
''ولید لے گیا تھا۔''
''کس لیے؟''
''اپنا گھر دکھانے۔''
''بیوقوف! کیوں گئی تھیں تم؟''
''اس لیے کہ مجھے آخرکار اسی گھر میں تو جانا ہے..... ولید نے مجھے اپنا کمرا بھی دکھایا..... اس نے بڑے، بڑے پوسٹرز لگا رکھے ہیں اپنی فیورٹ سیلبریٹیز کے۔''
''ابو کو پتا چلے کہ تم اس کے گھر گئی تھیں تو وہ کتنے ناراض ہوں گے۔''
''مجھے پروا نہیں۔''
''رباب! رباب!'' سحاب نہایت پریشان ہو کر اس سے بولی۔ ''کیا ہو گیا ہے تمہیں..... تم نہیں جانتیں کیسے، کیسے واقعات ہو جاتے ہیں..... لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر لڑکے اِدھر اُدھر لے جاتے ہیں اور انہیں برباد کر دیتے ہیں۔''
''وہ ایسا نہیں ہے۔''
''وہ ایسا ہو یا نہ ہو تمہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے..... آئندہ ایسی حماقت مت کرنا۔''
''امی کو بتا دو..... وہ ابو کو راضی کریں ورنہ.....''
''ورنہ؟ ورنہ کیا؟''
''میں وہی کروں گی جو ولید چاہے گا۔''
''رباب! رباب پلیز!''
''میں بس سمسٹر ختم ہونے کا انتظار کر رہی ہوں..... پھر تم دیکھنا کیا ہوتا ہے۔''
''ابو کو کچھ ہو جائے گا رباب۔''
''جب ابو کو میری پروا نہیں تو میں ان کی پروا کیوں کروں۔'' وہ عجیب سفاکی سے کہہ رہی تھی۔
دادی کا بیڈ دونوں پوتیوں کے مشترکہ کمرے اور ان کے اپنے کمرے کی مشترکہ کھڑکی کے نزدیک ہی بچھا ہوا تھا اور کھڑکی حسبِ معمول رات کو کھلی رکھی جاتی تھی..... کچھ دیر پہلے اچانک آنکھ کھل جانے پر دادی رات کے سناٹے میں دونوں لڑکیوں کی باتیں سن رہی تھیں اور دم بخود تھیں۔ بیٹے کے چہرے پر ہمہ وقت تناؤ اور بیٹی سے کھنچاؤ کی وجہ ان پر آشکار ہو گئی تھی..... بیٹے کے گھر کا مسئلہ ان کا اپنا مسئلہ اور اس گھر کی عزت ان کی اپنی عزت تھی..... دادی اس رات بہت..... بے سکون رہیں۔ جہاندیدہ عورت تھیں۔ معاملے کی نزاکت سے آگاہ تھیں۔
لیکن اگلی صبح جب وہ حسبِ معمول عبادات سے فارغ ہو کر اپنے کمرے سے نکلیں تو انہوں نے کسی پر رازآشنائی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ رباب سے اپنا طرزِ

عمل معمول کے مطابق لگاؤ کا رکھا حالانکہ دل میں پہلے والی محبت میں دراڑ آچکی تھی...... کتنی سرکشی اور بے باکی تھی رات کو اس کی باتوں میں!

☆☆☆

دادی کے آنے کے بعد سے شفیق احمد کا معمول تھا شام کو دفتر سے گھر واپسی کے بعد کچھ دیر والدہ کے پاس آکر ضرور بیٹھتے اور اس دوران بہو کو جو ناگواری رہتی اس کا اندازہ انہی کو ہوتا۔ حالانکہ ماں، بیٹے میں ان کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں ہوتی۔

اس شام بھی شفیق احمد والدہ کے پاس آکر بیٹھے تو کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر والدہ نے ان سے کہا۔

''ماشاء اللہ تمہارے بچوں کی تو شادی کا وقت آگیا...... کچھ سوچا بچیوں کے لیے؟''

شفیق احمد کچھ بے چین سے دکھائی دیے اور چپ رہے۔

''کیا ہوا؟'' والدہ بولیں۔

''رباب کے لیے ایک رشتہ آیا ہے مگر میں اس کی طرف سے مطمئن نہیں۔'' شفیق احمد نے کہا۔

''سحاب بڑی ہے...... پہلے اس کی ہونی چاہیے۔''

''ہاں ہونی تو اسی کی چاہیے مگر......''

''مگر کیا؟''

''کیا بتاؤں آپ کو......'' شفیق احمد کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔

''کوئی بات نہیں...... نہ بتاؤ۔''

''آپ کو نہیں تو پھر کسے بتاؤں گا۔''

''کیا ہوا؟'' دادی نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا۔

شفیق احمد تو کب سے اپنے دل کا بوجھ والدہ سے شیئر کرنا چاہتے تھے...... ماں ہستی ہی ایسی ہے کہ اولاد اس سے اپنے دل کا درد بیان کر کے ہلکی پھلکی ہو جائے۔ شفیق احمد نے والدہ کو سارا قصہ بتادیا۔

''چھوٹی ہے...... اس کے لاڈ میں نے انیق اور سحاب سے زیادہ اٹھائے...... بہت پیاری تھی مجھے...... مگر اس نے میرا بھروسا پارہ، پارہ کردیا...... آپ نے کئی دفعہ مجھ سے پوچھا کہ میں اس سے بات کیوں نہیں کرتا ہوں...... یہ ہے وجہ...... میں نے تو اس کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔'' شفیق احمد دل گیر لہجے میں بولے۔

''دیکھو بیٹا تمہیں کسی انہونی کا سامنا نہیں ہے...... زمانہ بدل گیا ہے۔ لڑکے اور لڑکیوں کا اسکول، کالجوں اور یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھنا اور آزادانہ میل جول ہو تو ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کا رجحان ہو جانا اب عام سی بات بن گئی ہے۔ لہٰذا رباب کا اگر اس لڑکے کی طرف رجحان ہے تو تم اس بات کو مسئلہ نہ بناؤ کہ لڑکا رباب کی پسند کیوں ہے۔''

''مسئلہ یہ نہیں ہے...... میں تو راضی ہو گیا تھا اس پر...... لیکن ان کے اور ہمارے سماجی فرق کے باوجود بھی جب میں نے ان لوگوں کے بارے میں معلومات کروائیں تو پتا چلا نہایت تھرڈ کلاس لوگ ہیں۔ اسٹیٹس کو میں نے لڑکی کی ضد کے باعث نظر انداز کر دیا مگر شرافت اور نیک نامی تو ہو...... خاندانی پن تو ہو۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔''

''بہت ٹوٹ گیا ہوں...... جس اولاد کو ہم سینے سے لگا کر پالیں وہ جب ہمارے بھروسے اور اعتبار کو توڑ ڈالے تو دکھ تو ہوتا ہے اماں۔''

''میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتی ہوں۔''

''خاندان میں کئی اچھے رشتے موجود تھے ان کے لیے۔''

''جانتی ہوں۔''

''پھر بھی میں آپ کی بہو کے یہ بتانے پر کہ وہ اسی لڑکے سے شادی کے لیے بضد ہے راضی ہو گیا مگر یہ معلوم ہونے کے بعد کہ ان لوگوں کی کچھ اچھی شہرت نہیں ہے، میں جانتے بوجھتے اپنی لڑکی کا مقدر نہیں پھوڑ سکتا...... اسے بعد میں تکلیف ہو گی تو میں بھی عذاب میں رہوں گا۔''

''صحیح کہتے ہو۔''

''آپ دعا کریں کہ یہ وقت آسانی سے گزر جائے۔''

''ان شاء اللہ...... اللہ پر بھروسا رکھو...... تم باپ ہو، اولاد کا بھلا ہی چاہو گے...... اللہ پاک مدد فرمائیں گے۔''

digest library.com

والدہ سے بات کر کے شفیق احمد کا دل کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

ڈیبی سے رباب ہی نہیں سحاب اور امی کو بھی بہت انس ہو گیا تھا...... ذرا ادھر اُدھر ہوتی ڈیبی کے نام کی آوازیں لگنے لگتیں...... گھر میں ڈھنڈیا مچ جاتی......

دادی بھی خوش تھیں کہ رمیسا کی بلی کسی غیر گھر میں دینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی...... رباب نے اسے اپنی پالتو بنا لیا تھا۔

ڈیبی کی ناز برداریاں کیا کہنے...... ڈیبی ایسی پھولی پھولی اور دودھیا رنگت کی بلی تھی کہ جو اسے دیکھتا خوش ہوتا...... محلے میں کافی بچوں کی نظریں اس پر تھیں......اغوا کیے جانے کے خوف سے ڈیبی کو گھر سے باہر کم ہی نکلنے کا موقع دیا جاتا...... بہت ہوا تو گھر کے باہر باڑھ کی حدود کے اندر، اندر مٹر گشت کر لیتی اور اس دوران بھی رباب، سحاب، امی اور کبھی دادی بھی باہر کھڑی ہو کر اسے دیکھتی رہتیں۔ گھر میں بس شفیق احمد تھے جو اس بلی کو لائقِ اعتنا نہ سمجھتے بلکہ ناپسند کرتے۔

وہ تھی ہی اتنی تمیز دار کے کچھ دیر کو گھر سے باہر نکلتی اور گھر کے باہر لگی باڑھ کے اندر کچھ دیر گھوم پھر کر واپس آ جاتی۔ گھر کے باہر آوارہ گھومتی کسی عام بلی کو ڈیبی ذرا منہ نہ لگاتی بلکہ بلیاں تو ڈیبی کے پھولے، پھولے وجود کو دیکھ کر خود ہی اس سے ڈر کے پرے رہتیں۔ گھر میں کوئی مہمان آتا تو وہ اسے دیکھ کر اِدھر اُدھر چھپ جاتی۔ ڈیبی بہت ذہین تھی۔ انسانوں کی نظروں میں محبت، نفرت، کراہت اور ناپسندیدگی کو جلد تاڑ لیتی...... شفیق احمد کو دیکھتے ہی وہ اپنا راستہ بدل لیتی یا اِدھر اُدھر بھاگ لیتی۔

''ڈیبی، ابو سے بہت ڈرتی ہے۔'' سحاب ایک روز بولی۔

''وہ جانتی ہے کہ ابو اس سے نفرت کرتے ہیں۔'' رباب نے فوراً کہا۔

''کیوں بھلا!'' دادی بولیں۔ ''وہ نفرت کیوں کرے گا اس سے؟''

''کیونکہ وہ اسے پسند نہیں کرتے۔''

''تمہارا وہم ہے۔''

''نہیں دادی...... مجھے معلوم ہے۔'' رباب بولی۔

''ناپسند کرنے کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔''

''کیونکہ میں اس سے پیار کرتی ہوں۔''

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟''

''یہی بات ہے...... ابو ہر اس چیز، ہر اس شخص کو ناپسند کرتے ہیں جو مجھے پسند ہو۔''

''نہیں چندا ایسی بات نہیں۔''

''آپ نہیں سمجھ سکتیں دادی۔''

''تم ہی سمجھا دو۔'' دادی نے رباب کو ذومعنی نگاہوں سے دیکھا۔

''دادی، رباب بیوقوف ہے۔ آپ اس کی بات کو سیریس نہ لیں۔'' سحاب نے کہا۔

''تم اپنی عقل مندی کا سرٹیفکیٹ اپنے پاس رکھو۔''

''ارے، ارے...... تم دونوں آپس میں لڑنے کیوں لگیں۔''

''آپ نے ہمیں لڑتے دیکھا ہے کبھی۔'' سحاب نے دادی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''نہیں...... ماشاء اللہ تم دونوں بہنوں میں بہت پیار ہے...... لڑنا جھگڑنا خاندانی لوگوں کا شیوا نہیں ہوتا۔''

''دادی ہماری ڈیبی بھی خاندانی ہے۔'' رباب نے اپنی گود میں بیٹھی ڈیبی کے نرم و ملائم سفید بالوں پر دھیرے، دھیرے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اس میں کیا شک ہے۔''

''ہمیشہ تمیز سے رہتی ہے...... تھوڑا، تھوڑا کھاتی ہے...... گلی میں گھومنے والی بلیوں کی طرح آوازیں نہیں نکالتی...... گھر میں کوئی دوسری بلی گھس آئے تو اس سے لڑتی نہیں...... بس چپ چاپ بیٹھی دیکھتی رہتی ہے یا اٹھ کر چل دیتی ہے...... دادی آپ نے دیکھا ڈیبی چلتی بھی کتنے وقار سے ہے۔''

''کیٹ واک رباب۔'' سحاب نے لقمہ دیا۔

''ہاں، دادی سیلبرٹیز کی طرح کیٹ واک۔''

Digest Library . Com

''اور دادی اتنی سمجھدار ہے ڈیبی کہ اپنے پاٹ کے علاوہ کہیں اور گندگی نہیں کرتی۔''

''چندا! بہت سمجھدار ہوتی ہیں بلیاں۔''

''ساری بلیاں نہیں دادی..... صرف ہماری ڈیبی۔''

''نہیں بیٹا، ہر بلی سمجھ رکھتی ہے..... ہم انسانوں کی طرح محبت، نفرت، ڈانٹ پھٹکار سب سمجھتی ہیں...... البتہ نسل کی وجہ سے ان کے رویّے اور عادات میں فرق ہوتا ہے..... جیسے انسانوں میں فرق ہوتا ہے۔''

''دادی ٹھیک کہتی ہیں۔'' سحاب نے رباب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، ناں..... ڈیبی کتنی تمیز سے بیٹھی ہے تمہاری گود میں..... آنکھیں بند کرکے اور...... تم نے بھی اسے بہت پیار..... سے اسے اپنی گود میں بٹھا رکھا ہے..... اس کی جگہ کوئی کالی، گندی، غلیظ سی بلی یا بلا ہوتا تو کیا تم اسے اتنے پیار سے بٹھاتیں اپنی گود میں؟''

''ڈیبی کی طرح پالتو ہوتی تو اسے بھی بٹھا ہی لیتی میں۔'' رباب نے کہا۔

''مگر بیٹا اس دوسری بلی کو گود میں بٹھاتے ہوئے تم یہ تو دیکھتیں کہ صورت کی بھی بھلی ہو..... صاف ستھری ہو..... کیچڑ، مٹی میں نہ سنی ہو..... کٹ کھنی نہ ہو..... پنجے نہ مارتی ہو..... ندیدی نہ ہو کہ ہر وقت میاؤں، میاؤں کرکے کھانا ہی مانگتی رہے۔''

''دادی عادتیں تو بعد میں پتا چلتی ہیں...... صورت دیکھ کر رباب دھوکا کھا جاتی اور بعد میں پتا چلتا کہ کٹ کھنی بھی ہے، ندیدی بھی ہے..... رباب تو اسے پال کر پھنس ہی جاتی۔'' سحاب بولی۔

''اتنی بیوقوف نہیں ہوں میں کہ دیکھے بھالے بغیر ہی کسی بلی کو اپنی پالتو بنالوں...... ڈیبی تو دادی کے ساتھ آئی تھی..... ربیا نے اسے پالا تھا..... اور مجھے اچھی بھی لگی تھی۔''

''ایسی مانوس ہوگئی ہے تم سے کہ یونیورسٹی سے تمہاری واپسی کے وقت دوڑ کر کمرے سے لاؤنج اور لاؤنج سے پورچ میں جا پہنچتی ہے۔'' دادی بولیں۔

''وفادار ہے دادی۔'' رباب نے فخریہ کہا اور

کیا ہم انسان ہیں؟

ہماری ماسی عام طور سے پانچ بجے تک اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ ایک بار صبح آئی تو کہنے لگی آج کیا ہوا بتاؤں؟ میں نے پوچھا کیا ہوا تو بتایا کہ اسپتال کے سامنے جہاں گاڑیاں پارک ہوتی ہیں۔ ایک اٹھارہ، بیس سال کا لڑکا زمین پر پڑا ہوا تھا۔ بہت سا خون اس کے جسم سے بہہ رہا تھا۔ میں نے کہا بھائی اسے اسپتال لے جاؤ۔ تو مجھے ڈانٹ دیا۔ کہا جاؤ، جاؤ...... میں نے پھر کہا تو پھر ڈانٹا۔ تم کون ہو۔ اسے تو گولی لگی ہے۔ میں جانے لگی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک آدمی اس کی جیب سے موبائل نکال رہا تھا اور دوسرا اس کی جیب سے پیسے نکال رہا تھا۔ افسوس صد افسوس..... کیا واقعی ہم انسان ہیں..... دل کو بڑی تکلیف پہنچی..... کئی دن یہ خیال رہا..... خدا جانے کس ماں کا بیٹا اور کس بہن کا بھائی تھا۔ افسوس ماسی ضیا الدین اسپتال کلفٹن کراچی کے پیچھے رہتی ہے۔

تحریر: فریدہ ہاشمی، کراچی

نہایت محبت سے ڈیبی پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''نسلی ہے چندا۔'' دادی بولیں۔

☆☆☆

سمسٹر ختم ہونے میں چند ہفتے ہی رہ گئے تھے...... رباب سے ولید کا اصرار روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔

''میں انتظار نہیں کروں گا..... اِدھر سمسٹر مکمل ہوا اُدھر میری روانگی۔'' اس نے رباب سے کہا۔

''میں کیا کروں ولید..... ابو مانتے ہی نہیں۔''

''کورٹ میرج سب سے آسان حل ہے...... تمہارے ابو دیکھتے رہ جائیں گے۔''

''پھر کبھی میری صورت بھی نہیں دیکھیں گے۔''

''بس تم اسی فکر میں رہنا..... میں تو اڑا۔''

''دادی کی بات ابو نہیں ٹالتے مگر امی کہتی ہیں

Digest Library

دادی کو پتا نہ چلے۔''
''یار! دادی کی بات نہیں ٹالتے تو دادی سے ہی بات کرو۔''
''مگر امی نے جو منع کر رکھا ہے۔''
''امی کو چھوڑو...... تمہاری دادی اور امی کا ساس بہو کا رشتہ ہے...... دنیا میں کہیں ساس، بہو کی بنی ہے جو تمہاری امی اور دادی کی بنے گی...... تم دادی سے بات کرو...... شاید وہ منالیں تمہارے ابو کو اور کورٹ کچہری کی نوبت نہ آئے۔''
رباب سوچ میں پڑ گئی۔
''اے! کیا سوچنے لگیں۔'' ولید نے رباب کا شانہ جھنجوڑا۔
''اچھا! کوشش کرتی ہوں دادی سے بات کرنے کی۔''
''کوشش نہیں...... کرو بات...... وقت کم ہے۔''
''اوکے۔''
''دادی سے بات کرو گی تو امی سخت خفا ہوں گی۔'' رباب نے سحاب سے مشورہ کیا تو وہ بولی۔
''امی خود بھی تو کچھ نہیں کر رہیں۔''
''ابو کی مرضی کے خلاف کیا کر سکتی ہیں امی۔''
''میں دادی سے بات کروں گی۔''
''رباب! امی خفا ہوں گی۔''
''چپ رہو۔''
''دادی! آپ سے ایک بات کرنی ہے۔'' موقع دیکھ کر رباب نے دادی سے کہا۔
''سو باتیں کرو میری چندا!'' دادی جہاندیدہ تھیں، سمجھ گئیں۔
''ایک لڑکا ہے دادی۔'' رباب ہچکچاتے ہوئے بولی۔
''لڑکے تو بہت ہوتے ہیں۔''
''وہ میرا کلاس فیلو ہے دادی۔''
''یونیورسٹی میں؟'' دادی انجان بنیں۔
''جی۔''
''کیا ہوا اسے؟''
''اسے کچھ نہیں ہوا...... وہ...... وہ...... مجھے پسند کرتا ہے۔''
''ہو جاتا ہے...... ساتھ پڑھتے ہیں تو ایسا ہو جاتا ہے۔''
''دادی۔ شا...... شادی کرنا چاہتا ہے...... مجھ سے۔''
''بڑی اچھی بات ہے!'' دادی نہایت اطمینان سے بولیں۔
''ابو نہیں مان رہے۔''
''کیوں؟''
''بس خواہ مخواہ۔''
''کوئی تو وجہ ہوگی۔''
''دادی زندگی تو مجھے گزارنی ہے...... وجہ کوئی بھی ہو...... جب میں راضی ہوں تو ابو کو کیا مسئلہ ہے...... کر دیں میری اس سے شادی...... میں گزارہ کر لوں گی...... ابو سے یا کسی سے کبھی کوئی گلہ نہیں کروں گی۔''
''بیٹا! شادی گزارہ کرنے کے لیے نہیں اچھے ساتھی کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کرنے اور اگلی نسل کی بہتر آبیاری کے لیے کی جاتی ہے۔ شادی کے لیے صرف تمہارا راضی ہونا کافی نہیں...... تمہارے ماں، باپ یہ ضرور دیکھنا چاہیں گے کہ تمہارا انتخاب تمہیں اچھی زندگی دے سکتا ہے یا نہیں۔''
''ابو اسٹیٹس کانشس ہیں...... جبکہ مجھے اسٹیٹس سے کوئی غرض نہیں...... میں اسے پسند کرتی ہوں...... اس کا اور میرا مائنڈ سیٹ ایک ہے۔''
''بچے کبھی، کبھی دھوکا بھی کھا جاتے ہیں...... غلطی کر جاتے ہیں...... ماں، باپ اپنی اولاد کا بھلا چاہتے ہیں...... بیٹی کا ہاتھ دوسرے کو تھمانے سے پہلے اُن کی نظریں بہت کچھ دیکھتی، بہت کچھ جانچتی، پرکھتی ہیں۔ تمہارا باپ اگر راضی نہیں ہو رہا ہے تو یقیناً اس لیے کہ اس لڑکے کو یا اس کے گھرانے کو تمہارے لیے مناسب نہیں سمجھتا ہوگا۔''
''دادی! دادی! آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں...... ابو کو بس ضد آ گئی ہے۔'' رباب کو دادی کا سمجھانا اچھا نہیں لگا۔
''کیسی ضد؟''

''کہ وہ اس سے میری شادی نہیں کریں گے......

دادی آپ ابو سے بات کریں ناں...... انہیں سمجھائیں...... پلیز...... پلیز دادی......''

''چندا! تمہارے ماں، باپ تمہارے لیے بہتر سوچ سکتے ہیں...... بہرحال تم کہتی ہو تو بات کر لوں گی۔''

''تھینک یو دادی۔''

☆☆☆

''امی تو بات کر نہیں رہیں ابو سے...... میں نے دادی سے کہا ہے وہ بات کریں گی ابو سے۔'' رباب نے بڑی بہن کو خود ہی بتا دیا۔

''اُف اللہ رباب! میں نے کتنا سمجھایا تھا تمہیں مگر تم نے وہی کیا...... منع کیا تھا امی نے کہ دادی کو پتا نہ چلے۔''

''تم بتا دو ناں کہ میں نے دادی کو بتا دیا ہے۔''

''بتانا پڑے گا...... ورنہ امی مجھ پر بھی خفا ہوں گی۔''

''بتا دو، میں ڈرتی نہیں۔''

سحاب نے اپنی جان خلاصی کے لیے امی کو بتانا ضروری سمجھا۔ امی آگ بگولا ہوتی رباب کے پاس پہنچیں۔

''کیوں بتایا تم نے اپنی دادی کو؟''

''جب آپ راضی نہیں کر پا رہیں ابو کو...... تو مجھے کسی کی مدد تو لینا تھی۔'' اس نے بے دھڑک کہا۔

''دادی تو جیسے بہت دوست ہیں ناں تمہاری...... اب وہ اپنی بیٹی کو بتائیں گی اور سارے خاندان میں مشتہر ہوگا کہ شفیق احمد کی چھوٹی صاحبزادی اپنی پسند کا رشتہ گھر لائی ہیں۔''

''ہونے دیں تشہیر...... مجھے فرق نہیں پڑتا۔''

''تمہیں نہ پڑتا ہو...... ہمیں فرق پڑتا ہے۔''

''اپنی پسند کا رشتہ لانا کوئی بری بات تو نہیں۔''

''مگر جو معلومات ہوئی ہیں اس لڑکے اور اس کی فیملی کے بارے میں وہ جب رشتے داروں کے کانوں تک بھی پہنچیں گی تو لوگ ہنسیں گے کہ نہیں۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے...... بتانے والوں نے غلط بتایا ہے ابو کو...... وہ بہت نائس ہے...... اور اس نے کون سا یہاں رہنا ہے...... وہ تو شادی کے بعد باہر چلا جائے گا۔''

امی نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

''آپ اور ابو اتنے دشمن کیوں بنے ہوئے ہیں ولید اور اس کی فیملی کے؟''

''کیونکہ جانتے بوجھتے تمہارا مقدر پھوڑ کر تم سے دشمنی نہیں کرنا چاہتے ہم۔''

''آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ وہ لوگ اچھے ہیں۔''

''تم تو جیسے ان کی سات پشتوں میں اٹھی بیٹھی ہو۔''

''وہ ڈیسنٹ ہے تو اس کی فیملی بھی اچھی ہی ہوگی ناں۔''

''ڈیسنٹ!'' امی نے طنز سے کہا۔ ''تمہارے ابو کو اسی کے محلے سے معلوم ہوا کہ اچھے چال چلن کا لڑکا نہیں ہے وہ...... بن ٹھن کے یونیورسٹی جانے سے اعمال نہیں چھپ جاتے...... تمہاری عقل پر تو پردہ پڑ گیا ہے...... بار، بار سوچتی ہوں کہ کہاں چوک ہوگئی مجھ سے...... بڑی بہن کو دیکھو وہ بھی یونیورسٹی میں پڑھی ہے...... اب جاب بھی کر رہی ہے...... تمہاری طرح ہم ماں باپ کے منہ کو آئی کبھی۔''

''مجھے کسی سے کمپیئر نہ کریں...... میری اپنی زندگی ہے۔''

''یہ تمہاری نسل کا محبوب کلمہ ہے۔ میری اپنی زندگی ہے...... یہ کیوں بھول جاتے ہو تم لوگ کہ اللہ پاک نے تمہیں تمہارے ماں باپ کے ذریعے زندگی بخشی ہے...... وہ سبب بنے ہیں تمہارے اس دنیا میں آنے کا...... ان کا بھی کچھ حق ہے تمہاری زندگی پر...... گوشت پوست کا بے بس لوتھڑا ہوتے ہو تم پیدائش کے وقت...... تمہیں پالے پوسیں ہم ماں باپ...... تمہیں اٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا سکھائیں ہم...... تمہارے لیے اپنی راتوں کی نیند حرام کریں ہم...... تمہاری ضرورتوں اور سہولتوں کا خیال رکھیں ہم...... تمہیں پڑھائیں لکھائیں ہم...... تمہارے اچھے برے کی فکر رکھیں ہم...... اور جب تمہاری زندگی کے اہم ترین فیصلے کا موقع آئے تو تم ماں، باپ سے اپنی نظریں بدل کر کہہ

digest-library.com

دو...... ''تمہاری اپنی زندگی ہے''...... واہ بہت خوب!'' امی ایک سانس میں بولتی گئیں۔ اور شدتِ جذبات سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مگر رباب پر امی کی جذباتی گفتگو کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس کی امید اب دادی سے لگی تھی۔

☆☆☆

''دادی آپ ابو سے کب بات کریں گی؟'' وہ ٹھنک رہی تھی۔

''کروں گی چندا...... موقع دیکھ کر بات کروں گی۔''

''کیسا موقع دادی...... ہمارے فائنلز شروع ہونے والے ہیں...... سمسٹر ختم ہونے کے بعد وہ باہر جا رہا ہے۔''

''بیٹا! تمہارے باپ کا موڈ دیکھ کر بات کروں گی۔''

''ان کا موڈ تو کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔''

''اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی...... اور وہ بھی باپ سے۔'' رباب شرمندہ ہوگئی۔

''خیر...... تم اطمینان رکھو...... تم سے وعدہ کیا ہے تو کروں گی بات...... مگر ایک بات سمجھ لو تم...... اپنے اچھے برے کی تم خود ہی ذمے دار ہو گی۔''

''وہ تو میں امی سے کب کا کہہ چکی ہوں......''

''چلو دیکھتے ہیں......''

دادی بھی اسے بہلا ٹہلا ہی رہی تھیں ورنہ بیٹے سے تو ان کی بات ہو چکی تھی...... شفیق احمد نے صاف کہہ دیا تھا کہ ولید اور اس کی فیملی کے بارے میں منفی معلومات حاصل ہونے کے بعد وہ اس لڑکے سے رباب کا رشتہ کر کے اس کا مقدر نہیں پھوڑ سکتے...... اب ان سے بات کرنے کی گنجائش کہاں تھی...... پھر بھی دادی نے رباب کو آسرا اس لیے دے رکھا تھا کہ اس کے اپ سیٹ ہونے سے اس کے فائنل امتحانات میں کارکردگی متاثر نہ ہو...... منتشر ذہن کے ساتھ کوئی طالب علم امتحان میں اچھی کارکردگی کیسے دکھا سکتا ہے۔

☆☆☆

فائنلز سے کچھ پہلے ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔ گرلز ہاسٹل میں مقیم ایک طالبہ کو اس کا ایک طالب علم ساتھی ایک نجی فلیٹ میں لے گیا اور اپنے تین دوسرے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ان سب نے اس لڑکی سے زیادتی کی پھر اس کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کر دیا۔ ان چار بے حمیت نوجوان طالب علموں میں سے ایک ولید تھا۔ چاروں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

ولید کی اصلیت کھلنے پر رباب کا وہ حال تھا کہ مارے شرمندگی کے نہ یونیورسٹی میں اپنے ساتھیوں سے نظریں ملا پاتی تھی نہ اپنے گھر والوں سے۔

''میں تم سے کہتی تھی ناں ولید اچھا لڑکا نہیں ہے۔'' زینب نے جتایا۔

''اب تو آنکھیں کھل جانی چاہئیں تمہاری۔'' امی نے کہا۔

رباب کا سر جھک گیا۔

''شکر کرو رباب کہ تم بچ گئیں......'' سحاب بولی۔

''بہت اچھا ہوا کہ میں نے تمہارے باپ سے اب تک بات نہیں کی تھی۔'' دادی بولیں۔ رباب کی بولتی بند تھی۔

''شکر ہے تمہارے باپ نے تمہیں غلط ہاتھوں میں جانے سے بچا لیا۔'' دادی نے کہا۔

رباب کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

''وہ ایسا نہیں ہے دادی...... لگتا ہے اسے پھنسایا گیا ہے۔''

''بیٹا! یونیورسٹی کے سیکڑوں، ہزاروں لڑکوں میں سے صرف یہ چار لڑکے ہی اور ان چاروں میں بھی وہی کیوں۔''

رباب بے بسی سے دادی کا منہ تکنے لگی۔

''اس نے میرا دل توڑا ہے۔'' رباب روہانسی ہوگئی۔

''اس نے تمہارا دل نہیں اعتبار اور بھروسا توڑا ہے۔'' دادی کا لہجہ ہمدردانہ تھا۔

''میں نے اس کی وجہ سے ابو کو ناراض کیا...... امی سے زبان چلائی...... اسے کبھی معاف نہیں کروں گی میں......''

''اب تو تمہیں یقین آ جانا چاہیے کہ تمہارے

ماں، باپ تمہارا بھلا ہی چاہتے ہیں.....اچھا ہوا کہ میں نے تمہارے باپ سے بات نہیں کی تھی۔"

رباب نے سر جھکا لیا۔

"جلد یا بدیر بچے سمجھ ہی جاتے ہیں کہ ان کے والدین ان کے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں۔" دادی نے اسے چمکارا۔

"اب کیا ہوگا دادی؟"

"ہونا کیا ہے.....جرم کرنے والے سزا پائیں گے۔"

"میری دوست زینب تو اسی کے محلے میں رہتی ہے، وہ تو پہلے ہی کہتی تھی ولید اور اس کے گھر والے اچھے نہیں ہیں.....اب تو وہ میرا بہت مذاق اڑائے گی۔"

"شکر کرو کہ بات اس کے مذاق اڑانے پر ہی ٹل گئی.....اللہ نہ کرے تم زندگی بھر کو پھنس جاتیں تو کیا ہوتا....."

دادی کی بات رباب کے دل کو لگی.....کچھ دیر وہ مغموم اور خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے مہین سی آواز میں کہا۔

"دادی....."

"جی.....میرا بچہ....."

"ایک کام کردیں گی۔"

"ہاں بولو....."

"وہ.....دادی.....آپ.....آپ مجھے.....ابو سے سوری کرادیں۔"

"چلو ابھی کرادیتی ہوں....."

"وہ ناراض ہوئے تو؟"

"ناراض تو وہ پہلے ہی ہیں.....تھوڑا اور ہولیں گے۔"

"رہنے دیں دادی....."

"کیوں رہنے دوں....."

"ابو اور ناراض ہوئے تو؟"

"سب ٹھیک ہوجائے گا....."

رباب، دادی کا منہ دیکھنے لگی۔

دادی مسکرائیں پھر یکایک سنجیدہ ہوکر بولیں۔

"اٹھو.....نیک کام میں دیر کیوں..... ماں، باپ کو ناراض رکھنا اچھی بات نہیں ہوتی....."

"دادی.....! ابو میری طرف دیکھتے تک نہیں.....اپنی ناراضی کیسے دور کریں گے....." وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"ارے چندا! جب تک تم خود اس مقام کو نہیں پہنچوگی تمہیں کیونکر پتا چلے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ماں، باپ کو اولاد کی غلطی معاف کرنے کے لیے کتنا بڑا دل اور کتنا اعلیٰ ظرف دیا ہوتا ہے.....اٹھو شاباش....."

"جاؤ ناں دادی کب سے کہہ رہی ہیں....." سحاب جو اُن دونوں کی بات چیت اب تک خاموشی سے سن رہی تھی رباب سے بولی۔

ڈیبی اپنے گدیلے پر مزے سے لیٹی تھی۔

رباب جانے کو اٹھی.....دادی تو پہلے ہی پابہ رکاب تھیں۔

"ڈیبی کا خیال رکھنا.....باہر نہ نکل جائے۔" رباب نے بہن سے کہا۔

"کتنا خیال رکھتی ہو تم ڈیبی کا....." دادی نے رباب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ذرا سوچو تو تمہارے ماں، باپ کو تمہارا کتنا خیال رہتا ہوگا۔"

"سچ دادی....." سحاب نے دادی کی بات کی پُرزور تائید دی۔

"چلیں دادی....." رباب کی نگاہوں میں دادی کے لیے ممنونیت تھی۔

رباب کو اپنے ساتھ لے کر دادی اس خلیج کو پاٹنے چلی گئیں جو کافی دنوں سے ان کے بیٹے اور پوتی کو ایک دوسرے سے دور کیے ہوئے تھی۔

سحاب گدیلے پر لیٹی ڈیبی کے نرم، نرم وجود پر دھیرے، دھیرے اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"امی خواہ مخواہ کہتی تھیں دادی کو مت بتانا..... دادی نہ ہوتیں تو اس وقت رباب کو ابو سے سوری کروانے کون لے جاتا.....امی تو اسے ابو کے پاس لے جانے سے پہلے سو، سو باتیں سناتیں.....دادی کتنے آرام سے لے گئیں۔ واقعی دادی، دادی ہیں۔"

Digest Novels Lovers Group

اِک رشتہ بھابی کا

عظمیٰ زہری

Digest Novels Lovers Group

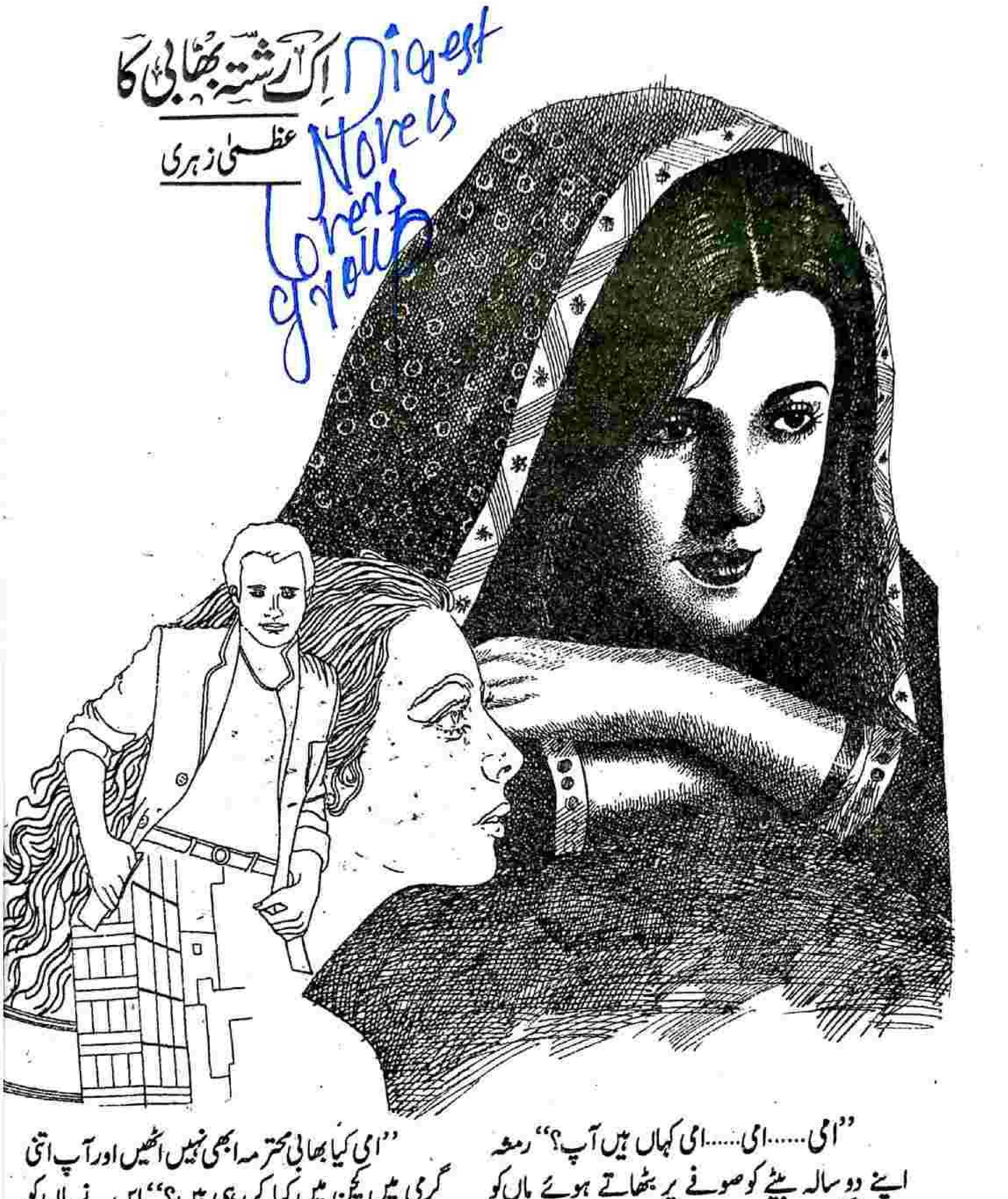

''امی......امی......امی کہاں ہیں آپ؟'' رمشہ اپنے دو سالہ بیٹے کو صوفے پر بٹھاتے ہوئے ماں کو پکارنے لگی۔ رات ہی وہ اسلام آباد سے کراچی اپنے میکے آئی تھی اب کافی آرام کر کے اٹھی اور کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ زینب بیگم اس کی آواز سن کر کچن سے نکل آئیں۔

''جی بیٹا، بولو کیا چاہیے؟''

''امی کیا بھابی محترمہ ابھی نہیں اٹھیں اور آپ اتنی گرمی میں کچن میں کیا کر رہی ہیں؟'' اس نے ماں کو دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے دیکھ کر پوچھا۔ زینب بیگم نے آگے بڑھ کر رمشہ کے بیٹے ارحم کو گود میں لے لیا اور بیٹی کے قریب آ گئیں۔

''رمشہ بیٹا ایسا نہیں کہتے صبح اٹھی تھی فریحہ، فجر کی نماز پڑھی' مجھے ناشتا دیا تمہارے بھائی کو ناشتا کروایا

کچن وغیرہ سمیٹا، تمہارے ناشتے کا بندوبست کیا پھر میں نے ہی اسے کہا کہ اب کچھ دیر آرام کرلے۔''

''کیوں امی، ایسا کیا ہوگیا مہارانی کو جو آرام ہی کیے جارہی ہے۔ پتا بھی ہے اس کو میں آئی ہوں ذرا بھی خیال نہیں کہ میرے اٹھنے سے پہلے ہی اٹھ جاتی۔ نہ جی ہمارا خیال کیوں آئے گا اسے بس شوہر کو روانہ کیا اور کمرے کی نذر ہوگئی۔''

''بس کرو رمشہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے، آج کل طبیعت بھاری، بھاری ہے ناں اسی لیے، ظاہر ہے پہلی' پہلی دفعہ کی بات ہے۔ تمہیں خود اندازہ ہونا چاہیے ایسے میں کیا حالت ہوتی ہے انسان کی۔ اور تم بھی تو شروع کے دو تین ماہ یہاں آگئی تھیں یاد ہے ناں...... تو بچے وہ بھی انسان ہے اس کے تو ماں، باپ بھی کوسوں دور ہیں۔''

''بس امی، آپ بھولی ہی رہیے گا بہت چالاک ہوتی ہیں یہ لڑکیاں، شوہر کے سامنے تو ماں جی، ماں جی کرتی ہیں اور اس کے گھر سے نکلتے ہی کمرے میں گم ہوجاتی ہیں۔ آپ بھی زیادہ سر مت چڑھایئے اسے۔'' ان کی باتیں ابھی چل رہی تھیں اتنے میں فریحہ کمرے سے نکل آئی آکر دونوں کو سلام کیا۔ زینب بیگم نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا پر رمشہ نے منہ بنالیا۔

''آنٹی آپ نے مجھے کیوں نہیں اٹھایا۔ بارہ بج گئے ہیں ابھی میری آنکھ کھلی۔ آپ مجھے اٹھا دیتیں اور ہاں آپ نے کوئی کام وام تو نہیں کیا ناں......'' زینب بیگم مسکراتے ہوئے اس کی باتیں سنتی رہیں۔

''نہ بابا، میں کیوں کوئی کام کروں گی، ہاں بس صفائی والی سے صفائی کروائی اور ابھی دوپہر کے لیے سالن چڑھا کر آئی ہوں...... اب تم اٹھ گئی ہو ناں تو اپنا اور رمشہ کا ناشتا بنالو اور چائے بناؤ تو میرے لیے بھی بنالینا۔'' رمشہ نے ٹی وی چلا دیا اور کن انکھیوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''آنٹی کیوں کیا آپ نے یہ سب...... مجھے اٹھادیا ہوتا میں خود ہی کرلیتی، آپ نے کیوں تکلیف کی۔'' وہ مصنوعی ناراضی سی کہنے لگی۔

''رمشہ آپ ہی سمجھاؤ آنٹی ہماری تو سنتی ہی نہیں بس مسکرا کر چپ ہوجاتی ہیں۔''

''میں کیا کہوں میری تو وہ کبھی نہ سنیں، پتا نہیں کیا جادو کردیا ہے تم نے ہماری ماں پر پہلی ساس دیکھی ہیں جو بہو کی تعریفوں میں پہاڑ کھڑے کردیتی ہیں۔'' رمشہ کی بات پر سب ہنسنے لگے پر وہ خود پہلو بدل کر رہ گئی۔

''آپی لوگ تو تعریفوں کے پل باندھتے ہیں آپ نے تو پہاڑ کھڑے کردیے واہ بھئی واہ......'' ذیشان نے جو آج کالج نہیں گیا تھا ابھی، ابھی کچھ سامان لے کر گھر آیا تھا۔ رمشہ کی بات کی تصحیح کرنا ضروری سمجھا۔ سامان کچن میں رکھ کر واپس آیا تو رمشہ نے اسے گلے لگایا اور ڈھیر ساری دعائیں دے ڈالیں۔ کیونکہ بہنیں ہوتی ہی ایسی ہیں۔ بھائیوں پر نثار ہونے والیاں...... ہر غرض سے پاک بھائیوں سے محبت کرنے والیاں...... ذیشان نے بہت پیار سے بھانجے ارحم کو ماں کی گود سے لیا اور ہوا میں اچھالتے ہوئے کھیلنے لگا۔ ارحم بھی چھوٹے ماموں کو دیکھ کر کھلکھلانا شروع ہوگیا۔

''آؤ رمشہ ناشتا کرلو۔'' فریحہ نے ٹرے میز پر لا کر رکھ دی اور خود رمشہ کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ ایک کپ میں چائے ڈال کر ساس کو دی اور ایک کپ میں نکال کر ذیشان کو آواز دی۔

''بھابی رہنے دیں، میں خود لے لوں گی، آپ نے خواہ مخواہ اتنا کام کیا، ویسے بھی یہ ہمارا گھر ہے صبح سے تو امی ہی لگی ہوئی ہیں۔'' رمشہ نے اِک انداز میں کہا تو فریحہ نے عجیب سا محسوس کیا پر خاموش رہی۔ وہ ہمیشہ سوچتی کہ شادی سے لے کر آج تک ایسا کیوں ہے رمشہ کا برتاؤ اس کے ساتھ اس نے ایسا کیا کیا ہے پر اسے فی الحال اس کا جواب نہیں ملا تھا۔

اس گھر میں اتوار کے دن سب فجر پر ہی اٹھتے نماز کے بعد ساتھ مل کے چائے پیتے اور ساتھ ہی ناشتا کرتے اس دن بھی سب نماز کے بعد امی کے کمرے

میں جمع تھے اور فریحہ چائے ناشتا لے کر وہیں آ رہی تھی کہ اپنا نام سن کر دروازے پر ہی رک گئی۔ یہ انسانی فطرت ہے بندہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کام کر جاتا ہے جو نہیں کرنا چاہیے تو فریحہ بھی انسان تھی نہ چاہتے ہوئے بھی وہیں رک گئی۔ باہر تک آتی تیز آواز رمشہ کی تھی۔

''بس، بھائی یہی کسر رہ گئی تھی۔ آپ بھی مجھے غلط سمجھیں گا، آپ کتنا جانتے ہیں اسے چار، پانچ، ماہ سے ناں پھر آپ کیسے اس کی اتنی سائڈ لے سکتے ہیں آپ نہیں جانتے ایسی لڑکیاں بہت ہوشیار ہوتی ہیں سامنے کچھ اور پیچھے کچھ اور......''

''رمشہ آپ کو کیا مسئلہ ہے بھابی سے...... میں دیکھ رہا ہوں آپ جب سے آئی ہیں عجیب سے انداز میں ان سے بات کرتی ہیں چلیں آپ بتائیں کیا برائی ہے ان میں......''

''ہاں آپی اس دن میں نے بھی نوٹ کیا تھا آپ کا رویہ......وہ تو بہت اچھی ہیں بہت [illegible] اتنا تو خیال رکھتی ہیں ہمارا، میں تو کہتا ہوں ان سے بہتر ہمارے بھائی کے لیے کوئی اور بہو نہیں ہو سکتی تھی۔ آپ خواہ مخواہ ان کے پیچھے ہی پڑ گئی ہیں۔''

''ہاں، ہاں سب مجھے ہی کہنا پتا نہیں کون سے تعویذ گھول کر پلا رہی ہے سب کو......'' ذیشان نے درمیان سے ہی اس کی بات کاٹ لی۔

''ہاں یہ خوب کہی آپ نے...... واقعی میں وہ ہمیں تعویذ پلا رہی ہیں۔'' اس کی بات سن کر رمشہ کو لگا چلو ایک تو اس کے خلاف ہوا پر اگلی بات سن کر وہ اور آگ بگولہ ہوئی اور باقی لوگ مسکرا کر رہ گئے۔

''اصل میں وہ ہمیں پیار کے تعویذ پلاتی ہیں، محبت کی چاشنی میں مکس کھانا کھلاتی ہیں۔ اپنی مسکراہٹ اور توجہ کے جادو سے باندھ کر رکھتی ہیں۔'' اور باہر کھڑی فریحہ اگر رمشہ کی بات پر ہرٹ ہوئی تھی تو دیوروں کی کھٹی میٹھی باتوں سے اس کا دل خوش بھی ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ ٹرالی دھکیلتی اندر داخل ہوئی۔ سب کو سلام کیا اور خود زینب بیگم کے پہلو میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ دوسری طرف بیٹھی رمشہ کو وہ ایک آنکھ نہیں بھائی۔

''میں اچھے سے آپ کی یہ چاپلوسیاں سمجھتی ہوں۔ بھابی جی باقی سب آپ کے جھانسے میں آ گئے ہیں پر میں نہیں۔''

''فریحہ جاؤ بیٹا احمر کو بھی بلا لاؤ......'' فریحہ جی آنٹی کہہ کر اٹھنے لگی تو ذیشان اٹھا۔

''بھابی جان آپ بیٹھیے میں بلاتا ہوں بھائی کو اور ذرا جیب پر ڈاکا بھی ڈال لوں گا۔'' فریحہ مسکرا کر وہیں واپس بیٹھ گئی۔ اس نے کسی کو محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ سب باتیں سن چکی ہے پر اس نے یہ ضرور سوچا کہ ''آہستہ، آہستہ رمشہ کی غلط فہمی دور ضرور کردں گی۔ جو وہ سمجھتی ہے میں ان کی ماں اور بھائیوں کی عزت نہیں کروں گی یا پھر احمر کو لے کر الگ ہو جاؤں گی۔ ایسا میں سپنے میں بھی نہیں سوچ سکتی۔'' جب وہ یہ سب سوچ رہی تھی تب زینب بیگم نے اس کے چہرے کو پڑھ لیا تھا انہیں بہت دکھ ہوا رمشہ کی سوچ پر انہوں نے سوچ لیا تھا کہ ایک بار ضرور اسے سمجھائیں گی۔ احمر اور ذیشان کمرے میں داخل ہوئے اور پھر سب مل کر ناشتا کرنے لگے۔ رمشہ خاموش بیٹھی ناشتا کرتی رہی۔

☆☆☆

زینب بیگم اور سرفراز صاحب کی پانچ اولادیں تھیں دو بیٹیاں تین بیٹے۔ پہلے دو بیٹے احمر اور شیراز پھر دو بیٹیاں حرا اور رمشہ پھر ایک بیٹا ذیشان۔ بہت ہنستا مسکراتا آشیانہ تھا ان کا۔ سرفراز صاحب ڈاکٹر تھے بچوں کو بہت محنت سے عزت سے پالا خوب محنت سے پڑھایا لکھایا۔ بڑا بیٹا احمر ان ہی کی طرح ڈاکٹر تھا۔ دوسرا بیٹا شیراز لیکچرار تھا۔ دونوں بیٹیوں کو انٹر تک تعلیم دلوائی ایک سال تک گھر میں ماں نے گھر داری سکھائی پھر دونوں کی ایک ساتھ شادی کی۔ ایک بیٹی اپنے بھائی کے لیے بیٹے کو دی تو دوسری زینب بیگم کے بھائی کے بیٹے کو دی۔ سب بہت خوشگوار زندگی جی رہے تھے اور اس خوشگوار زندگی میں غم کا پہلا پتھر تب پڑا جب بیٹیوں کی شادی کے چھ ماہ بعد (سرفراز صاحب کو پہلا ہارٹ

digest library.com

اٹیک ہوا خود ڈاکٹر، بیٹا ڈاکٹر پر کچھ نہیں کر پائے۔ دوسروں کو اللہ کی رحمت سے صحت یاب کرنے والے خود جانبر نہ ہو سکے یوں ان کا آشیانہ بکھر کر رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ تو مسبب الاسباب ہے اس بکھرے آشیانے کو پھر سے خوشیاں دینے کے لیے سرفراز صاحب کے ایک دوست علی رضا سالوں بعد کوئٹہ سے کراچی ضروری کام سے آئے تو دوست سے ملنے کا بھی سوچا یوں وہ ان کے اسپتال چلے آئے اور یہاں آکر انہیں پتا چلا کہ وہ نہیں رہے۔ موبائل فون کا زیادہ چرچا نہ تھا سو معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ انہیں بہت دکھ ہوا کہ وہ ان سے نہیں مل پائے۔ احمر انہیں لے کر گھر آیا، ان کی بہت اچھی خاطر داری کی۔ جب وہ جا رہے تھے تو کچھ دنوں کے لیے ذیشان کو ساتھ لے جانے کی خواہش کی جو بہت غم میں تھا۔ تاکہ اسے کچھ الگ سا ماحول ملے اور اس صدمے سے نکلنے میں تھوڑی مدد ہو جائے گی۔

زینب بیگم تو خود عدت میں تھیں سو احمر نے ذیشان کو اجازت دے دی پھر علی رضا صاحب اسے لے کر کوئٹہ چلے گئے۔ جب ذیشان چند ماہ کے بعد وہاں سے واپس آنے لگا تو علی رضا صاحب نے احمر کو کال کر کے کہا کہ وہ اپنی والدہ صاحبہ کو لے کر کوئٹہ آئے کیونکہ اب ان کی عدت ختم ہو چکی تھی۔ اور پھر کچھ دن رہ کر سب چلے جائیں۔ احمر کو لگا شاید یہ ٹھیک ہوگا۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً یہ ان سب کے لیے ٹھیک تھا...... بے شک اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ احمر ماں کو لے کر کوئٹہ گیا تین چار دن وہاں رہے بھی رضا صاحب کی بیوی، بچوں کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔ وہیں پر ان چار دنوں میں ہی فریحہ علی رضا کو زینب بیگم نے اپنے بیٹے احمر کے لیے پسند کر لیا، بیٹے سے بات کی تو اس نے سب ماں پر چھوڑ دیا وہ ایسا ہی تھا۔ ماں، باپ کا فرمانبردار...... احمر نے فرمانبرداری کا ثبوت دیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اسے انعام کے طور پر فریحہ جیسی خوب صورت، پڑھی لکھی سلجھی ہوئی لڑکی کو اس کا جیون ساتھی بنا دیا، بس پھر کیا تھا جب اوپر والے نے جوڑی بنا دی تھی تو ہر کام خوش اسلوبی سے ہوتا چلا گیا۔

شادی بہت اچھے سے انجام پائی سب کو فریحہ پسند آئی، احمر کو اپنی زندگی پُر بہار لگنے لگی تو شیراز اور ذیشان کو بھابی کے روپ میں بہن اور دوست مل گئی۔

زینب بیگم جو بیٹیوں کے بعد تنہا سی ہو گئی تھیں انہوں نے فریحہ کو بہو کے روپ میں بیٹی پایا۔ حرا اور رمشہ کو بھی ایک اچھی اور ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرنے والی دوست مل گئی پر رمشہ کو کبھی، کبھی اس پر غصہ آ جاتا جب اس کی ماں، بہو کا خیال رکھتیں، اس کے کھانے پینے کا دھیان کرتیں تو رمشہ کو لگتا کہ فریحہ ناٹک کرتی ہے بھائی کے گھر میں ہونے تک باہر رہتی ہے جب وہ نہیں ہوتے تو کمرے میں گھسی رہتی ہے۔ معلوم نہیں کیوں ہمارے معاشرے میں نند، بھاوج کا رشتہ ایسا ہوتا ہے اعتراض کی بات ہو نہ ہو پر اعتراض کیا جاتا ہے کیونکہ جس گھر میں وہ پل بڑھ کر جوان ہوتی ہیں ان کے بعد اور کوئی اس گھر میں راج کرے تو یہ بات ان سے برداشت نہیں ہوتی جبکہ وہ خود بھی کسی کی بھابی اور کسی کے گھر کی رانی ہوتی ہیں۔ کیا، کیا جائے ہم انسان ہیں۔ جلد باز اور غلطی کے پتلے جب تک غلطی نہ کریں سیکھتے ہی نہیں اور اس طرح نہ سیکھ کر اپنی اور اپنے پیاروں کی زندگیاں اجیرن کر دیتے ہیں۔

☆☆☆

"امی آپ کو کیوں نہیں دکھتا بھابی آپ کو نوکرانی بنانے پر تلی ہیں خود دیکھیں سارے کام آپ کرتی ہیں اور وہ محترمہ تو سو رہی ہوتی ہے۔ پلیز اپنی آنکھیں کھولیں ورنہ اس محبت و پیار کے چکر میں گھر ہی سے نہ نکالی جائیں۔"

"بس کرو رمشہ خواہ مخواہ بات کو مت بڑھاؤ یہ ہم سب کا گھر ہے۔ وہ بہو ہے اس گھر کی بھابی ہے۔ وہ تمہاری یہ سب باتیں سنے گی تو کتنا برا لگے گا اسے۔ ایک بھابی کے آنے سے تمہارا یہ حال ہے باقیوں کے ساتھ جانے کیا رویہ رکھو گی۔ دیکھو بچے......" زینب بیگم نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے ساتھ بیڈ پر بٹھایا۔

''وہ نئی ہے اس گھر میں اس کا سب کچھ پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ ہم سب نئے ہیں اس کے لیے اور پھر وہ امید سے ہے۔ ہمیں اپنے دل بڑے کرنے ہوں گے، آگے بڑھ کر اسے اپنانا ہوگا اتنا برا برتاؤ مت کرو اس کے ساتھ کہ آگے چل کر تمہیں ہی مشکل ہو۔ فریحہ بہت اچھی ہے، میں اس کا خیال کرتی ہوں ناں تو وہ اس سے دُگنا میرا خیال کرتی ہے۔ تم خود ایک بہو ہو، سوچو گھر میں کتنا کام ہوتا ہے۔ یہ دوپہر کا سالن بنانا یا صفائی والی سے صفائی کروانا یا کبھی شام کی چائے بنا دینا کوئی کام نہیں ہے، اس نے بن کہے خود بہت سارے کام سنبھالے ہیں وہ بہت اچھی ہے سب کو ساتھ لے کر چلنے والی اس کے ساتھ بیٹھو، مل کر کام کرو وہ پہلے سے زیادہ عزت کرے گی تمہاری...... دیکھو رمشہ ایک لڑکی شادی کے بعد سسرال والوں سے محبت اور عزت چاہتی ہے کوئی جواہرات نہیں، بس میں فریحہ کو وہی دے رہی ہوں اور پھر یہ حق ہے اس کا۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ کیونکہ وہ سمجھ گئی تھیں کہ وہ تو دیواروں سے باتیں کر رہی تھیں کیونکہ رمشہ پر ذرہ بھر بھی اثر نہیں ہو رہا تھا پھر انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ رمشہ سسرال واپس چلی گئی تھی پر بھاوج سے منہ بنا ہی ہوا تھا حالانکہ چلتے وقت فریحہ نے اسے خود تحفے تحائف بھی دیے تھے۔

☆☆☆

فریحہ نے ایک پیارے سے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اشعر نام رکھا گیا اس کا وہ سارا دن دادی کی گود میں ہوتا۔ فریحہ نے بہت اچھے طریقے سے گھر اور رشتوں کو سنبھالا ہوا تھا۔ اشعر اب چاچوؤں کے کندھوں پر چڑھا رہتا۔ وقت تھوڑا اور آگے سرکا تو شیراز کی بھی شادی کرا دی گئی۔ فریحہ اور نمرہ میں پکی دوستی ہوگئی۔ حرا اپنے میکے کی خوشیاں دیکھ کر دعائیں کرتی رہتی کہ ان کا میکا ہمیشہ یوں ہی ہنستا مسکراتا آباد رہے۔ رمشہ بھی خوش ہوتی پر کبھی، کبھی آپے سے باہر ہو جاتی سب نے اسے کہنا چھوڑ دیا تھا اور پھر وقت تھوڑی کسی کے لیے رکا ہے،

گھڑی کا کام ہے چلنا وقت اپنی رفتار سے آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے کسی کے لیے رکتا نہیں...... ہاں کبھی، کبھی لگتا ہے کہ وقت تھم سا گیا ہے پر وہ ہماری سوچ ہوتی ہے۔ ہمارا واہمہ ہوتا ہے، کبھی خوشیاں تو کبھی غم آتے جاتے ہیں۔ اب کی بار زینب بیگم کی موت نے اس ہنستے مسکراتے آشیانے کو بکھیر دیا تھا۔ رات سوتے میں کسی وقت وہ موت کی آغوش میں چلی گئیں۔ سب الٹ پلٹ ہوگیا کسی کو کچھ سمجھ نہیں آئی بیٹیاں تو بیٹیاں بیٹوں کی بھی سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ فریحہ اور نمرہ کے حواس بھی جیسے کسی نے صلب کر لیے۔ جب میت کو قبرستان لے جانے آئے تو فریحہ اور رمشہ نے درد بھری پکار سے ایک ساتھ ماں جی پکارا۔ نمرہ دوڑی رمشہ کو سنبھالنے تو حرا بھاگی فریحہ بھابی کو تھامنے، وہ جانتی تھی فریحہ اور ماں کا ایک دوسرے کے لیے لگاؤ، ہر آنکھ اشکبار تھی۔ لوگوں کی زبانوں پر گویا کسی نے حیرت کے تالے لگا دیے ہوں ہر کوئی حیران تھا کہ یہ کیسا رشتہ ہے، یہ کیسا بندھن تھا جو ایک بہو اپنی ساس کے لیے ایک بیٹی سے بڑھ کر دکھی ہے۔ ہاں ہوتے ہیں کچھ لوگ.... بے حساب پیار بانٹنے والے......

پھر وقت کی ٹرین تھوڑی اور آگے بڑھی، فریحہ کی گود میں جڑواں بیٹا اور بیٹی آئے تو نمرہ کی گود میں دو بیٹے اوپر تلے...... فریحہ نے بیٹی کا نام زینب رکھا۔ خود کو تو کبھی سنبھال نہیں پائی پر باقی سب کو سنبھال لیا، دیوروں کے لیے ماں کی شفقت سے پُر توجہ دیتی بن گئی نندوں کے لیے میکے کے در اور کھول دیے اور مزید پیار، عزت، چاہت دینے لگی تاکہ انہیں ایسا نہ لگے کہ ماں نہیں رہی تو میکا ہی ختم...... فریحہ نے رمشہ کو باقیوں سے زیادہ توجہ اور چاہت سے نوازا بس خود کو ہی بھول گئی اکیلے میں روتی رہتی تڑپتی رہتی کہ ماں جی کیوں چھوڑ کر چلی گئیں۔

وقت ہی تو سب سے بڑا استاد ہے، والدین اور استاد وہ چیز نہیں سمجھا سکتے جو وقت بہت اچھے سے سمجھا سکتا ہے بلکہ سمجھا دیتا ہے، دکھ سکھ کبھی ایک سے نہیں

رہتے۔ زینب بیگم کی وفات کے تین سال بعد ذیشان کی شادی کا خیال آیا احمر کو اور فریحہ سے اس نے ذکر کیا۔فریحہ نے ذیشان سے بات کی اس نے سب کی ٹینشن یوں ختم کی کہ اپنے چھوٹے ماموں کی بیٹی کا نام لے لیا جو کہ رمشہ کی اکلوتی نند بھی تھی اس سے رمشہ بھی بہت خوش ہوئی کیونکہ وہ ہمیشہ سے چاہتی تھی کوئی ایک بھائی امبر سے شادی کرے یوں اس کی بھی خواہش پوری ہوئی۔شادی دھوم دھام سے کی گئی۔سب نے مل جل کر خوب انجوائے کیا۔امبر دلہن بن کر ذیشان کے گھر آ گئی۔اگلے دن صبح کو ناشتا تیار دیکھ کر رمشہ نے اصرار کیا۔

”آپی آپ جا کر ذیشان اور امبر کو اٹھا دیں۔“ تو حرا نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں رمشہ تم خود ہی جاؤ مجھ سے یہ اوپر چڑھنا اور اترنا نہیں ہوتا۔“ اس کی بات پر رمشہ اور نمرہ ہنس دیں۔رمشہ آگے بڑھی سیڑھیاں چڑھ کر جیسے ہی دائیں کو مڑی تو بائیں سے احمر بھائی کے کمرے سے رونے کی آواز سن کر اس طرف پلٹ آئی ابھی اندر جانا ہی چاہتی تھی کہ ماں کا نام سن کر ٹھہر سی گئی۔

”امی میں کیا کروں، آپ یوں بیچ منجدھار میں مجھے ذمے داریوں کے بوجھ تلے چھوڑ کے کیوں چلی گئیں، آپ کو تو پتا تھا ناں کہ میں آپ کے بغیر کچھ نہیں..... کتنی اچھی دوست تھیں آپ میری...... ہر وقت میرا خیال رکھتی تھیں، دیکھیں ناں آپ کی اور رمشہ کی من پسند لڑکی سے ذیشان کی شادی ہو گئی آپ جانتی تھیں ناں کہ ذیشان، امبر کو چاہتا ہے اس لیے احمر اور شیراز کے لیے اسے نہیں چنا...... مجھے تو آج خوش ہونا چاہیے کہ میں نے آپ کا کہا پورا کیا۔آج میں ذمے داریوں سے آزاد ہو گئی پر میں خوش نہیں ہوں، وہ بھی آپ جانتی ہیں، ہاں امی ... میں آپ کی چھوٹی اولاد لاڈلی بیٹی کو خوش نہیں کر پا رہی شاید میں اسے وہ پیار نہیں دے پا رہی جس کی وہ حق دار تھی اور ہے آپ ہی بتائیں میں کیا کروں، ایسا کیا کروں جو وہ مجھ سے خوش رہے۔“ فریحہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی باہر کھڑی رمشہ سے وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔اس نے ذرا سا جھانک کر دیکھا تو بھاوج کو ماں کی تصویر کے آگے کھڑا روتا پایا۔بعض دفعہ کچھ باتیں ہمارے سامنے ہوتے ہوئے بھی سمجھ نہیں آتیں یا پھر ہم دیکھنا نہیں چاہتے۔ رمشہ کو امی کی باتیں یاد آئیں کہ وہ کیوں جان چھڑکتی تھیں فریحہ بھابی پر آنکھوں دیکھی بات میں سمجھ نہیں پائی کبھی ماں کی پسند کو اپنا نہیں سکی۔

”مجھ سے اچھی تو بھابی ہیں کہ جو کہیں اور سے آئیں پر امی کو ہمیشہ سمجھا ان کی بات کا مان رکھ کر امبر کو ذیشان کی دلہن بنایا۔میں بہن ہو کر بھی بھائی کی چاہت سمجھ نہیں پائی۔ بیٹی ہو کر وہ نہیں کر سکی جو امی مجھے دکھانا چاہتی تھیں۔“ رمشہ کے آنسو بے اختیار نکل پڑے غلط فہمی کے بادل چھٹ گئے تھے سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔آنسو پونچھ کر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور بے اختیار فریحہ بھابی سے لپٹ گئی۔فریحہ نے اسے گلے سے لگا لیا اور مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھو لیا۔

ذیشان اور امبر بھی باہر کھڑے مسکرانے لگے کیونکہ انہوں نے ہی تو اپنی ماں جیسی بھابی کو میسج کر کے بتایا تھا کہ رمشہ باجی نے ان کی ساری باتیں سنیں اور وہ اندر اب آئی کہ تب آئی۔ایک بار پھر سے خوشیاں ان کے آنگن میں آنے کو ہمک رہی تھیں وقت نے اپنی استادی دکھائی دی تھی۔رشتوں نے بھی ثابت کر دیا تھا کہ بھابی بھی ایک اہم رشتہ ہے۔ بھابی بھی میکے کی شان ہوتی ہے۔ماں، باپ کے بعد بھائی اور بھابی سے ہی میکا آباد رہتا ہے یہ بات وقت نے رمشہ کو تو سمجھا ہی دی لگے ہاتھوں امبر کو بھی سمجھ آ گئی۔اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھی اپنی بھابیوں کی عزت کرے گی اور وہ مان ضرور دے گی جو ایک بہو اور بھابی کا حق ہوتا ہے اور خود بھی ایک بہترین بھابی بننے کی کوشش کرے گی۔وقت نے مسکرا کر انگڑائی لی اور آگے چل پڑا کسی اور کو سبق دینے کسی اور کو سمجھانے میں وقت سب سے بڑا استاد ہے چلتے چلتے بڑوں، بڑوں کو سیدھا کر دیتا ہے۔

Digest Library Copy

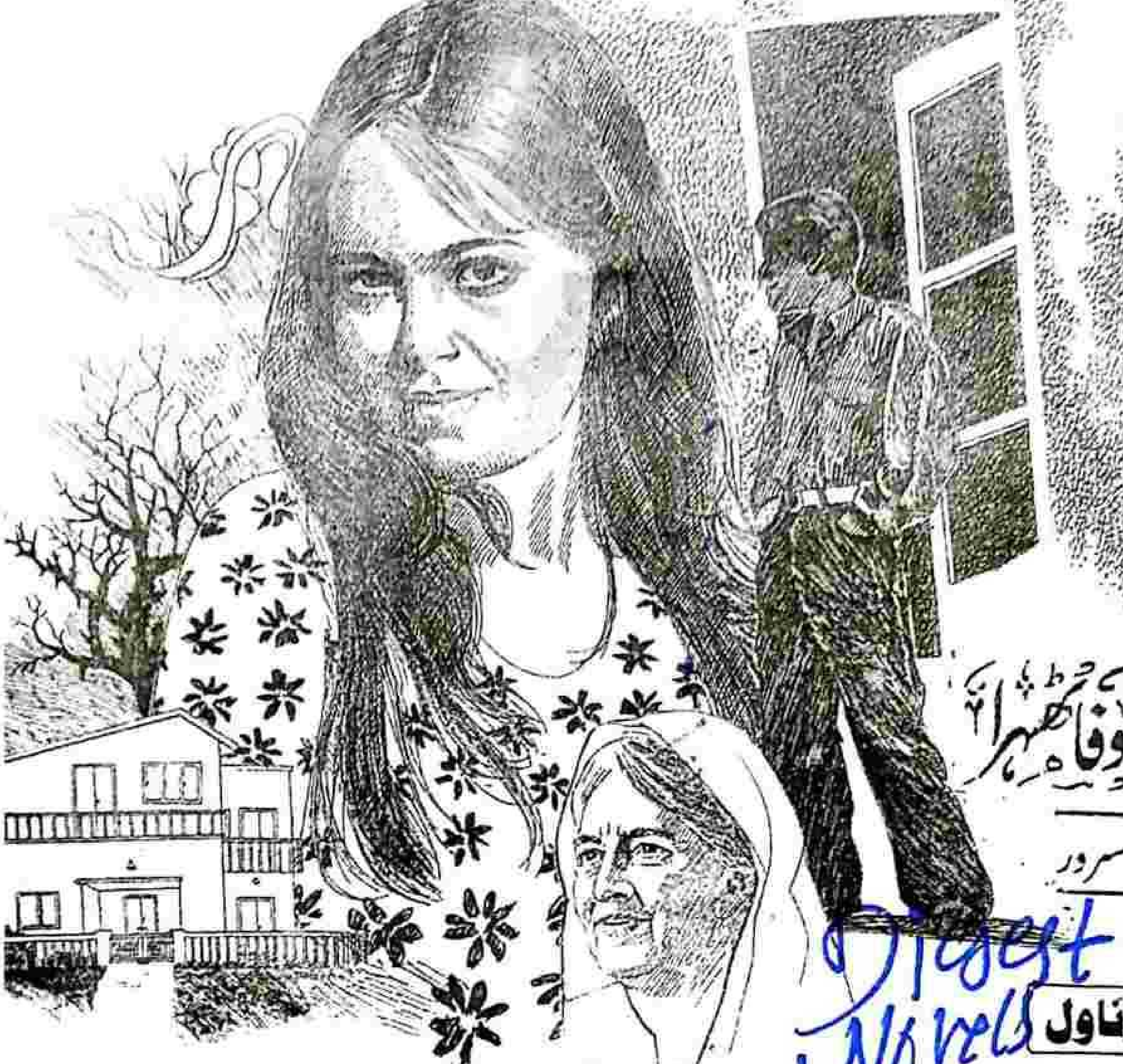

حوصلہ شرطِ وفا ٹھہرا

بشریٰ مسرور

Digest Novels Lovers group

سلسلے وار ناول

آزمائش محبت کی اور حوصلہ وفاداری کے لیے بنیادی شرط ہے، پیار کی کٹھن راہوں اور الفت کے خاردار راستوں پر چلتے ہوئے وفا کی منزلوں کو سر کرنا، اور محبت کی معراج تک پہنچنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ انسان کو قدم قدم پر اپنا حوصلہ آزمانا پڑتا ہے، آزمائش کے تپتے ہوئے ریگ زاروں سے گزرنے کے دوران اگر حوصلہ ہی ساتھ چھوڑ جائے تو لوگ مر بھی جاتے ہیں لیکن کچھ خوش قسمت ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ اگر مر بھی جائیں تو ان سے وابستہ تعلق اور رشتے ان کے بعد بھی سلامت رہتے ہیں اور کچھ حرماں نصیب ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو اپنی زندگی میں ہی رشتوں کو مرتا، بدلتا اور پرایا ہوتے دیکھتے ہیں اور مضبوط تعلق جب کچے دھاگے میں پروئی ہوئی مالا کی طرح ٹوٹتا ہے تو لوگ بظاہر مرتے تو نہیں، مگر زندہ بھی نہیں رہتے، بس اپنے ان کہے دکھوں کا بوجھ اپنے شانوں پر اٹھائے، کسی بے جان لاشے یا کسی بے چین روح کی طرح ہمارے اردگرد بھٹکتے پھرتے ہیں بظاہر تو وہ عام لوگوں کی طرح ہنستے ہیں مسکراتے ہیں، خوش دکھائی دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ہم ان کی زندگی کی چمک سے محروم آنکھوں کے باوجود اور ان کے مصنوعی بلند قہقہوں کے باعث ان جیتی جاگتی، چلتی پھرتی زندہ لاشوں نما لوگوں کو پہچان نہیں پاتے، اور اگر پہچان بھی لیں تو ان کے بے روح وجود میں دوبارہ زندگی کی رعنائیاں بھرنے سے قاصر رہتے ہیں، اور جو ایسا کر جائیں تو وہی دراصل محبتوں کو امر کرنے اور امر ہونے کا ہنر جانتے ہیں۔

ایک خط جو تو نے کبھی لکھا ہی نہیں
میں روز بیٹھ کے اس کا جواب لکھتا ہوں

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بدرالدین ایک کامیاب بزنس مین اور شہر کی معزز شخصیت ہیں، ان کی دو بہنیں عارفہ اور عاتکہ ہیں۔ بدرالدین کی بیگم آسیہ بی بے حد خوب صورت ہیں مگر سیرت کے لحاظ سے اتنی ہی بدصورت اسی وجہ سے انہیں طلاق ہو جاتی ہے۔ بدرالدین کی تین بیٹیاں زونائشہ، ازنا اور مرحا ہیں، زونائشہ سب سے بڑی جبکہ ازنا اور مرحا جڑواں ہیں۔ طلاق کے بعد زونائشہ اور ازنا تو باپ کے پاس رہ گئیں مگر مرحا ماں کے ساتھ ماموں کے گھر چلی گئی۔ مرحا کی ممانی حسنہ شاہانہ بے حد شاطر و مکار ہیں۔ عارفہ پھپو کا بیٹا عارف، مرحا کو پسند کرتا ہے۔ عارفہ خاتون، زونائشہ کو اپنی بہو کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ عرشمان، ممانی حسنہ کا بھانجا اور ازنا اور مرحا کا پڑوسی اور کلاس فیلو تھا۔ بدرالدین کی دوسری شادی حاجرہ سے ہوتی ہے۔ جو ذہین، پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی شخصیت کی مالک ہے۔ ماموں، آسیہ بی کو سمجھاتے ہیں کہ وہ پچھتانے کے بجائے حالات سے سمجھوتا کریں۔ عارف اپنی ماں سے مرحا کے لیے بات کرتا ہے تو وہ اسے بتاتی ہیں کہ انہوں نے زونائشہ سے اس کی منگنی طے کر دی ہے۔ عرشمان کا دوست طلال بیرون ملک سے پاکستان آ کر اپنا فوڈ چین کا بزنس سیٹ کرتا ہے اور وہ عرشمان کو منیجر کی پوسٹ پر رکھ لیتا ہے۔ آسیہ بی، بدرالدین کی ملازمہ ممتاز کی مدد سے گھر میں داخل ہو کر کمرے میں تعویذ رکھتی ہیں۔ مرحا، زونائشہ کی ڈائری سے اس کا حالِ دل جان جاتی ہے۔ مرحا، باپ کے بزنس میں انوالو ہونا چاہتی ہے تاکہ وہ غیر محسوس طریقے سے امجد ماموں پر نظر رکھے۔ حاجرہ اور بدرالدین ایک کافی شاپ میں جاتے ہیں وہاں وہ ازنا کو ایک لڑکے کے ساتھ دیکھتی ہے۔ بدرالدین کی توجہ اس طرف نہیں جاتی۔ وہ حاجرہ اور بدرالدین کو دیکھ کر گھبراہٹ میں باہر نکلتی ہے اور اندر داخل ہوتے عتیق سے ٹکرا جاتی ہے۔ عرشمان اپنی والدہ سے ازنا کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے تو وہ کہتی ہیں کہ انہوں نے ایک لڑکی اس کے لیے پسند کر لی ہے اور وہیں طلال کی دلہن بھی ہے۔ اسی رات عاتکہ، بدرالدین کے گھر آتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ عتیق نے ازنا کو کسی لڑکے کے ساتھ دیکھا ہے۔ حاجرہ یہ کہہ کر اسے بچا لیتی ہے کہ ازنا کے والدین اس کا اچھا برا سمجھتے ہیں۔ بدرالدینؒ مرحا سے عارف کے بارے میں اس کی رائے لیتے ہیں تو مرحا اپنی دلچسپی ظاہر نہیں کرتی۔ عتیق، ماں کو ڈائریکٹ بدرالدین سے بات کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ عرشمان کی والدہ مرحا کے لیے رشتہ لاتی ہیں۔ مرحا سوچنے کے لیے وقت مانگتی ہے۔ آسیہ کہتی ہیں کہ... بدرالدین کی زندگی میں واپس جانے کے لیے وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتی ہیں۔ ازنا اور زونائشہ، حاجرہ کا شکریہ ادا کرتی ہیں۔ بدرالدین پر فیکٹری جا کر امجد میاں کی بدنیتی کا حال واضح ہو جاتا ہے۔ ازنا، عرشمان سے کہتی ہے کہ وہ اپنی والدہ کو رشتے کے لیے بھیجے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ امی اس کا رشتہ کہیں اور کرنا چاہتی ہیں اس لیے اسے تھوڑا وقت لگے گا۔ آسیہ اپنے والدین کا گھر اپنے بھائی امجد کے نام کر دیتی ہیں تو وہ تھوڑا پُرسکون ہو جاتے ہیں۔ عاتکہ بیگم، بدرالدین سے کہتی ہیں کہ ازنا کے نکاح کے لیے اصرار کرتی ہیں۔ ممتاز، آسیہ کو بتاتی ہے کہ حاجرہ پریگننٹ ہے۔ آسیہ، شاہانہ کے ساتھ عاملہ کے پاس جاتی ہیں تاکہ حاجرہ کی گود اجڑ جائے۔ عید کے چاند پر طلال سے عافیہ کا نکاح اور رخصتی کی تاریخ طے پائی۔ زونی، عارف کو کال کر کے اس سے اپنے بارے میں رائے لینا چاہتی ہے تو عارف کہتا ہے کہ وہ کسی سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ زونی کو خوش رکھے گا۔ بدرالدین وکیل سے کاغذات تیار کروا لیتے ہیں جن کی رو سے آسیہ اور مرحا بدرالدین کے دستخط کے بغیر کوئی جائداد نہ بیچ سکتی ہیں اور نہ کسی کو ہبہ کر سکتی ہیں۔ بدرالدین بیٹی کی تعلیم کے بہانے عتیق کے رشتے سے معذرت چاہتے ہیں۔ حاجرہ کو سیڑھیوں سے کوئی دھکا دے دیتا ہے۔ بے ہوش ہونے سے قبل اس نے دھکا دینے والے کو دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا۔ ممتاز، آسیہ کو اپنی کارگزاری بتاتی ہے۔ شاکر بھائی، رانی کے لیے معقول رشتہ لاتے ہیں اور عافیہ کی شادی کے ساتھ رانی کی شادی کی بھی باتیں ہونے لگیں۔ آسیہ، بدرالدین کو فون کر کے ان سے حاجرہ کی خیریت معلوم کرتی ہیں۔ بدرالدین ان کی اس تبدیلی پر حیران تھے۔ امجد، بیوی کو بتاتے ہیں کہ آسیہ کو پھیپھڑوں کا کینسر آخری اسٹیج پر ہے اس لیے ان کو جائداد ہتھیانے کے لیے جلد ہی کوئی راستہ نکالنا ہوگا۔ عرشمان اپنی امی سے کہتا ہے کہ ان کو مرحا کا رشتہ لے جانے سے پہلے کم از کم اس کو بتانا چاہیے تھا کیونکہ وہ اس کی چھوٹی بہن سے پیار کرتا ہے۔ تینوں بچیاں ماں کی طبیعت کی وجہ سے بہت افسردہ تھیں تو بدرالدینؒ آسیہ کو اپنے گھر شفٹ کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ عارفہ، زونی اور عارف کے نکاح کی بات کرتی ہیں تو بدرالدین راضی ہو جاتے ہیں۔ زونی، بدرالدین سے کہتی ہے کہ وہ دوبارہ آسیہ سے نکاح کر لیں اور حلالہ کے لیے وہ اپنی دوست کے والد سے نکاح کا کہتی ہے...۔ بدرالدین اسے کوئی جواب نہیں دیتے۔ حاجرہ واپس گھر آتی ہے تو ممتاز سے سامنا ہوتا ہے تو وہ ڈر جاتی ہے لیکن حاجرہ اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتی ہے۔ حاجرہ، آسیہ کی آمد سے انجانے خدشات میں مبتلا ہو جاتی ہے تو بدرالدین اسے تسلی دیتے ہیں کہ زونائشہ کی شادی خیر سے ہو جائے۔ امجد جعلی کاغذات بنوا کر آسیہ کے جعلی دستخط کرا لیتے ہیں۔ زونی کے مایوں کا دن نزدیک آ رہا تھا، بدرالدین نے حاجرہ

کے ساتھ، ساتھ آسیہ کے لیے بھی شادی کی ہر تقریب کے لیے جوڑے بنائے تھے۔ حاجرہ کے لیے بدرالدین کی اتنی دلچسپی تکلیف دہ تھی۔ زونی، آسیہ کو انیکسی کے بجائے اپنے کمرے میں ٹھہرانے کی بات کرتی ہے تو بدرالدین سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ زونی مایوں کے جوڑے میں بہت پیاری لگ رہی تھی تبھی کسی نے مرحا کے آنے کی خبر دی۔ زونی اور ازنا بے تابی سے اپنی مما کے استقبال کے لیے بڑھیں۔ زونی، مرحا کے موبائل میں عارف کے میسج پڑھ لیتی ہے اور مرحا سے کہتی ہے کہ اگر اسے کچھ ہو جائے تو مرحا، عارف سے شادی کر لے۔ آسیہ ہنوز کومے میں تھیں۔ زونی، بدرالدین سے کہتی ہے کہ وہ عارف سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ حاجرہ، عارف سے ازنا کی شادی کا کہتی ہے تو عارفہ منع کر دیتی ہیں تو وہ اپنی بہن عافیہ کا نام لیتی ہے لیکن ازنا، مرحا پر دباؤ ڈالتی ہے کہ وہ اب عارف سے شادی کرے کیونکہ زونی نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ سب مرحا کے آنے کا انتظار کر رہے تھے لیکن مرحا ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ مرحا، ڈرائیور سے گاڑی تیز چلانے کا کہتی ہے اور ایک دین ان کو اوورٹیک کرتی ہے تو ان کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ عرشان اور طلال میٹنگ سے واپس جا رہے ہوتے ہیں تو ان کو اسٹریچر پر مرحا دکھائی دیتی ہے۔ وہ ایمبولینس کے ڈرائیور سے اسپتال کا پوچھ کر اسپتال پہنچتے ہیں۔ عارف اپنی ماں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ اس پر غصہ کرتی ہیں۔ گھر والے سوچتے ہیں کہ کہیں مرحا کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو، مرحا کے سر پر چوٹ لگی تھی جس کی وجہ سے وہ جانبر نہ ہو سکی۔ مرحا کی اچانک موت سے سب ہی حیرت زدہ رہ گئے۔ کل جس گھر میں شادی ہونا تھی آج اس گھر میں میت میں آنے والوں کے لیے انتظامات ہو رہے تھے۔ عتیق شارٹ کٹ سے دولت کمانے کے چکر میں غلط لوگوں کا ساتھی بن گیا اور نشہ آور اشیا یونیورسٹیوں میں سپلائی کرنے لگا۔ اب اس کا پلان اپنے بندے کو بدرالدین کے گھر ڈرائیور بنا کر رکھنے کا تھا تاکہ اسے معلوم ہو کہ ان بہنوں کی سرگرمیاں کیا ہیں۔ شاکر بھائی، حاجرہ سے کہتے ہیں کہ مرحا کی اچانک موت نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ مولوی صاحب کی باتوں میں سچائی تھی۔ طلال، عافیہ کا یہ میسج ملنے پر کہ اس کا نکاح اس کے گھر والے عارف سے کر رہے ہیں، منگنی توڑنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ عرشان کے سمجھانے پر وہ اس کی بات نہیں سنتا۔ امجد، آسیہ کی تیمارداری کے دوران وہاں ایک نرس شگفتہ سے شادی کا وعدہ کر لیتے ہیں۔ بدرالدین کے اشتہار دینے پر عتیق اپنے کارندے بندوق خان کو بدرالدین کے پاس بھیجتا ہے۔

اب آگے پڑھیے..

قسط نمبر 25

''بیگم! ایک تو مجھے آپ کے لاڈلے سپوت کی سمجھ نہیں آتی، پتا نہیں ایسے کون سے مشاغل میں الجھا ہوا ہے کہ اسے کسی کی پروا ہے نہ کسی بات کا ہوش۔ مرحا کے جنازے تک تو وہ نظر آیا۔ قبرستان بھی ہمارے ساتھ گیا تھا مگر وہاں پتا نہیں اسے کس کی کال آگئی کہ کال سنتے ہی وہ فوراً وہاں سے نکل گیا اور پھر ایسا غائب ہوا کہ پورے دو دن بعد کل رات گئے گھر واپس آیا ہے اور گھر میں کسی کو اپنی آمد کا بتایا تک نہیں...... آتے ہی کمرے میں جا کر سو گیا اور ابھی تک گھوڑے بیچ کر سویا پڑا ہے۔ مرحا کے سوئم میں بھی مجھ سے سب پوچھتے رہے اس کا اور میں بہانے بناتا رہا۔ عارف ہر پل سب کے ساتھ موجود تھا مگر ہمارے شہزادے نے میت والے گھر میں دوبارہ قدم نہیں رکھا۔ اتنی شرمندگی ہو رہی ہے مجھے کہ کیا بتاؤں۔ جانے بدرالدین بھی کیا سوچتے ہوں گے۔'' فیصل میاں، عتیق کی حرکتوں سے خاصے نالاں تھے اور اب تو دو روز سے بتائے بغیر غائب رہنے کی وجہ سے اس پر خاصے برہم بھی تھے۔

''کیا بدرالدین نے بھی آپ سے عتیق کے بارے میں سوال کیا تھا کہ وہ کیوں نہیں آیا یا پھر عتیق سے متعلق کچھ کریدا ہو؟'' عاتکہ نے کسی امید کے تحت چمکتی آنکھوں کے ساتھ شوہر سے پوچھا تو انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''نہیں پوچھا...... وہ بیچارے تو غم سے نڈھال تھے، جوان بیٹی کی موت کا دکھ انہیں حزن و ملال کی تصویر بنا گیا۔ بھلا انہیں اپنے رنج میں کیا ہوش کہ کون آیا اور کون گیا مگر مجھے تو احساس ہو رہا تھا کہ اس دکھ کی گھڑی میں اسے بھی عارف کی طرح اپنے ماموں کے گھرانے کے ساتھ موجود ہونا چاہیے تھا تاکہ ان کی دلجوئی کر سکے مگر نہیں...... یہ صاحبزادے تو اس موقع پر ایسے اڑن چھو ہوئے کہ سوئم بھی گزر گیا مگر یہ واپس نہیں پلٹے۔''

فیصل اپنے بیٹے عتیق پر بری طرح تپے ہوئے تھے، بس چلتا تو سوتے سے جگا کر دو،چار جھانپڑ رسید کرتے مگر عاتکہ بیگم کی وجہ سے خود پر جبر کررہے تھے کیونکہ وہ بیٹے کی مضبوط دفاعی لائن تھیں اور انہیں کراس کرنے کا مقصد خود اپنے آپ پر گولہ بارود گرانے والی بات تھی۔ وہ اگر غصے میں آجاتیں تو فیصل میاں کے خاندان بھر کے گڑے مردوں کے تن سے کفن نوچ لاتیں۔

''کیا خبر کوئی ضروری کال آئی ہو آفس سے اسی لیے عتیق کو جانا پڑا ہو ورنہ تو میرا بچہ اتنا بھی غیر ذمے دار نہیں جو میت والے گھر سے یوں غیروں کی طرح چلا جائے اور دوبارہ خبر تک نہ لے۔'' عاتکہ نے اپنے لاڈلے بیٹے کی حمایت کرتے ہوئے کہا تو فیصل طنز سے ہنس دیے۔

''اچھا تو ہماری بھولی بیگو! آپ کے خیال میں وہ گزشتہ اڑتالیس گھنٹوں سے آفس میں بیٹھ کر وہاں کے کام نمٹا رہا تھا اور گھر سے کسی کا فون نہیں اٹھا رہا تھا نہ گھر والوں کی کوئی موبائل کال ریسیو کر رہا تھا، تو یہ بھی کوئی آفس کی جانب سے پابندی عائد کی گئی تھی؟ ایسی کون سی خفیہ ایجنسی میں جاب مل گئی اسے کہ جو کام کے دوران اپنی خیریت کی اطلاع دینا یا گھر والوں سے بھی رابطہ کرنا محال ہو گیا تھا اس کا؟'' فیصل نے غصے سے کہا تو عاتکہ ایک بار پھر بیٹے کے دفاع میں سامنے آگئیں۔

''اجی تمہیں کوئی بات مل جائے تو پھر اس کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہو، اور ہر وقت تم یہ عتیق کا مقابلہ عارف سے مت کیا کرو، وہ تو ایک نمبر کا ڈھیٹ اور بے حس لڑکا ہے۔ ماموں کی ساری بیٹیوں نے بھگو کر جوتے مارے ہیں اسے اور [illegible] مگر اسے احساس نہیں، بڑا اسہرا سجا کے گئی تھیں ہماری بہن اپنے بیٹے کے سر پر۔ بدرالدین کی لاڈلی بیٹیوں نے سر سے دستار ہی اتار کے اچھال دی پھر بھی عارف انہی کی خوشامدوں میں لگا ہے، جس ماموں کے گھر سے ذلت ملی اسی کی جوتیاں سیدھی کرتا رہے تو کرتا پھرے، ہمیں کیا غرض۔ ہوگا کوئی نیا مطلب اسی لیے خوشامدیں ہو رہی ہیں شاید۔'' عاتکہ تنک کر بولیں۔

''ارے اپنوں اور غیروں میں یہی تو فرق ہوتا ہے۔ کتنی بھی مخالفت ہو، کیسا بھی اختلاف ہو مگر دکھ کے وقت سب ایک دوسرے کے قریب آجاتے ہیں تو دل بھی صاف ہو جاتے ہیں۔'' فیصل نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''اب دیکھو ناں عتیق اس وقت وہاں موجود رہتا تو بدرالدین کی نظروں میں آجاتا، ممکن ہے وہ اور ان کی بیٹی ازنا کے دل میں اس کے لیے جگہ بن جاتی اور وہ دوبارہ نئے سرے سے عتیق کے رشتے پر غور کرتے۔ ایسے مواقع روز، روز نہیں ملتے مگر عتیق نے اپنی کم عقلی کی بدولت یہ موقع گنوا دیا۔ رہی عارف کی بات تو وہ مرحا سے ہی شادی کرنا چاہتا تھا اور مرحا شادی کے لیے ہی اسپتال سے آرہی تھی مگر آگے اللہ کی مرضی۔'' فیصل میاں نے تفصیل سے ساری بات سمجھائی تو عاتکہ بیزار ہونے لگیں۔

''اچھا بس بھی کرو، عتیق رات کو جانے کب تھکا ہوا گھر آیا ہوگا، جب نیند پوری کرکے اٹھے گا تو میں بات کرلوں گی اس سے ورنہ جلد بازی میں اگر ابھی جگا کر سوال جواب کرنے لگوں گی تو وہ چڑ جائے گا اور پھر طیش میں آکر بغیر ناشتا کیے بکتا جھکتا گھر سے چلا جائے گا۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ کچھ عرصے سے اس کا مزاج کتنا بدل کر رہ گیا ہے، غصہ تو جیسے اب اس کی ناک پر دھرا رہتا ہے۔ جانے کس کی نظر لگ گئی میرے لعل کو۔'' عاتکہ کو اپنے بیٹے کے غصے اور بدتمیزی سے ڈر لگتا تھا مگر وہ اپنی ممتا کے جذبے سے مجبور تھیں اور بیٹے کی گستاخی کو اکثر نظر انداز کر دیتیں۔

فیصل میاں بیگم کی بات پر سرد آہ بھر کے رہ گئے۔

''چلیں بیگو...... جیسے آپ کی مرضی مگر مجھے یوں لگتا ہے کہ اب مجھے بھی ذرا صاحبزادے پر نظر رکھنی پڑے گی، ان کے لچھن کچھ ٹھیک نظر نہیں آرہے۔'' انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو عاتکہ چونک گئیں۔

''کیا مطلب؟'' انہوں نے پوچھا۔

''نہیں...... کچھ نہیں۔'' فیصل میاں نے ٹال دیا۔'' وہ میں سوچ رہا تھا کہ اگر آج دوپہر کے کھانے میں قیمہ بھرے کریلے مل جاتے تو، تو آہا، ہا، ہا۔'' فیصل میاں نے منہ میں قیمہ بھرے کریلوں کا ذائقہ محسوس کرتے ہوئے کہا تو عاتکہ بیگم اس بے موقع فرمائش پر جل کر رہ گئیں۔

''توبہ ہے، کبھی املی کی چٹنی تو کبھی امس اور گڑ کا گڑمبا، کبھی زعفرانی کوفتے اور کبھی بادامی قورمہ اور ہر قسم کا اچار تو تمہیں ہر کھانے کے ساتھ چاہیے۔ عجیب حاملہ عورتوں والی ادائیں ہیں تمہاری۔ خیر بنوا دوں گی قیمہ بھرے کریلے، آج کھانے میں مگر عتیق کے لیے کچھ اور بنانا ہوگا کیونکہ وہ کریلے نہیں کھاتا مگر بے فکر رہو، تمہاری زبان کا چٹخارہ ضرور پورا ہوگا۔'' عاتکہ نے جلے دل سے کہا اور اٹھ کر کچن کی طرف چل دیں۔

فیصل میاں اس جلی کٹی کے عادی ہو چکے تھے اسی لیے عاتکہ بیگم کی کڑوی کسیلی باتوں کو شربت کا گھونٹ سمجھ کر پی لیا اور بالوں میں خضاب لگانے چل دیے۔

Digest Novels Lovers group

☆☆☆

''پاپا! مجھے اسپتال جانا ہے مما کو دیکھنے، ان سے ملنے۔''

بظاہر بدرالدین لان میں پرندوں کو دانہ چگتے دیکھ رہے تھے مگر نہ جانے کن سوچوں میں گم تھے کہ جب زونی نے آکر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

''جی پاپا، جب سے مرحا اس دنیا سے گئی ہے تو مما کا تو کوئی پرسانِ حال ہی نہیں رہا۔ اتنے دن سے ہم لوگ بھی اسپتال نہیں گئے، کیا خبر مما ہماری منتظر رہتی ہوں مگر کہہ نہیں سکتیں تو کسی سے پوچھ ہی نہیں پائی ہوں گی کہ ہم اتنے روز سے انہیں دیکھنے اسپتال کیوں نہیں گئے۔ مما کو تو ابھی تک یہ بات بھی نہیں معلوم کہ مرحا اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔'' یہ سب کہتے ہوئے ازنا کے حلق میں جیسے آنسوؤں کا نمکین گولا سا پھنسنے لگا اور وہ بات کرتے ہوئے اچانک خاموش ہوگئی جیسے خود کو رونے سے باز رکھنے کے لیے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہو۔

بدرالدین فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور دونوں بیٹیوں کو بازوؤں کے حلقے میں لے کر باری باری ان کی پیشانی چوم کر انہیں تسلی دینے لگے۔

''بیٹا، یہ آپ نے کیسے سوچ لیا کہ مرحا کے بعد اب آپ کی مما کا کوئی پرسانِ حال نہیں رہا۔ ہم سب ہیں ناں بلکہ آپ دونوں بہنیں ہمیشہ ان کا خیال رکھنے کے لیے ہر وقت تیار ہو، اور فکر مت کرو تمہاری مما بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گی تو آپ دونوں بہنیں ماموں کے ہاں جا کر مما کے پاس کچھ روز رہ کر بھی آنا، مما بھی خوش ہو جائیں گی اور آپ دونوں بہنوں کو بھی تسلی ہو جائے گی، ٹھیک ہے ناں؟'' انہوں نے کہا۔

''پاپا، کیا ہماری مما اب دوبارہ اس گھر میں کبھی واپس نہیں آسکیں گی؟'' بدرالدین کی بات پر زونی نے سوالیہ نظروں سے باپ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''زونی بیٹا، فی الحال تو ہم اسپتال جا رہے ہیں اور ڈرائیور موجود نہیں ہے تو میں ہی گاڑی ڈرائیو کروں گا۔ آپ دونوں تیار ہو کر نیچے آجائیں اور اپنی مما کو بھی تیار ہونے کے لیے کہہ دیں۔''

بدرالدین نے کہا تو زونی اور ازنا حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

''مما......؟'' زونی نے زیرلب دُہرایا۔

''ہاں بھئی حاجرہ کی بات کر رہا ہو، وہ بھی تو آپ دونوں کی مما ہی ہوئیں ناں، ان سے بھی کہہ دیں کہ تیار ہو جائیں...... لو بھئی وہ خود ہی آگئی ہیں اور باہر جانے کے لیے تیار بھی لگ رہی ہیں، تو بس اب آپ دونوں چینج کر کے فوراً آجاؤ۔'' بدرالدین نے سامنے سے آتی ہوئی حاجرہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''پاپا، یہ بھی ہمارے ساتھ جائیں گی کیا؟'' زونی نے قدرے ناگواری سے پوچھا۔

''جی بیٹا، اس میں کوئی حرج تو نہیں۔'' بدرالدین نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں...... آپ لوگ کہیں باہر جا رہے ہیں تو بے شک چلے جائیں، میں بس گھر پر ہی ٹھیک ہوں۔ یہ تیاری تو اس لیے تھی کہ میں کچھ دیر کے لیے امی کی طرف جانا چاہتی تھی، میری عافیہ سے بات ہوئی تھی تو بتا رہی تھی کہ دادی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لیکن خیر، آپ لوگ جائیں میں بعد میں چلی جاؤں گی۔''

حاجرہ واپس اندر جانے کے لیے پلٹی تو بدرالدین نے پکار لیا۔

''حاجرہ! آپ یہیں رکیے اور میرے ساتھ ویٹ کیجیے، بچیاں ریڈی ہو کر آتی ہیں تو ہم سب ساتھ ہی چلیں گے اور اسپتال سے واپسی پر آپ کے گھر بھی ہوتے ہوئے آئیں گے، آپ عافیہ کو کال کر کے بتا دیں کہ آج ہم اس کے ہاتھ کی چائے پئیں گے۔'' بدرالدین نے کہا تو حاجرہ مسکرا دی۔

''امی بھی کھانا کھائے بغیر نہیں آنے دیں گی۔'' اس نے پیار بھرے یقین سے کہا۔

''نہیں، کھانے کے لیے منع کر دینا، اسپتال میں دیر ہو جائے شاید۔'' بدرالدین نے کہا اور بیٹیوں کی طرف دیکھا جن کے چہرے پر اس وقت شدید ناگواری چھائی ہوئی تھی۔

''زونی...... ازنا۔'' بدرالدین نے انہیں مخاطب کیا تو دونوں چونک گئیں۔

''اوہ سوری پاپا...... بس دو منٹ...... ہمیں صرف اپنے شوز بدلنے ہیں اور ہینڈ بیگز اٹھانے ہیں۔'' انہوں نے کہا اور تیزی سے اندر چلی گئیں۔

''گزشتہ ایک ماہ کے اندر اتنے حادثات اور عجیب و غریب واقعات پیش آ چکے ہیں کہ دونوں بچیاں ابھی تک صدمے سے باہر نہیں آ سکیں اسی لیے شاید کبھی کبھار ان کا رویہ ناقابلِ فہم سا ہو جاتا ہے۔'' اپنے تئیں بدرالدین نے حاجرہ کے سامنے زونی اور ازنا کے نامناسب رویّے کا جواز پیش کیا تھا شاید۔

''جی، دونوں خاصی بجھی بجھی سی رہتی ہیں مگر جب ان کا ذہن زندگی کے تلخ حقائق کو قبول کر لے گا تو خود بخود سب کچھ نارمل ہوتا چلا جائے گا۔'' حاجرہ نے جواب دیا اور اسی اثنا میں زونی اور ازنا واپس آتی دکھائی دیں تو...... بدرالدین گاڑی نکالنے کے لیے پورچ کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

عارف نے اپنی شادی کے لیے لی ہوئی چھٹی کینسل کرا کے دوبارہ آفس جوائن کر لیا تھا۔ ثروت اور ندرت کی چھٹیاں بھی ختم ہونے والی تھیں اس لیے عارف کی آفس سے واپسی پر وہ اسے گھیر لیتیں۔ کبھی پاکستانی ملبوسات کی شاپنگ تو کبھی غیر ملکی فرینڈز کے لیے تحائف کی خریداری۔ کبھی انہیں کوئٹہ ہوٹل کی کڑک چائے کی یاد ستانے لگتی اور کبھی میکسیکن اسٹیکس کھانے کو دل مچلنے لگتا۔ غرض وہ اسے اپنے ہمراہ مصروف رکھنے کا ہر روز کوئی نیا بہانہ ڈھونڈ لیتیں اور ان کے شوہر جواد اور سرمد بھی ہر شغل میں ساتھ ہوتے۔ پھر گھر آ کر رات گئے تک تاش کی بازیاں جمتیں، کبھی لوڈو کا بورڈ سجایا جاتا اور ہار جانے والی پارٹی کو خواہ مخواہ کی ٹریٹ دینا پڑتی اور اکثر وہ راتوں کے پچھلے پہر ''واٹ آ پراٹھا'' پہنچ جاتے جہاں چکن چیز پراٹھے کے ساتھ گرما گرم چائے کی چسکیوں کے دوران گپ شپ اور ہنسی مذاق جاری رہتا۔ یہ نہیں تو پاپ کارنز سامنے رکھ کر لمبے سیزن دیکھے جاتے، غرض ثروت اور ندرت کے ہمراہ عارف کو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ جب تک وہ ان سے فراغت پا کر اپنے کمرے میں جاتا تو اسے شدید تھکن آن گھیرتی اور وہ بستر پر جاتے ہی فوراً سو جایا کرتا۔ کسی بھی بارے میں کچھ بھی سوچنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا تھا۔

عارف کو تنہائی اور یاسیت کے خول سے باہر نکالنے میں ثروت اور ندرت کا واقعی بڑا کمال تھا۔ انہوں نے ماموں (بدرالدین) یا ان کی بیٹیوں کے حوالے سے پیش آنے والے حالیہ واقعات کا کبھی کوئی ذکر تک نہیں کیا، نہ عارف کو پاس بٹھا کر تسلی و تشفی دینے کے انداز میں اس کے زخم کریدے تھے بلکہ انہوں نے تو عارف کی شادی رک

جانے اور بارات بغیر دلہن کے واپس آجانے کے بارے میں بھی ایک لفظ تک نہیں بولا۔ وہ یوں ہر بات سے انجان بن کر معمول کے مطابق عارف کے ساتھ رہ رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو بلکہ مرحا کی موت سمیت سب کچھ ایک خواب ہو...... ایک ایسا بھیانک خواب جسے بھلا دینے میں ہی عافیت ہو۔

عارف، مرحا کو کبھی بھول نہیں سکتا تھا مگر ثروت و ندرت اور دونوں کے شوہروں کی بدولت یہ ضرور ہوا تھا کہ عارف اللہ کی رضا میں راضی ہو کر اپنے معمولاتِ زندگی پہلے کی طرح اچھے سے انجام دینے لگا تھا...... ہاں مگر کبھی، کبھی وہ اچانک ہی ہنستے، بولتے ایک دم خاموش ہو کر کہیں کھو سا جاتا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے ثروت اور ندرت کی واپسی کا دن بھی آ گیا۔ عارف اپنی امی (عارفہ) کے ہمراہ انہیں سی آف کرنے ائرپورٹ گیا تھا۔ جاتے وقت دونوں بہنوں نے عارف سے وعدہ لیا کہ وہ بہت جلد ان کے پاس کینیڈا چکر لگائے گا اور عارف نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔

وقتِ رخصت ثروت اور ندرت یوں آنسو بہا رہی تھیں جیسے آج پہلی بار جدا ہو کر سسرال رخصت ہو رہی ہوں۔

''آنے والوں کو ہمیشہ واپس بھی جانا پڑتا ہے، یہی دنیا کی ریت اور قانونِ قدرت بھی ہے، بس کوئی بہت اچانک اور پہلے چلا جاتا ہے اور ہمیں اس سے ملنے کے لیے مٹی کے ڈھیر تک جانا پڑتا ہے۔'' واپسی پر ڈرائیو کرتے ہوئے عارف نے سوچا تھا۔

ثروت اور ندرت کے جانے سے اس کا دل اداس تھا۔ امی مسلسل عارف سے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھیں مگر وہ ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ آخر کار گھر آ گیا۔

آج یہاں اداسی کی دھند میں لپٹے سناٹے اپنی ویرانیوں کے ساتھ عارف کے وجود میں اترنے کو بے تاب تھے۔ اتنے دنوں کے بعد وہ خود اپنے ساتھ تنہائی میں وقت گزارنے والا تھا۔

عارف نیند کا بہانہ کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو اس کے والد نے پکار لیا۔

''کدھر جا رہے ہو عارف یار، میں تو منتظر تھا کہ ہم دونوں باپ، بیٹا گرما گرم چائے پئیں گے۔'' وہ ٹیبل پر چائے کے لوازمات سجائے اس کے منتظر تھے ناچار عارف کو اپنے کمرے میں جاتے ہوئے واپس پلٹنا پڑا۔

عارفہ چائے کی رسیا نہیں تھیں مگر شوہر کی بنائی ہوئی چائے انہیں بے حد پسند تھی اس لیے چائے کا سنتے ہی وہ بھی اُدھر ہی آ گئیں اور پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگیں پھر وہ تینوں دیر تک ثروت، ندرت کی باتیں کرتے رہے اور ان کے بچوں کی معصوم شرارتوں کو یاد کرتے رہے۔

عارف جانتا تھا کہ چائے تو محض بہانہ تھا ورنہ اس کے پیرنٹس اِدھر اُدھر کی گپ شپ کر کے اس کے اندر کی اداسی کو دور کرنا چاہتے تھے یا پھر شاید ثروت اور ندرت کی کمی پوری کرنا چاہتے تھے اسے ٹائم دے کر۔

والدین کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ ہر حالت میں وہ اپنے بچوں کو خوش، مطمئن اور آسودہ دیکھنا چاہتے ہیں اس لیے چاہے انہیں خود کتنی ہی اذیت کیوں نہ جھیلنی پڑے۔

عارف جانتا تھا کہ عام روٹین میں اس کے والدین رات... کو جلدی سو جایا کرتے تھے کیونکہ انہیں صبح نمازِ فجر کے لیے جلدی بیدار ہونا پڑتا تھا مگر آج وہ عارف کی خاطر اپنی نیند کی پروا نہیں کر رہے تھے تاکہ اسے تنہائی محسوس نہ ہو اور وہ اپنے ماضی کی تلخیوں کو تنہائی ملتے ہی یاد کرنے نہ بیٹھ جائے اور دوبارہ مرحا کی دائمی جدائی کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے افسردہ نہ ہو۔

''chess (شطرنج) کی ایک گیم ہو جائے، کیا خیال ہے اس بارے میں تمہارا؟'' ابا نے اس سے پوچھا تو وہ ہنس دیا جیسے اپنے باپ کی ساری چالاکیاں اسے سمجھ آ رہی ہوں۔

''شطرنج کے کھیل کے لیے جس شاطرانہ مہارت، ذہانت اور حاضر دماغی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس وقت

digest.library.com

مجھ میں مفقود ہے، ذہن بری طرح تھکا ہوا ہے اور نیند سے برا حال ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو شطرنج کے کھیل کو کل پر اٹھا رکھیں۔"

عارف نے جس سعادت مندی اور شائستہ انداز میں شطرنج کھیلنے سے معذرت کی تھی اس نے عارف کے والدین کے لبوں پر تبسم بکھیر دیا۔

"ٹھیک ہے جا کر سو جاؤ۔" عارفہ بیگم نے اسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن ٹھہرو۔" ابا نے اسے جاتے ہوئے پیچھے سے پکارا۔

اس نے رکتے ہوئے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"بیٹا، تم آج سے نیچے والے روم میں ہی سو جایا کرو، نیچے میں اور تمہاری ماں اکیلے ہوتے ہیں اور اوپر تم تنہا تو کیوں نہ سب ایک ہی فلور پر رہیں۔"

اپنے والد کی بات پر عارف نے حیران ہو کر انہیں دیکھا اور پھر قدرے توقف کے بعد کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میں اپنے کمرے، بیڈ اور تکیے کا عادی ہوں اور اپنے روم میں کمفرٹیبل فیل کرتا ہوں۔ میرے موبائل کی سیٹنگ لاؤڈ والیوم پر ہے، کوئی بھی ضرورت ہو تو آپ مجھے کال کر لیجیے گا میں فوراً نیچے آ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے بیٹا جیسے تمہاری مرضی۔" عارف کے والد نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو عارف نے آگے بڑھ کر ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

"میں جانتا ہوں ابا کہ آپ اور امی میری وجہ سے فکرمند ہیں مگر میں اتنا کمزور نہیں ہوں کہ تنہائی ملتے ہی بکھر جاؤں گا۔ آپ دونوں نے جس طرح میری شخصیت کی تعمیر کی ہے تو پھر میری روحانی مضبوطی کا اندازہ بھی ہو گا۔ یقیناً آپ دونوں کو۔ بے فکر رہیے، میں خود کو سنبھالنا جانتا ہوں۔ آپ کا بیٹا اتنا کمزور نہیں ہے کہ اپنے رب کے فیصلے پر سر نہ جھکا سکے۔"

عارف کے ایسا کہنے پر عارفہ بیگم کا دل اچانک سے بھر آیا اور وہ آگے بڑھ کر بیٹے کے گلے لگ کر سسکنے لگیں۔

"مجھے تجھ پر فخر ہے میرے لعل۔" انہوں نے روتے ہوئے کہا۔

اور عارف اپنی ماں کے سر پر بوسہ دیتے ہوئے انہیں چپ کرا رہا تھا اور تسلیاں دے رہا تھا جبکہ پاس کھڑے عارف کے والد اپنے بیٹے کو شفقت آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

"بیسن...... نہیں ہے، دالیں...... نہیں ہیں، چاول...... ختم ہو گئے، چکن...... بس ایک پیکٹ پڑا ہے مگر بوٹیاں کم ہیں، ہڈیاں زیادہ، گوشت...... نہیں ہے، سوجی...... ختم۔ میں صرف ایک ہفتے بعد گھر واپس آئی ہوں، اس ہفتے کے دوران ہی سب کچھ ختم ہو گیا، پیچھے کیا جنات آ کر کھا گئے سب؟" حسنہ نے گھر آتے ہی ملازمہ کی آگے بڑھائی ہوئی راشن کی فہرست پڑھنے کے بعد اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں جی، مجھے تو ویسے بھی جن بھوتوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔" ملازمہ نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔

"میری سوتیلی نانی کو جن چمٹ گیا تھا تو وہ انہیں اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا، مجھے میری ماں نے بتایا تھا۔"

"اچھا بس، یہ ڈرامے بازی چھوڑ اور بتا کہ گھر میں کچھ موجود بھی ہے کہ نہیں؟" حسنہ نے پوچھا۔

"جی، جی...... اللہ سلامت رکھے، آپ ہیں ناں اور آپ کے دم قدم سے ہم بھی ہیں، یہ گھر ہے، سب کچھ ہے۔" نوکرانی نے جواب دیا تو حسنہ کا دل کیا کہ اپنا سر ہی پیٹ لے۔

"اری او عقل کی دشمن، میرا مطلب تھا کہ گھر میں کھانے کے لیے کیا موجود ہے...... وہ بتا۔" حسنہ نے چلاتے ہوئے کہا تو نوکرانی گھبرا گئی۔

”تھوڑی سی پتی پڑی ہے، آدھا کلو چینی بھی ہوگی اور آٹا بھی دو دن تک کے لیے ہے، اگر آپ کہیں تو پراٹھے بنا دیتی ہوں اور ساتھ چائے بن جائے گی۔“

ملازمہ کی تجویز پر حسنہ سوچ میں پڑ گئیں۔

”چل ٹھیک ہے، فی الحال تو پراٹھے ہی بنا لے اور کوثر کو بھیج، میں پیسے دیتی ہوں وہ جا کر نکڑ والی دکان سے دہی لے آئے گی۔ دہی سے پراٹھے کھا لیے جائیں گے اور چائے بعد میں بن جائے گی۔“ حسنہ نے کہا تو ملازمہ ”جی اچھا“ کہتی ہوئی وہاں سے چل دی۔

پرانی ملازمہ کوثر کے توسط سے یہ نئی ملازمہ کچھ روز قبل ہی گھر میں آئی تھی۔ کم عمر لڑکی ہونے کے ساتھ خاصی شوخ و چنچل بھی تھی، اور جتنی معصوم شکل تھی اس سے کہیں بڑھ کر عقل سے پیدل تھی۔

”پچھلے ماہ جو راشن آیا تھا وہ سب ختم ہو گیا؟“ حسنہ نے کچن کی انچارج ملازمہ نجمہ بی بی کو بلا کر سوال کیا۔

”جی، وہ تو ختم ہو گیا تھا جب آپ شادی پر جانے لگی تھیں تب بھی میں نے آپ کو یاد دلایا تھا مگر آپ نے کہا تھا کہ جب آپ شادی سے واپس آئیں گی تو تبھی راشن لا کر دیں گی۔“ ملازمہ نے یاد دلایا۔

”اوہ ہاں...... یاد آ گیا، ٹھیک ہے شام میں تیرے صاحب کے ساتھ جا کر لا دوں گی سب سامان۔“ حسنہ نے کہا اور بچوں کی طرف متوجہ ہو گئیں جو جوس اور آئس کریم کی ضد کر رہے تھے۔ حسنہ نے ڈانٹ ڈپٹ کر کے روتے دھوتے دونوں بچے کوثر کے حوالے کیے اور خود موبائل اٹھا کر شوہر کو کال ملانے لگیں۔

”آفس سے تو کب کی چھٹی ہو چکی ہو گی، اب اپنی آپا کے درشن کرنے یقیناً اسپتال گیا ہوگا اور یہ آپا بھی شاید قیامت کے بوریے سمیٹنے کو زندہ پڑی ہے، کم بخت مرے تو سکون آئے ہماری زندگی میں۔ مرنا تو ماں کو چاہیے تھا مگر مر گئی اس کی بیٹی مرحا۔ چلو کم از کم ایک سے تو جان چھوٹی۔ توبہ ہے، ناک میں دم کر کے رکھ دیا تھا دونوں ماں، بیٹی نے۔ ایک تو میرا شوہر امجد بھی عجیب ہے، جس بہن کے مرنے کی دعائیں کرتا تھا اب اسپتال میں اسی کی پٹی سے لگا بیٹھا ہے۔ لگتا ہے مجھے تو بھول ہی گیا ہے مگر میں ابھی یاد دلاتی ہوں...... ذرا ایک بار فون تو اٹھا لے یہ۔ خود بھی چلا گیا اور گاڑی بھی لے گیا، اب میں مارکیٹ کیسے جاؤں...... ہزار بار کہا ہے کہ ڈرائیور رکھ دو مگر نہیں...... خیر ابھی خبر لیتی ہوں...... ذرا ایک بار وہ میرا فون تو اٹھا لے۔“ وہ بار، بار فون ملا رہی تھیں۔

”فون اٹھاؤ امجد...... فون اٹھاؤ۔“

حسنہ بیٹھے سے اٹھ کھڑی ہوئیں، وہ موبائل کان سے لگائے کمرے میں ادھر سے اُدھر چکر کاٹ رہی تھیں۔ امجد میاں کے موبائل پر بیل جا رہی تھی مگر وہ کال نہیں اٹھا رہے تھے۔

☆☆☆

”اے کاش میری پیاری آپا کبھی نہ مریں اور نہ کبھی صحت یاب ہی ہوں، بس یونہی انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل رہیں قیامت تک اور میں روزانہ تم سے ملنے آتا رہوں اور تمہیں دیکھتا رہوں۔“ نرس کے سفید اور صاف ستھرے یونیفارم میں ملبوس گلاب کی طرح کھلی ہوئی شگفتہ کو سامنے پا کر امجد میاں جانے کیوں بہک سے جاتے تھے۔

”رہنے بھی دو، صرف باتیں ہی ہیں تمہاری، اگر سچ میں تمہیں اچھی لگتی ہوں تو آج ڈیوٹی ٹائم کے بعد میرے ساتھ گھر چلو اور رشتے کی بات کرو، تب سمجھوں گی کہ تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے۔“ شگفتہ نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ اٹھلاتے ہوئے کہا۔

”ہاں، ہاں...... تو میں کب انکار کر رہا ہوں۔ ضرور چلوں گا مگر نکاح اس وقت تک نہیں ہو سکے گا جب تک آپا اس پچویشن کے ساتھ اسپتال میں داخل ہیں۔“ امجد میاں نے فکرمندی کے انداز میں عذر تراشا۔

”میرے خیال میں تمہاری آپا طبعی طور پر مر چکی ہیں مگر ڈاکٹرز نے مشینوں کے ذریعے انہیں مصنوعی تنفس

Digest Novels Lovers group

دے کر زندہ رکھا ہوا ہے اور جب تک ممکن ہو وہ ان کی موت ڈیکلیئر نہیں کریں گے۔'' شگفتہ کے اس انکشاف پر امجد میاں کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

''مگر کیوں؟'' انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

''کیونکہ ایسے مریضوں کے ذریعے روزانہ کے حساب سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کا بل اسپتال کے اکاؤنٹ میں جمع ہوتا ہے اور اسپتال مرے ہوئے لوگوں کو مردہ ڈیکلیئر کر کے اپنا نقصان تو نہیں کر سکتا ناں۔ مریضوں کے لواحقین اپنے پیاروں کو زندہ دیکھنا چاہتے ہیں اور اس امید پر پیسہ پانی کی طرح بہاتے ہیں کہ شاید ایک روز وینٹی لیٹر ہٹے تو ان کا مریض پوری طرح صحت یاب ہو کر ہنستا مسکراتا اٹھ بیٹھے۔ دو بار تمہاری آپا کا دل قدرتی طور پر بند ہوا مگر ڈاکٹرز نے تمہاری بھانجی کی اجازت سے انہیں بجلی کے جھٹکے لگا کر دل چالو ہونے کا اعلان کر دیا۔''

''خدا کی پناہ، یہ مکروہ دھندا بھی ہوتا ہے اسپتالوں میں...... توبہ، توبہ...... مجھے تو سوچ کر ہی اسپتال کے نام سے گھن آ رہی ہے اور یہ تو شہر کا بہت مشہور، مہنگا اور نامور اسپتال ہے، یہاں یہ حال ہے تو باقی اسپتالوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا ہوگا۔'' امجد میاں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''سب اسپتالوں میں تو پتا نہیں مگر یہاں کے یہی حالات ہیں۔ ویسے کچھ اسپتال یہ بے ایمانیاں نہیں بھی کرتے، وہاں واقعی دیانت داری سے سارا کام ہوتا ہے مگر زیادہ تر اسپتالوں میں یہی کچھ ہو رہا ہے آج کل۔'' شگفتہ نے عام سے انداز میں بتایا۔

اسی اثنا میں امجد میاں کا موبائل بج اٹھا تو انہوں نے جیب سے موبائل نکال کر اسکرین پر نظر دوڑائی اور کڑوی سی شکل بنا کر موبائل واپس پاکٹ میں رکھ لیا۔

''بیوی کی کال ہے؟'' شگفتہ نے ہنستے ہوئے پوچھا تو انہوں نے مسکین سی شکل بنا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں، مگر تمہیں کیسے پتا چلا؟'' امجد نے پوچھا۔

''تمہاری صورت دیکھ کر اندازہ ہوا۔'' شگفتہ نے ہنستے ہوئے بتایا۔ ''ہائے تو سن لو کال، بیچاری تمہیں مس کر رہی ہوگی۔'' شگفتہ نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

جواباً امجد میاں نے شکل پر اور مظلومیت طاری کر لی۔

''وہ اور مجھے مس کرے...... ایسے دن تو میری بیوی کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی، یقیناً مجھ سے اسے کوئی کام ہوگا، سودا سلف منگوانا ہوگا یا میرے ساتھ شاپنگ پر جانا ہوگا، بچوں کی کوئی شکایت کرنی ہوگی یا پھر اسے پیسے چاہیے ہوں گے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہنا ہوتا اسے کال پر۔'' امجد میاں نے بیزار لہجے میں بتایا۔

''تو واقعی کبھی تمہاری بیوی نے تمہیں ''آئی لو یو'' نہیں کہا؟'' شگفتہ نے حیرت آمیز تجسس سے پوچھا۔

''نہیں، کبھی نہیں۔ میری بیوی کو محبت ہے ہی نہیں مجھ سے تو کیسے کہے گی۔ شوہر تو اس کے نزدیک بس ضروریاتِ زندگی پوری کرنے یا پھر نوٹ کمانے کے لیے ہوتا ہے۔ ہر اچھے شوہر کو بیوی، بچوں کے آرام و آسائش کا خیال تو رکھنا چاہیے مگر شاید بیوی سے پیار و محبت اور ہمدردی کی کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے...... بس یہ میری بیوی کا ماننا ہے۔'' امجد میاں نے مظلوم شکل بناتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔

''یہ تو واقعی تمہاری بیوی کی زیادتی ہے مگر میں سوچ رہی ہوں کہ تم دونوں کے درمیان اگر سرے سے محبت تھی ہی نہیں تو پھر تمہارے دو بچے کیسے ہو گئے؟'' شگفتہ بھی حرفوں کی بنی ہوئی تھی، اپنے تئیں دور کی کوڑی لائی۔

''ارے جانو، بچوں کا کیا ہے، وہ تو جانوروں کے بھی ہو جاتے ہیں۔'' امجد میاں نے کئی بار کا سنا سنایا اور رٹا رٹایا جواب دیا اور بے شرمی سے ہنسنے لگے۔

''مطلب یہ کہ انسان پر اگر حیوانی جذبات طاری ہوں تو پھر اسے ذرہ بھر اس بات کی پروا نہیں رہتی کہ پیار د

محبت بھی کسی چڑیا کا نام ہے؟" شگفتہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ارے میں نے ایسا کب کہا؟ تم بھی ناں کدھر کی بات کدھر لے گئیں۔" وہ گھبرا کے بولے۔ "بھئی میری اماں کو پوتے، پوتی کا ارمان تھا تو بس ان کی خوشی پوری کی ہے۔" امجد میاں نے صفائی پیش کی تو شگفتہ طنز سے مسکرا دی۔

"شگفتہ! ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آنے والے ہیں اور تم یہاں کھڑی ہو، اُدھر میم ذاکرہ بھی تمہارا پوچھ رہی ہیں، جلدی آؤ۔"

ساتھی نرس نے شگفتہ کو پکار کر کہا تو وہ بادلِ ناخواستہ جانے کو مڑی۔

"اچھا پھر لنچ پر ملتی ہوں...... لو وہ تمہاری بھانجیاں اپنے کنبے کے ہمراہ اِدھر ہی آ رہی ہیں، میں چلتی ہوں۔" شگفتہ نے سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور فوراً وہاں سے چل دی۔

امجد نے سامنے دیکھا تو بدرالدین اپنی نئی بیگم اور دونوں بیٹیوں کے ہمراہ چلے آ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی امجد چہرے پر مصنوعی تبسم سجائے انہیں ویلکم کرنے آگے بڑھ گئے۔

"ماموں، آپ ممانی کی کال کیوں اٹینڈ نہیں کر رہے، وہ سخت غصے میں تھیں اور اسی غصے میں انہوں نے مجھے بھی کال کر کے تاکید کی تھی کہ آپ سے کہوں کہ فوراً ممانی سے رابطہ کریں، انہیں آپ سے ضروری کام ہے۔" سلام دعا کے بعد رازنا نے فوراً ہی ممانی کا پیغام ان کے گوش گزار کر دیا۔ جواباً ماموں سر ہلا کے رہ گئے۔

"ہاں...... ہو گئی تھی بات۔" انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔

"ہمیں مما کے پاس جانا ہے۔" زونی نے کہا۔

اتنے میں شگفتہ دور سے آتی دکھائی دی۔

"سس...... س...... ٹر۔" امجد میاں، شگفتہ کو متوجہ کر کے اِدھر بلانا چاہتے تھے مگر لفظ "سسٹر" ان کے حلق میں جیسے پھنس کر رہ گیا تھا۔

"پتا نہیں نرسوں کے لیے یہ لفظ سسٹر یعنی بہن کس نے ایجاد کیا تھا۔ اب اگر کوئی اسے بہن نہ بولنا چاہے تو کیا کرے۔" امجد میاں نے سوچا۔

پاس سے گزرتی شگفتہ کی توجہ بھی انہی کی جانب تھی سو امجد میاں کی آواز پر ان کی طرف دوڑی چلی آئی۔

"میری دونوں بھانجیاں اپنی والدہ کو دیکھنا چاہتی ہیں تو پلیز کیا وہ اس وقت آئی سی یو جا سکتی ہیں؟" امجد میاں نے پوچھا تو جواب میں شگفتہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے زونی اور رازنا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور انہیں انتہائی نگہداشت کے شعبے کی طرف لے کر چل دی۔

مما کو بے حس و بے حرکت چت لیٹے دیکھ کر دونوں بچیوں کا دل بھر آیا اور وہ ان کے سرد اور بے جان سے ہاتھ چوم کر رونے لگیں۔

"مما...... بس کریں...... ہمارے ضبط کا اب اور امتحان نہ لیں...... اٹھ جائیں مما...... ہمیں گلے سے لگائیں اور تسلی دیں۔ ہم بہت تھک چکے ہیں، ہمیں اب آپ کی ضرورت ہے...... دیکھیں ناں مرحا بھی ہم سب کو چھوڑ کر چلی گئی...... اور اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی...... آپ کی لاڈلی اب کبھی آپ کو دیکھنے نہیں آسکے گی...... کبھی بھی نہیں...... مما، ہم بہت اکیلے ہیں، ہمیں ڈر لگتا ہے، آپ آجائیں ناں۔" زونی نے مما کا ہاتھ اپنے آنسوؤں سے بھیگے گال سے لگاتے ہوئے کہا تو یوں لگا جیسے پل بھر کے لیے آسیہ بی کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار پیدا ہوئے ہوں۔

ان کی بند آنکھوں کے نیچے جیسے پتلیاں پل بھر کو حرکت میں آئی ہوں اور ہاتھوں کی انگلیوں میں ہلکا سا ارتعاش محسوس ہوا ہو...... مگر یہ سب بس اِک پل کے لیے ہی تھا اس کے بعد وہی ساکن اور بے جان سا وجود ان کے سامنے موجود تھا۔

زوتی اور ازنا بے اختیار رونے لگیں۔ مرحا کے بعد مما کو کھونے کا تصور بھی ان کے لیے محال تھا۔

''روتے نہیں ہیں، بس اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں، سب سے بڑا ڈاکٹر تو وہی ہے، وہ اگر چاہے تو مردہ تن میں جان ڈال دے۔ وہی ایک ذات ہے جو سب کچھ کرنے پر قادر ہے، بس اسی کے اشاروں پر معجزے رونما ہوتے ہیں تو تم دونوں بھی اپنی ماں کی زندگی اور صحت کے لیے اسی رب سے گڑگڑا کر دعا مانگو اور پھر بے فکری سے اس کی رضا میں راضی ہو جاؤ۔'' شگفتہ نے دونوں کے شانے پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں حوصلہ دیا۔

''تم دونوں میں سے کسی کو سورۂ یٰسین زبانی یاد ہے؟'' شگفتہ نے پوچھا۔

دونوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اوہ...... چلو کوئی بات نہیں، میں ابھی کسی بھی ڈیوٹی ڈاکٹر کے روم سے پتا کرتی ہوں یا پھر نرسنگ ہاسٹل میں رہنے والی کسی نرس سے معلوم کرتی ہوں۔ سورۂ یٰسین مل جائے تو تمہیں لا کر دیتی ہوں۔ وضو کر کے باہر بیٹھ کر سورۂ یٰسین پڑھو اور اپنی امی کے لیے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسانی پیدا فرمائے اور انہیں اس اذیت سے نجات دلائے۔'' شگفتہ نے کہا تو زوتی اور ازنا اس کی جانب دیکھنے لگیں۔

''ہاں بیٹا، تمہاری امی اس وقت بے حد اذیت میں ہیں، انہیں تمہاری دعاؤں کی ضرورت ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔'' وہ ان دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی باہر کی جانب چل دی۔

بیٹیوں نے باری، باری ماں کے ہاتھوں پر بوسہ دیا اور بوجھل دل کے ساتھ نرس شگفتہ کے پیچھے باہر چلی آئیں جہاں سامنے ہی اسپتال کی فکسڈ چیئرز پر ماموں، پاپا کے ہمراہ کسی اہم اور سنجیدہ موضوع پر بات چیت میں مصروف تھے اور قریب ہی حاجرہ بیٹھی تھیں۔ دورانِ گفتگو ماموں بیچ میں حاجرہ کو بھی مخاطب کر لیتے تھے اور وہ بھی گفتگو میں شامل ہو جاتی تھی۔

''ٹھیک ہے امجد، میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں، ابھی ڈاکٹر صاحب موجود نہیں ہیں، میں آج کل میں کسی وقت دوبارہ آؤں گا اور ڈاکٹر صاحب سے گزارش کروں گا کہ تمام بڑے ڈاکٹر کی میٹنگ بلائیں اور پیشنٹ آسیہ کا کیس ڈسکس کر کے فائنل ہمیں بتائیں کہ ہماری پیشنٹ کی کیا کنڈیشن ہے اس کے بعد ہی وینٹی لیٹر سے ہٹانے یا نہ ہٹانے کا فیصلہ کیا جا سکے گا۔'' بدرالدین نے کہا۔

''مجھے آج گھر جانا ہوگا۔ جب تک ہماری بیگم اور بچے آپ کے ہاں تھے تو ہمیں تسلی تھی مگر اب وہ گھر جا چکی ہے تو اسے گروسری وغیرہ کے لیے لے جانا ہوگا۔'' ماموں نے بتایا۔

''ٹھیک ہے، تم گھر پر ٹائم دو، یہاں اسپتال کے لیے میں کچھ اور بندوبست کرتا ہوں ورنہ میں اور زونی واپس آ جائیں گے۔'' بدرالدین نے کہا۔

شگفتہ نے کہیں سے ڈھونڈ کر انہیں سورۂ یٰسین لا کر دے دی تھی جسے زونی اور ازنا ایک ساتھ پڑھ رہی تھیں اور اشکوں کی برسات کے دوران اپنی مما کی صحت و تندرستی اور ان کی آسانی کے لیے دعا کر رہی تھیں۔

☆☆☆

عافیہ کی منگنی کا سامان انگوٹھی سمیت واپس آ گیا تھا یعنی منگنی باقاعدہ ٹوٹ چکی تھی۔

چند روز تک تو عافیہ نے منگنی ٹوٹنے کا سوگ منایا مگر پھر بس طلال کا نمبر موبائل سے ڈیلیٹ کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر زندگی کی روانی میں آگے بڑھ گئی اور ایم ایس کرنے کا اعلان کر دیا۔ شاکر بھائی نے اس کے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے یونیورسٹی کے اگلے سیشن میں اسے ایڈمیشن دلانے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ یوں عافیہ کی زندگی عام انداز میں اپنی مخصوص ڈگر پر آگے بڑھنے لگی تھی۔

☆☆☆

digest library.com

''آخر یہ کیا وتیرہ اپنایا ہے تم نے؟ جب دیکھو شام میں تیار ہو کر باہر نکل جاتے ہو اور پھر اگلے دن چڑھے واپس آ کر لمبی تان کر سو جاتے ہو، سارا دن کھاتے ہو نہ پیتے ہو، نہ کسی سے بات چیت ۔ جاگتے ہو تو موبائل پر لگے رہتے ہو۔'' عاتکہ بیگم نے آج شام میں باہر جانے کے لیے تیار ہوتے عتیق کو اس کے کمرے میں جا پکڑا تھا۔

''امی، میں نے اپنا ایک نیا بزنس اسٹارٹ کیا ہے تو اس کے لیے مجھے ٹائم تو دینا ہی پڑے گا۔''

''یہ کون سا بزنس ہے جو رات کے اندھیروں میں کیا جاتا ہے اور دن کے اجالوں میں چھپایا جاتا ہے؟'' عاتکہ بیگم نے گہری نظروں سے عتیق کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اُفوہ ماں جی، ابو پر شک کرتے ہوئے آپ کی یہ عادت اتنی پختہ ہوگئی ہے کہ اب آپ سب کو ہی شک بھری نظروں سے دیکھنے لگی ہیں۔ میں راتوں کو کہیں ڈکیتیاں کرنے نہیں جاتا، اپنی کمپنی پراڈکٹ کی پروڈکشن بڑھانے اور اس کی پیکنگ اپنی نگرانی میں کرانے کا ذمّے دار ہوں اور یہ کام تسلی سے صرف رات کے وقت ہی ہوسکتا ہے، سب ورکرز بھی رات میں ہی آتے ہیں تو ہمارا آفس رات کو کھلا ہوتا ہے۔'' عتیق نے اپنی ماں کی تسلی کے لیے تفصیل بتائی۔

''تو اپنی دن والی ملازمت چھوڑ دی ہے تم نے؟'' عاتکہ بیگم نے پوچھا۔

''نہیں، فی الحال ایک مہینے کی چھٹی لی ہے۔'' عتیق نے بالوں میں برش کرتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''تم نے اپنے ابا کو بھی یہ بات نہیں بتائی، نہ کسی سے مشورہ لیا، خود ہی بیٹھے بٹھائے بزنس شروع کر دیا۔ آخر اپنے باپ کو تو اس بارے میں بتانا چاہیے تھا ناں تمہیں۔ کون سا بزنس ہے، کون لوگ ساتھ شامل ہیں، تمہارا نیا آفس کہاں ہے جہاں راتوں کو تم جا کر کام کرتے ہو، یہ سب تمہارے والد کو معلوم ہونا چاہیے تھا ناں؟'' عاتکہ بیگم نے تیوری چڑھا کر بیٹے کو سرزنش کرنا چاہا مگر وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔

''بس اسی لیے تو نہیں بتاتا کہ پھر طرح، طرح کے سوال جواب شروع ہو جاتے ہیں۔ آپ لوگ آخر کب سمجھیں گے کہ میں ایک پڑھا لکھا، بالغ نوجوان ہوں، اپنی زندگی کے فیصلے خواہ وہ ملازمت ہو یا بزنس، ریلیشن شپ ہو یا شادی میں خود کر سکتا ہوں۔ مجھے آپ دونوں میں سے کسی کی اجازت درکار ہے اور نہ مشورہ۔ پلیز آپ مجھے اپنی مرضی سے سکون کی سانس لینے دیں اور میرے معاملات میں مداخلت نہ کریں۔'' عتیق نے غصے سے عاتکہ بیگم کو جھڑک دیا۔

بیٹے کے ہاتھوں اپنی بے عزتی اور بیٹے کی ڈانٹ پر عاتکہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ بولیں تو لہجہ بھی بھرایا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے، جیسے تمہاری مرضی۔ وہ تو بس تمہارے ابو اس لیے تمہارا پوچھ رہے تھے کہ انہیں محسوس ہوا تھا کہ تم مرحا کی میت چھوڑ کر کہیں نکل گئے تھے اور پھر دوبارہ اپنے بدر ماموں کی طرف نہیں گئے۔ دکھ کے موقع پر اپنوں کے ساتھ کھڑے ہونا پڑتا ہے بیٹے، بس اسی لیے......'' عاتکہ بھرائے ہوئے لہجے میں بس اتنا ہی کہہ سکیں۔

''تو کھڑے ہوگئے تھے ناں آپ دونوں ماموں بدر الدین کے ساتھ اس دکھ کے موقع پر، میری کیا ضرورت تھی وہاں، میرے ہونے سے کون سا مری ہوئی مرحا زندہ ہو جاتی یا بدر الدین ماموں کے اندر کوئی توانائی کی نئی لہر دوڑ جاتی۔ میرے ہونے نہ ہونے سے کسی کو کوئی فرق نہیں پڑتا، میں اگر آپ کے برادر کو اتنا عزیز ہوتا تو وہ مجھے یوں رشتے کے لیے انکار نہ کرتے۔'' عتیق نے زہر آلود لہجے میں جتایا تو عاتکہ سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو...... مگر ضروری تو نہیں کہ ہر انسان کی رائے ہمیشہ ہی ایک جیسی رہے۔ وقت اور حالات کے تحت انسان کی سوچ، پسند ناپسند، نظریات اور رائے بدلتی رہتی ہے۔ تمہارے ابو کا خیال تھا کہ اگر تم دکھ کے وقت پر بدر الدین کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر کھڑے ہوتے تو شاید تمہارے ماموں کی سوچ تمہارے بارے میں تبدیل ہو جاتی اور وہ دوبارہ از نا اور تمہارے رشتے کے متعلق غور کرتے۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں ابھی

تک ان کی جانب سے اس رشتے کے لیے انکار کا قلق ہے مگر یہ دکھ، خوشی میں اب بھی بدل سکتا ہے۔''

''مجھے کوئی قلق نہیں ہے۔ دکھ کسی کو کھونے سے ہوتا ہے اور میں ازنا کو حاصل کر کے ہی رہوں گا بہت جلد...... وہ جب میرے قدموں میں آجائے گی تو بدر ماموں خود بخود آپ کے پیروں پر ہاتھ رکھ کے بیٹی کا رشتہ دینے کے لیے منتیں کریں گے۔ دیکھ لیجیے گا، بہت جلد ایسا ہوگا اس لیے میں کیوں خوشامدیں کرتا پھروں ان کی۔'' عتیق کے لہجے میں کچھ ایسا چونکا دینے والا پہلو ضرور تھا کہ عاتکہ منہ کھولے چند ثانیے تک اسے دیکھتی رہ گئیں۔

''ایسا کون سا جادو کا منتر تیرے ہاتھ لگ گیا ہے جو تو اتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہا ہے۔ دیکھ میرے لعل، تجھے اللہ کا واسطہ کسی ڈھونگی قسم کے عامل کامل کے چکروں میں نہ پڑ جانا۔ یہ لوگ اپنے لالچ کے لیے کچھ بھی الٹا سیدھا کر جاتے ہیں۔'' عاتکہ بیگم نے منت بھرے انداز میں عتیق سے کہا تو وہ ماں کو یوں سہمے ہوئے انداز میں اپنا منت ترلا کرتے دیکھ کر قہقہہ لگائے بنا نہ رہ سکا۔

''ارے میری بھولی ماں، تیرے بیٹے کو اب کسی عامل کامل کی ضرورت نہیں ہے، اب تو بڑے، بڑے عامل خود مجھ سے ٹیوشن لینے آیا کریں گے۔ بس دیکھتی جاؤ۔''

''مگر بیٹا......'' بات عاتکہ کے منہ میں ہی رہ گئی۔ عتیق خود پر پرفیوم کا اسپرے کر کے اپنی ٹائی کی ناٹ درست کرتا اور عاتکہ کو ٹاٹا، بائے، بائے کرتا ہوا کار کی چابی اٹھا کر تیزی سے باہر چلا گیا اور عاتکہ اپنی جگہ بیٹھی اسے دیکھتی رہ گئیں۔

☆☆☆

آندھی، طوفان کے آتے ہی حسنہ شاہانہ دونوں بچوں کو ساتھ لیے اپنے کمرے میں دُبک گئی تھیں۔ انہیں سچ میں بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج سے بہت ڈر لگتا تھا۔ آندھی، طوفان کے ساتھ ہی گھر کی لائٹ چلی گئی تھی۔ یہ تو

الوداع
حرص و ہوس کی دلدل میں اترنے والے ایک بہروپیے کی
عبرت اثر داستان...... احمد قادری کے قلم سے
محبت، خواب سفر
ماضی کا آئینہ، بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے
اور عبرت آمیز واقعات زویا صفوان کے قلم کی روانی
رمز شناس
خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمز شناس کی
دلچسپ داستان...... نازیہ کامران کاشف کی اچھوتی تحریر
جنگ باز
معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں
اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم کی جادوگری
ملک صفدر حیات کی تفتیش
الیاس سیتاپوری
طاہر جاوید مغل، اے آر راجپوت، عائشہ نصیر، مہوش اسد حیات،
عیوق بخاری، ابن آس، عمران قریشی و دیگر کی خوب صورت تحریریں

غنیمت تھا کہ گھر میں یو پی ایس موجود تھا اس لیے گزارہ ہو جاتا تھا مگر پھر بھی گھر اس طرح سے روشن نہیں محسوس ہوتا تھا جیسے لائٹ کے موجود ہونے پر روشنی اور رونق ہوتی تھی۔

اگرچہ کچھ ملازمائیں تھیں اور روٹین کا کام کر رہی تھیں مگر اس کے باوجود پورے ماحول پر عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ کہیں نزدیک ہی شاید آسمانی بجلی گری تھی۔ زوردار کڑاکے کی آواز سے دونوں بچے سہم کر ماں سے لپٹ گئے تھے اور رونے لگے تھے۔

Digest Novels Lovers Group

''یا اللہ خیر۔'' حسنہ نے دل سے دعا مانگی اور دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

''طوفان تو پہلے بھی آتے رہتے تھے، بجلیاں پہلے بھی کڑکتی تھیں مگر آج مجھے یہ سب اتنی شدت سے کیوں محسوس ہو رہا ہے۔'' حسنہ نے سوچا۔

''ہاں شاید اس لیے کہ آج میں اکیلی ہوں۔ آسیہ آپا اور مرحا ہوتے تو اسی موسم کو انجوائے کرنے کے پروگرام بنتے، پکوڑے تلے جاتے، چائے بنتی، میٹھے بسکٹ کھولے جاتے اور خود اپنی چائے پارٹی کر کے انجوائے کیا جاتا۔ مرحا گھر میں موجود ہوتی تھی تو بچے میرے پاس یوں کب ٹکتے تھے، یہ دونوں تو بس ہر وقت مرحا کے ساتھ ہی پائے جاتے تھے۔ ہائے کیسی بے رونقی ہوگئی دونوں ماں، بیٹی کے چلے جانے سے۔'' درودیوار نے جیسے اداسی پہن لی تھی۔

اچانک حسنہ کا دل بھر آیا اور وہ انہیں یاد کر کے رونے لگیں۔

گھر میں ملازماؤں کے ہوتے ہوئے بھی اتنی خاموشی تھی کہ ان کا دل جیسے بند ہوا جا رہا تھا۔ گڈو اور منی کو تو کیا چپ کراتا تھا وہ خود بھی چہرے پر دوپٹے کا پلو ڈال کر زور شور سے رونے لگیں۔

اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور امجد میاں دونوں ہاتھوں میں فروٹ کے شاپرز اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ امجد میاں دونوں بچوں کو اُن کی ماں سمیت روتے پا کر دروازے ہی میں ٹھٹک کر رک گئے۔

''خیر تو ہے، یہ تم ماں، بچے ایک دوسرے سے لپٹ کر کیوں رو رہے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''بس ویسے ہی، بادلوں کی گرج چمک سے ڈر لگ رہا تھا۔'' حسنہ نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے جواب دیا تو امجد زور سے ہنس دیے۔

''واہ میری من موہنی...... کیا بات کی ہے...... تم اور ڈر؟ تم تو خود دوسروں کے لیے خوف کی علامت ہو۔'' امجد میاں نے فروٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اپنی ٹانگوں سے لپٹے دونوں بچوں کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہا۔

آج حسنہ کو امجد میاں کا یہ طنز بالکل بھی برا نہیں لگ رہا تھا بلکہ وہ الٹا مسکراتی ہوئی ان کے قریب آ کھڑی ہوئیں۔ امجد میاں کے لیے ان کے دل میں جتنے بھی گلے شکوے تھے وہ سب بھاپ بن کر اڑ گئے تھے اور اس وقت انہیں شوہر کا وجود بے حد غنیمت لگ رہا تھا۔

''بابا...... رول پراٹھا...... نہیں شوارما...... نہیں، نہیں مجھے تو آئس کریم چاہیے...... اور مجھے پزا بھی کھانا ہے۔'' منی اور گڈو ندیدوں کی طرح کھانے پینے کی فرمائشوں میں لگے تھے۔

''ٹھیک ہے، تم دونوں تیار ہو جاؤ اور اپنی امی کو بھی جلدی تیار ہونے کے لیے کہو پھر ہم سب آج پزا کھانے چلیں گے اور اس کے بعد آئس کریم بھی لیں گے اور کل شوارما کھانے جائیں گے۔'' انہوں نے بچوں کو گود سے اتارتے ہوئے کہا تو حسنہ نے چونک کر دیکھا۔

''تو آج سے آپ اسپتال نہیں جائیں گے...... آپا کی طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، آج گھر پر ہی رکوں گا، کل صبح تمہیں گروسری دلا کر اور ضروری شاپنگ کرا کے پھر اسپتال جاؤں گا اور شام میں ذرا دیر گھر آ کر بچوں کو باہر آؤٹنگ کے لیے لے جاؤں گا، بچے بہت اداس اور کمزور لگ رہے ہیں مجھے۔'' امجد میاں نے پیار سے بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر آپا کی طبیعت سے متعلق سوال گول کر گئے۔

''اور میں...... میں آپ کو کمزور اور اداس نہیں لگ رہی حالانکہ میں نے آپ کو اتنا یاد کیا کہ کیا بتاؤں۔'' حسنہ نے اٹھلاتے ہوئے کہا تو امجد انہیں دیکھ کر رہ گئے۔ وہ پہلے سے زیادہ موٹی اور بھدی لگ رہی تھیں، سانولا رنگ جانے سا ہو رہا تھا اور چہرے پر سستا میک اپ لگا کر ان کے گالوں پر گہری چھائیاں پڑ چکی تھیں۔ اگر چہ وہ بغیر میک اپ کے کسی بھتنی سے کم نہیں لگ رہی تھیں مگر اس وقت انہیں آئینہ دکھانا گویا اپنی شامت بلانے کے مترادف تھا اس لیے امجد ہنس کر ٹال گئے۔

مسلسل اسپتال میں رہنے کی وجہ سے ان کا اپنا حلیہ کافی ملگجا سا ہو رہا تھا اسی لیے وہ فوراً الماری سے اپنے کپڑے نکال کر شاور لینے کے لیے گھس گئے اور حسنہ بی بھی جلدی، جلدی بچوں کو تیار کرنے کے بعد خود تیار ہونے لگیں۔

☆☆☆

''عافیہ کی انگیجمنٹ ٹوٹنے کا مجھے بہت افسوس ہوا ہے، خود کو بے حد کمپوز کرنے کی کوشش کے باوجود وہ بیچاری کافی بجھی، بجھی سی لگ رہی تھی، اگر چہ وہ خود کو نارمل ظاہر کرنے کے لیے سب کے ساتھ ہنس بول بھی رہی تھی مگر اندر سے کافی افسردہ اور اپ سیٹ سی محسوس ہو رہی تھی۔''

حاجرہ بیگم کے میکے سے واپس آتے ہی اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر بیٹھنے کے ساتھ ہی ازنا نے زونی سے کہا۔

''ہاں، وہ پہلے والی شوخی نہیں تھی اس کے اندر۔'' زونی نے ازنا کی بات سے متفق ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے دکھ ہے کہ عافیہ بیچاری کو ہماری فیملی کے ساتھ نیکی کرنے کی کوشش کی اتنی بڑی سزا ملی حالانکہ وہ کون سا عارف بھائی کو پہلے سے جانتی تھی یا ان کی مردانہ وجاہت پر فریفتہ تھی۔ وہ تو بس ہمارے گھر کی عزت رکھنے کی خاطر زبردستی عارف بھائی سے نکاح کے لیے تیار ہوئی تھی تاکہ گھر آئی بارات دلہن کے بغیر خالی نہ لوٹے مگر طلال نے اسے بے وفا سمجھا اور منگنی ہی ختم کر دی۔''

''ہاں...... لیکن اگر تم طلال کے پوائنٹ آف ویو سے دیکھو تو وہ اپنی جگہ حق بجانب ہے۔ بے شک عافیہ ہماری وجہ سے ہی قربانی دے رہی تھی مگر اس کا یہ ایثار طلال کے لیے تو اذیت کا باعث تھا ناں۔ آخر اسے کس بات کی سزا دی جا رہی تھی، وہ تو سارے معاملے میں بے قصور ہی تھا۔ اسے تو کسی بات کا علم ہی نہیں تھا اور اسے اچانک سرپرائز دیا گیا کہ بھائی صاحب، عافیہ کا ایمرجنسی میں نکاح کیا جا رہا ہے لہٰذا آپ یہاں سے چلتے پھرتے نظر آئیں۔ تو اس بات پر اس کا یوں ری ایکٹ کرنا تو بنتا ہے بھئی۔'' زونی نے طلال کی حمایت میں ٹھوس دلائل دیے تو ازنا سوچ میں پڑ گئی۔

''زونی آپی، آپ کی بات بھی اپنی جگہ وزن رکھتی ہے مگر مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ عافیہ اور عارف بھائی کے نکاح کا معاملہ تو کچھ دیر میں ہی سرد پڑ گیا تھا اور مرحا، عارف بھائی سے شادی کرنے پہنچ رہی تھی پھر اتنی دیر میں طلال کو اس سارے معاملے کی بھنک کیسے پڑی۔ آخر کس نے طلال کو یہ سب بتایا جا کر؟'' ازنا نے کہا۔

''سیدھی سی بات ہے، جب گھر والوں کی اس بارے میں ڈسکشن ہوئی ہوگی تو پاپا کی بیگم یا ان کے گھر والوں میں سے کسی نے طلال کو بھی اعتماد میں لینے کے لیے کال کر کے سارا معاملہ بتا کر ان سے منگنی قائم رکھنے کے لیے معذرت کر لی ہوگی اور عافیہ کے عارف سے نکاح کا بتایا ہوگا۔ بس اسی وقت ان کے دل میں گرہ پڑ گئی اور عافیہ کے لیے منفی جذبات نے جنم لیا اسی لیے عافیہ کا عارف سے نکاح نہ ہونے کے باوجود بھی طلال نے منگنی توڑ دی، شاید انہیں ملال ہو کہ لاکھ مجبوری سہی مگر عافیہ کو اس زبردستی کے نکاح سے انکار کر دینا چاہیے تھا۔'' زونی نے اپنے آپ سے کڑیاں جوڑ کر نتیجہ اخذ کیا۔

''یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا مگر مجھے آج عافیہ سے مل کر، اسے دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ وہ اتنی پیاری، معصوم اور نیک دل لڑکی یہ سب ڈیزرو نہیں کرتی تھی۔ میں اس کی محبت واپس دلانے میں اس کی مدد کرنا چاہتی ہوں...... مگر کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔'' ازنا نے کہا۔

''ویسے تو اب مجھے مشکل دکھائی دے رہا ہے کہ عافیہ کے لیے کچھ کیا جا سکے کیونکہ دونوں طرف سے منگنی ختم ہونے کا باقاعدہ اعلان ہو چکا ہے پھر بھی تم کچھ کرنا چاہتی ہو تو عرشمان سے بات کر کے دیکھ لو۔'' زونی نے تجویز دی۔

''میری بات ہوئی تھی عرشمان سے، وہ بتا رہا تھا کہ اس نے طلال کو سمجھانے کی بے حد کوشش کی تھی مگر وہ کسی کی کوئی بات بھی سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے حتیٰ کہ عرشمان کی بھی بات نہیں مانی اور منگنی توڑ لی اپنی۔'' ازنا نے افسوس بھرے لہجے میں بتایا تو زونی سر ہلا کر رہ گئی۔

''خیر کوئی ترکیب تو سوچنی ہی پڑے گی۔'' اس نے کہا۔

''آئیڈیا......!'' ازنا نے اچانک ہی مسکراتے ہوئے ہوا میں چٹکی بجائی تو زونی تجسس بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ایسا زبردست آئیڈیا آیا ہے کہ آپ بھی سنو گی تو اش، اش کر اٹھو گی۔'' ازنا اپنے آئیڈیے پر خود ہی خوشی سے جھوم اٹھی۔

''مجھے بھی بتاؤ۔'' زونی نے تجسس سے کہا تو ازنا نے اسے کان نزدیک لانے کا اشارہ کیا اور اس کے کان میں سرگوشی کے سے انداز میں کچھ بتانے لگی۔

جیسے، جیسے ازنا اپنا آئیڈیا بتا رہی تھی زونی کی آنکھوں میں بھی چمک آتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

''کیا نام بتایا تم نے؟'' بدرالدین کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تو دوبارہ پوچھنے لگے۔

''سر، بندوق خان۔'' ڈرائیور کی جاب کے لیے آئے ہوئے لحیم شحیم شخص نے اپنا نام دُہرایا۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ تمہارا نام کچھ عجیب سا ہے۔'' بدرالدین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں سر...... ہمارا طرف کے علاقے میں سب ایسا ہی نام رکھتا ہے۔ میرے چوٹے (چھوٹے) بھائی کا نام پستول خان ہے اور والد کا اسم گرامی ہیبت خان ولد سمندر خان ہے۔'' بندوق خان نے اپنے نام کی تفصیلی وضاحت بیان کی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ شناختی کارڈ ہے تمہارے پاس؟'' بدرالدین نے پوچھا تو بندوق خان نے فوراً اپنے بٹوے سے اپنا شناختی کارڈ نکال کر آگے بڑھا دیا اور ساتھ ہی ہیوی اور لائٹ وہیکل لائسنس بھی پکڑا دیا تاکہ بدرالدین اپنی تسلی کر لیں۔

بدرالدین نے بغور سب دیکھنے کے بعد بندوق خان کو ملازمت پر رکھ لیا اور اسے گاڑی کی چابی پکڑاتے ہوئے ہدایت کی کہ گاڑی کی صفائی وغیرہ کر لے اور یہ بھی بتا دیا کہ ان کی دوسری گاڑی بھی ورکشاپ سے جلد آ جائے گی تب اسے بطور ڈرائیور دوسری گاڑی ہی چلانی ہوگی کیونکہ اسے بطور فیملی کار استعمال کیا جاتا ہے جبکہ اس وقت پورچ میں جو کار موجود ہے وہ بدرالدین کے ذاتی استعمال کے لیے ہے مگر اسے صفائی ستھرائی اور مینٹیننس کا کام دونوں گاڑیوں کا ہی دیکھنا پڑے گا۔

بندوق خان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

''تمہارا شناختی کارڈ اس کی کاپی کرانے کے بعد واپس کیا جائے گا اور تمہارے شناختی کارڈ پر جس ایڈریس کا

اندراج ہے میں اس علاقے کے تھانے سے بھی معلوم کراؤں گا کہ وہاں تمہارے خلاف کسی قسم کی شکایت یا کسی رپٹ کا اندراج تو نہیں۔'' بدرالدین نے غور سے بندوق خان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''الحمدللہ سر، ایسا کوئی بات نہیں مگر اپنی تسلی کرنا آپ کا حق ہے۔'' بندوق خان نے اعتماد سے کہا۔

''فیملی کی خواتین کے ساتھ چلنے کے کچھ اصول ہوتے ہیں جو ہر گھریلو ڈرائیور کو معلوم ہونے چاہئیں۔ بتا سکو گے کہ وہ کیا اصول ہیں؟'' بدرالدین نے پوچھا۔

''خواتین سے فالتو بات نہیں کرنی، گفتگو ادب سے ہونی چاہیے اور جب کوئی خاتون کار میں بیٹھے تو ڈرائیور کو چاہیے کہ وہ اپنے سامنے لگا بیک ویو مرر کا رخ اس طرح رکھے کہ بیک سیٹ پر بیٹھی خواتین شیشے میں ڈرائیور کو نظر نہ آئیں اور جب کہیں اترنا ہو تو ڈرائیور کو چابکدستی سے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولنا ہوتا ہے مگر خود اپنا رخ ایسے رکھ کے دروازہ کھولنا ہے کہ گاڑی سے اترنے والی خواتین کی طرف چہرہ نہ ہو تاکہ وہ ان کمفرٹیبل نہ ہوں۔'' بندوق خان نے فر، فر سارے رولز سنا دیے۔

وہ دل میں شکر ادا کر رہا تھا کہ یہ سارے رولز اسے ''عتیق صاحب'' نے پہلے سے ہی ازبر کرا دیے تھے۔ شاید انہیں پہلے سے ہی معلوم تھا کہ ڈرائیونگ کی جاب کے لیے جانے والے شخص سے یہ سارے سوالات پوچھے جائیں گے۔ بندوق خان نے سوچا۔

آخرکار بدرالدین نے بندوق خان کو نوکری پکی ہونے کی نوید سنا دی اور ایک ملازم کو بلا کر اسے ڈرائیور کو اس کا کمرا دکھانے کی ہدایت کی۔

اپنے کمرے میں ضروری سامان رکھنے کے بعد بندوق خان نے سب سے پہلے عتیق کو فون ملا کر اس کے ماموں کے ہاں ''جاب'' ملنے کی خوشخبری سنائی۔

''چلو مبارک ہو...... مگر بس نظر رکھنا اور اس گھر کی لڑکیاں کب، کہاں جاتی ہیں اور کس سے ملتی ہیں مجھے سب رپورٹ ملنی چاہیے۔ بطور خاص اس گھر کی چھوٹی بیٹی ازنا پر نظر رکھنی ہے۔'' عتیق نے ہدایت دی۔

''ٹھیک ہے سر، بے غم ہو جاؤ، ام یہ سب کرے گا۔'' بندوق خان نے عتیق کی تسلی کرائی۔

''ہاں...... مگر دھیان رہے کہ کسی کو ذرا بھر تم پر شک نہ ہو۔'' عتیق نے سختی سے یاد دلایا۔

''نہیں ہوگا...... آپ تسلی رکھو۔'' اس نے اعتماد سے کہا اور سلام کے بعد کال بند کر دی۔

Digest Novels Lovers Group

☆☆☆

مرحا کی وفات کے بعد بدرالدین گھر کا ماحول روٹین کے مطابق چلانے اور اپنی بیٹیوں کا خیال رکھنے کی خاطر کئی دنوں تک گھر میں ہی رہے تھے اور ان کا تمام بزنس ورکرز کے ہاتھوں میں رہا تھا، یہی وجہ تھی کہ کاروبار گھاٹے میں جانے لگا تھا اسی وجہ سے آج کئی دن بعد بدرالدین پہلے کی طرح معمول کے مطابق تیار ہو کر آفس چلے گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد حاجرہ خود کو بہت تنہا محسوس کر رہی تھی۔ بوریت دور کرنے کے لیے اس نے پہلے تو اپنے میکے فون کر کے سب سے گپ شپ لگائی اور اس کے بعد اپنی الماری کھول کر بیٹھ گئی۔ اتنے دن کی بے توجہی سے الماری بھی کافی الٹ پلٹ ہو رہی تھی۔ حاجرہ الماری میں ٹھونسے ہوئے کپڑے نکال کر تہ کرنے بیٹھ گئی۔ اسی وقت اچانک اس کے موبائل کی بیل بج اٹھی۔ حاجرہ نے چارجنگ پر لگا موبائل اٹھا کر دیکھا اور چونک گئی۔

''اس کا آج کیسے فون آ گیا۔'' اس نے سوچا اور موبائل چارجر سے ہٹا کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف...... بدرالدین کی پرانی ملازمہ ممتاز تھی، وہی ممتاز جس نے حاجرہ کو سیڑھیوں سے دھکا دیا تھا اور اسی کی وجہ سے حاجرہ کا حمل

بچوں میں حیا و شرم کا جذبہ اجاگر کریں

حیا اور تقویٰ وہ اندرونی چوکیدار ہیں جو والدین کی غیر موجودگی میں بھی اللہ کے حکم سے بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ حیا وہ قوت ہے جو انسان کو فحشا اور منکرات سے روکتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''ہر دین کا ایک وصف ہوتا ہے اور اسلام کا وصف حیا ہے۔'' (ابن ماجہ)

حیا کا جذبہ اللہ نے انسان کے اندر ودیعت کیا ہے جن معاشروں میں فحشا و عریانی فروغ پا چکی ہے وہاں اس جذبے کو بچپن سے ختم کیا جاتا ہے۔

''جذبۂ حیا اُس وقت تک انسان میں موجود رہتا ہے جب تک اس کا ماحول اس کی فطرت کے مطابق رہے۔ خلافِ فطرت ماحول میں کچھ عرصہ فطرت مزاحمت کرتی ہے البتہ مسلسل ترغیب و تعلیم یا جبر اس میں تبدیلی کا باعث بن جاتا ہے۔

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان کتنا سچا ہے کہ ''بچہ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔''

☆ اپنے بچوں کو دین فطرت، دین اسلام، دین حیا پر قائم رکھنے کے لیے چھوٹی عمر میں بھی ان کے ستر کا خیال رکھا جائے۔ دوسروں کے سامنے ان کے کپڑے نہ بدلے جائیں، برہنہ پھرنے کی حوصلہ شکنی کی جائے، دوسروں کی موجودگی میں غسل نہ کرایا جائے۔ وغیرہ۔

☆ جب بچے نماز کی عمر کو پہنچیں تو انہیں پورے کپڑے پہننے کا پابند کیا جائے۔ پانچ سال کی عمر میں لڑکوں کو بھی

ضائع ہوا تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی حاجرہ نے ''ہیلو'' کہا تو دوسری جانب سے ممتاز بلکنے اور رونے لگی۔

''نگی بیگم صاحبہ، مجھے معاف کر دو، میں نے آپ پر بڑا ظلم کیا۔ تھوڑے سے پیسوں کے لالچ میں آکر میں آسیہ بی بی کی باتوں میں آگئی اور انہیں خوش کرنے کے لیے میں نے آپ کو سیڑھیوں سے دھکا دیا اور آپ کا بچہ ضائع ہو گیا۔ میں نے ہی آسیہ بی بی کی مدد کر کے انہیں آپ کے گھر میں تعویذ رکھنے کا موقع دیا تھا مگر میں بھول گئی تھی کہ بے شک آپ کو تو کچھ معلوم نہیں ہوگا مگر اللہ تو سب دیکھ رہا ہے، اسے تو ہر بات معلوم ہے۔ جو شخص خود اپنا بدلہ نہیں لے سکتا تو اس کا انتقام اس کا رب لیتا ہے۔ مجھ سے بھی اللہ نے آپ کا بدلہ لے لیا ہے۔ میرا جوان بیٹا سانپ کے کاٹنے سے مر گیا، اس سے چھوٹا دوسرا بیٹا ہیضے کی وجہ سے اسپتال میں چل بسا، تیسرے بچے پر کسی ہوائی مخلوق نے حملہ کر دیا اور وہ پاگل ہو کر گلیوں میں آوارہ پھرنے لگا۔ میں اسے بلانے جاتی ہوں تو مجھے پتھر مارتا ہے۔ میری حاملہ بیٹی کو اس کے شوہر نے اتنا مارا کہ اس کا حمل ساقط ہو گیا، وہ بانجھ ہو گئی تو اس کے شوہر نے اسے طلاق دے کر گھر بھیج دیا۔ میرا شوہر نشے پر لگ گیا اور کام دھندا چھوڑ کر گھر بیٹھ گیا، وہ نشے کے لیے پیسے مانگتا ہے، نہ دے سکوں تو مجھ پر وحشیانہ تشدد کرتا ہے۔ ایک دن اسی پریشانی میں کہیں چلی جا رہی تھی تو ایک کار والے نے مجھ پر گاڑی چڑھا دی اور خود فرار ہو گیا۔ لوگوں نے مجھے اٹھا کر اسپتال پہنچایا لیکن وہاں ڈاکٹروں کو میری دونوں ٹانگیں کاٹنی پڑیں۔ جن پیسوں کے لالچ میں آکر میں نے آپ کے ساتھ ظلم کیا تھا تو اس وقت میں یہ بات بھول گئی تھی کہ یہ پیسے ساری زندگی تو نہیں چلیں گے، پھر جب ختم ہو جائیں گے تو اس وقت میرا کیا ہوگا۔ اب مجھے کسی نے ترس کھا کر معذوروں والی ہتھ ریڑھی بنوا دی ہے جسے میری بیٹی چلاتی ہے اور میں بھیک مانگ کر اپنا گزارہ کرتی ہوں، وہ تو شکر

ایسی نیکر نہ پہنائیں جو اُن کا ستر پوری طرح نہ ڈھکتی ہو۔ لڑکیوں کی شارٹس، نیکر وغیرہ پانچ سال سے قبل ہی ختم کر کے مکمل لباس کی عادت ڈالی جائے۔

☆ بچیوں کو بلوغت سے قبل دوپٹا، اسکارف لینے کی عادت پختہ کرائی جائے تا کہ بلوغت کے وقت ان کو مشکل نہ ہو۔ اولاً نماز کی عمر میں نماز کے وقت دوپٹے کی عادت ڈالیں۔

☆ بچوں کو سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قصص الانبیاء، سیرت صحابہ اور اکابر مسلمانوں کی سیرت کی کہانیاں اس طرح سنائی جائیں کہ وہ ان کو رول ماڈل بنائیں اور ان کے نقشِ پا پر چلنے کی کوشش کریں۔ ان واقعات کو آج کی زبان میں اور آج کے حالات پر منطبق کر کے سنائیں۔ خصوصاً وہ واقعات جن میں صحابہ کرام اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت میں لپکتے نظر آتے ہیں۔

بچوں میں جنت کا شوق اور دوزخ سے بچنے کی تڑپ پیدا کرنے کے لیے جنت اور دوزخ کی کہانیاں بھی بکثرت سنائیں۔

الغرض بچوں میں توحید، خشیت الٰہی اور تقویٰ پیدا کردیں۔ ان شاء اللہ ان صفات کے ذریعے اللہ ان کی ہر جگہ حفاظت فرمائے گا۔

تحریر: ڈاکٹر رخسانہ جبیں

انتخاب: خوشبو نور محمد، کراچی

ہے کہ میری بیٹی بھینگی، بدصورت اور بدبودار ہے ورنہ میں اپاج اس معاشرے کے درندوں سے کیسے بچا پاتی۔'' اتنا سب کہنے کے بعد ممتاز ایک بار پھر بلک، بلک کر رونے لگی۔

''کتنے پیسوں میں تمہارا گزارہ ہو جائے گا...... میں بھجوا دیا کروں گی۔'' حاجرہ نے اس سے پوچھا۔

''میں نے آپ کو پیسوں کے لیے نہیں بلکہ معافی مانگنے کے لیے فون کیا ہے۔ اللہ کے واسطے مجھے معاف کردیں...... آسیہ بی بی خود تو مزے میں ہوں گی مگر میری زندگی جہنم سے بدتر ہے۔'' ممتاز نے کہا۔

''ایسا نہیں ہے، آسیہ بھی اپنے کیے کی سزا اسی دنیا میں کاٹ رہی ہیں اور ان کی حرکتوں کی وجہ سے ان کی بیٹیاں بھی آزمائشوں سے گزر رہی ہیں۔'' حاجرہ کی زبان سے جانے کیسے یہ جملے پھسل گئے تھے۔

''کیا مطلب...... تینوں بچیاں کیسی ہیں؟'' ممتاز نے بے تابی سے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے آسیہ بی بی کو...... مرحا بی بی کیسی ہیں؟'' اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات پوچھ لیے۔

''تمہاری مرحا بی بی اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں اور آسیہ اسپتال میں کومے کی کیفیت میں ہیں۔ ان کے لیے دعا کیا کرو۔'' حاجرہ نے بتایا۔

''کیا...... مرحا بی بی......!'' ممتاز پھر پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

''چلو خیر آسیہ بی بی تو اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہیں مگر مرحا بی بی تو اتنی اچھی تھیں، انہیں کس بات کی سزا ملی ہے۔'' ممتاز خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

''تم اپنی بیٹی سے کہو کہ میرے نمبر پر تمہارا ایڈریس بھیج دے یا اگر ایزی پیسہ اکاؤنٹ ہے تو وہ بھیج دے، میں کچھ رقم بھجوا دیتی ہوں۔'' حاجرہ نے کہا اور فون بند کردیا۔

☆☆☆

رات کا وقت تھا۔

زونی ٹیرس پر گئی ہوئی تھی جہاں گملوں میں لگی رات کی رانی سے مسحور کن مہک اٹھ رہی تھی۔ دن بھر حبس رہنے کے بعد اس وقت ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر پورا چاند طلوع ہو چکا تھا مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے آدھے حصے کو سیاہ بادلوں نے ڈھانپ لیا۔

فضا پر اک عجیب پُراسرار سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ٹیرس سے نظر آنے والے گیٹ پر اپنے کیبن کے ساتھ گھر کے گارڈز مستعد کھڑے تھے۔

ازنا اپنے بیڈ روم میں عرشان سے کال پر بات کر رہی تھی اور اس سے باہر کہیں ملنے کا پروگرام بنا رہی تھی تاکہ دونوں بیٹھ کر مرحا کے چہلم کے بعد یہ بات طے کر سکیں کہ عرشان کی والدہ کو ازنا کے رشتے کے لیے کب بدر الدین کی طرف آنا چاہیے اور کس طرح بات کو آگے بڑھانا چاہیے۔ ابھی دونوں بات چیت کر ہی رہے تھے کہ فضا میں زونی کی دردناک چیخ سنائی دی۔ ازنا فوراً فون بند کر کے ٹیرس کی طرف دوڑی جہاں زونی انگلی سے لان کی طرف اشارہ کر کے زور سے چیخیں مار رہی تھی۔

ازنا نے اس جانب غور سے دیکھا مگر اسے تو وہاں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا جبکہ زونی مسلسل اسے ''وہ دیکھو...... وہ دیکھو'' کر کے ایک جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں جا رہی ہوں اس کے پاس۔'' اتنا کہتے ہی زونی ٹیرس سے نیچے چھلانگ لگانے کے لیے لپکی مگر ازنا نے آگے بڑھ کر فوراً ہی اسے دبوچ لیا۔

''زونی آپی...... پلیز...... وہاں کچھ نہیں ہے، اندر چلو۔'' ازنا نے پورا زور لگاتے ہوئے زونی کو اندر لے جانے کی کوشش کی مگر زونی کسی طرح قابو میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ازنا کو چھاڑ کر پیچھے کی طرف دھکیلا اور خود ٹیرس کی گرل پکڑ کر نیچے کودنے کو تیار تھی۔

گارڈز بھی پوری طرح مستعد ہو چکے تھے اور ادھر ہی متوجہ تھے اور پکار کر دونوں سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا۔

ازنا چلا کر پاپا کو پکار رہی تھی مگر شاید نیچے بیڈ روم تک اس کی آواز نہیں جا رہی تھی۔

''اکرام چاچا...... پاپا کو بلائیں جلدی۔'' ازنا نے ایک گارڈ کو پکارتے ہوئے کہا اور خود زونی کو ٹیرس کی گرل سے پیچھے کھینچنے کی کوشش کرنے لگی مگر دبلی پتلی نازک اندام سی زونی میں جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ ازنا کے قابو ہی نہیں آ رہی تھی۔

''چھوڑو...... مجھے جانے دو اس کے پاس......!'' زونی نے ایک جھٹکے سے ازنا کو دور پھینکا اور دوبارہ ٹیرس کی گرل کو پکڑ کر نیچے لٹکنے کو تھی کہ اچانک کسی خیال کے تحت زونی کی آنکھیں چمکنے لگیں اور وہ پلٹ کر ازنا کی طرف دیکھنے لگی۔

اس کی آنکھوں میں اس لمحے عجیب شیطانی چمک تھی اور لبوں پر استہزائیہ ہنسی۔

ازنا، زونی کا یہ روپ دیکھ کر اندر سے کانپ اٹھی۔

اس کی نظروں میں ازنا کے لیے شناسائی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر کوئی شیطانی روح حلول کر گئی ہو۔ دفعتاً وہ چہرے پر اک خبیث تبسم سجائے ازنا کی طرف بڑھی تو ازنا اس کا ارادہ بھانپ کر لرز اٹھی۔

''نہیں......زونی...... آ...... پی......ن......نہ......نہیں......!'' ازنا باقاعدہ کپکپا رہی تھی۔

(جاری ہے)

Digest Novels Lovers group

اپنے گھر کی چاہ

رشتوں کے اتار چڑھاؤ کی خوب صورت داستان،

عفت گل اعزاز کے قلم سے

Digest Novels Lovers group

اینہ اپنے شوہر مدثر کے ساتھ بہت خوش تھی۔ مدثر سادہ مزاج اور محبت کرنے والا انسان تھا۔ شادی کے بعد کچھ دن گھر کا ماحول بڑا اچھا رہا اس کے بعد وہی روایتی ساس بہو کے جھگڑے شروع ہو گئے۔

اماں اکثر اینہ کو برا بھلا کہتیں۔ اینہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے، وہ اپنا قصور سوچتی رہ جاتی۔ مدثر یہ دیکھ کر پریشان ہوجاتا۔

”مدثر، تم اپنا الگ انتظام کرلو۔“ ایک دن اماں

نے غصے سے کہا۔ مدثر چپ کا چپ کھڑا رہ گیا۔

''اب ہم کہاں رہیں گے؟'' امینہ پریشان ہوگئی۔

''پریشان نہ ہو۔ اللہ کی زمین پر کہیں نہ کہیں ٹھکانا مل جائے گا۔'' مدثر نے تسلی دی۔

کچھ تلاش کے بعد ایک مکان کا چھوٹا حصہ کرایے پر مل گیا۔ یہ صرف ایک کمرا اور چھوٹا سا برآمدہ تھا مگر امینہ خوش ہوگئی۔

''یہ ہمارا گھر ہے، یا اللہ تیرا شکر ہے۔'' امینہ کو مسرور دیکھ کر مدثر بھی مطمئن ہوگیا۔

مدثر نے دفتر میں اوور ٹائم لگانا شروع کر دیا۔ امینہ نے سلائی مشین پر کپڑوں کی سلائی شروع کر دی، آمدنی میں کچھ اضافہ ہوگیا۔ سال بعد ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ امینہ کے دل میں اپنے گھر کی خواہش پلنے لگی۔ وہ اللہ سے دعا مانگتی۔

''یا اللہ ہمیں اپنا گھر دے دے، کب تک کرایے کے مکانوں میں رہیں گے۔'' چند مہینے گزرے تھے کہ مالک مکان نے گھر خالی کرنے کو کہا۔

''یا اللہ...... ہم کہاں جائیں گے۔'' امینہ گھبرا گئی۔ بڑی تگ و دو کے بعد بس چھوٹا سا گھر مل گیا جو شہر سے کافی دور تھا۔ امینہ اللہ میاں سے گڑگڑا کر دعا مانگتی۔

''یا اللہ...... اپنا گھر دے دے۔'' دو سال بعد انہیں پھر مکان بدلنا پڑا۔ انہیں یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کب مالک مکان ان سے گھر خالی کرالیں۔ ابھی چھ مہینے ہوئے تھے کہ انہیں پھر گھر چھوڑنے کا حکم مل گیا۔ وہ بہت تنگ ہونے لگی۔

''یا اللہ کب گھر ملے گا۔ ایسا گھر جہاں سے کوئی ہمیں نکلنے کو نہ کہے۔'' چند دن بعد مدثر نے بتایا کہ انہیں دفتر کی طرف سے مکان ملنے والا ہے اور یوں وہ لوگ نئے مکان میں چلے گئے۔ یہ مکان دو کمروں، برآمدے اور صحن پر مشتمل تھا۔ باہر چھوٹی سی کیاری تھی وہاں کچھ پھولدار پودے لگے ہوئے تھے شام کے وقت وہ کیاری کے قریب کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ چائے پیتے اور ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھاتے۔ امینہ کا دل خوش ہو جاتا۔

''میرے دل میں جو خوشی اور اطمینان ہے، یہ میرے رب کا کرم ہے۔'' وہ سوچتی۔

جب بھی وہ بس یا رکشے میں سفر کرتی اور ایسے علاقوں سے گزرتی جہاں امیر لوگوں کی بڑی، بڑی کوٹھیاں تھیں۔ کئی منزلہ عمارتیں، ان کے بڑے، بڑے گیٹ، خوب صورت جھاڑ فانوس، ہرے بھرے کشادہ لان، بڑی، بڑی گاڑیاں گیٹ پر باوردی گارڈ دیکھ کر وہ سوچتی۔

''یا اللہ مجھے ایسی شاندار کوٹھیوں سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں تو اپنے دو کمروں والے گھر میں خوش ہوں۔ بہت خوش ہوں۔ یا اللہ میرا شوہر اور میرے بچے میرے پاس ہیں تو یہ چھوٹا سا گھر میرے لیے جنت سے کم نہیں وہ شوہر جس کی آنکھوں میں محبت کے دیے جلتے ہیں، جس کے وجود سے میرے دل کو چین ہے اور میرے بچے میری زندگی میں خوشبو کے رنگ بھرتے ہیں۔ یارب! تیرا شکر ہے، ہماری خوشیوں کو سلامت رکھنا۔''

کچھ عرصے بعد مدثر کی ترقی ہوگئی۔ انہوں نے شہر کے اچھے علاقے میں دو پلاٹ خرید لیے۔ ایک پلاٹ پر کچھ عرصے میں مکان بنا لیا۔ یوں وہ اپنے ذاتی مکان میں رہنے لگے۔ امینہ کو اپنے گھر میں خوشی کا بے پایاں احساس ہوا۔ اپنا گھر کیسا ہوتا ہے اسے اب پتا چلا۔ وہ دیواروں پر محبت سے ہاتھ پھیرتی، کھڑکی دروازوں کو دیکھتی تو دل میں خوشی کے چراغ سے جل اٹھتے۔

''یہ مکان اور پلاٹ میں نے تمہارے نام کر دیا ہے امینہ......''

''کیوں؟ آپ ہیں ان کے اصل مالک! آپ کی محنت کی کمائی ہے۔'' امینہ نے کہا۔ ''مجھے نہیں چاہیے یہ سب......''

''ہاں، میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں، یہ گھر بھی تمہارا ہے اور یہ پلاٹ بھی، تم مالکن بن کے رہو۔ عزت سے رہو سر اٹھا کے جیو۔ تم کبھی کسی کی محتاج نہیں رہو گی۔''

digest library.com

''مدثر، آپ کو اللہ سلامت رکھے، آپ میرے ساتھ ہیں تو مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیے۔'' امینہ کی آنکھوں میں نمی دوڑ گئی۔

''ہاں، ہاں! میں ہوں تمہارے ساتھ۔'' انہوں نے امینہ کے کندھے کو محبت سے تھپتھپایا اور سوچنے لگے۔ ''کل کیا ہوگا یہ کس نے جانا؟ مگر میں اپنی زندگی میں اپنی وفا شعار بیوی کے لیے کچھ کر جاؤں...... کل کو اسے کوئی تکلیف نہ ہو اسے کوئی محتاجی نہ ہو۔''

بچے بڑے ہو رہے تھے۔ بڑا بیٹا فاروق انجینئر بن گیا۔ اسے سعودی عرب میں اچھی ملازمت مل گئی۔ وہ وہاں چلا گیا۔ چھوٹا ذیشان ڈاکٹر بن گیا۔ بڑی بیٹی عاصمہ کی تعلیم مکمل ہوئی تو اس کی شادی کر دی، وہ اپنے شوہر کے ساتھ جرمنی چلی گئی۔ دوسری بیٹی عذرا کی بھی شادی ہو گئی۔ تیسرا بیٹا رضوان بھی ملازمت کرنے لگا۔ اس کی بیوی حمیرا، ان کے بچے اب اسی گھر میں ان کے ساتھ رہتے تھے۔ ابھی سنبل کالج میں تھی۔ سب سے چھوٹا عدنان اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا چلا گیا۔ وہ دونوں اپنے بچوں کی کامیابیوں پر اللہ کا شکر ادا کرتے تھے۔

اتوار کے دن امینہ سب بچوں کو گھر پر بلاتیں۔ اچھے، اچھے کھانے پکاتیں گھر میں عید کا سا سماں ہوا۔ امینہ اور مدثر سب کو دیکھ کر خوش ہوتے۔ امینہ ان سب کے لیے اچھے، اچھے تحفے خریدتیں۔ بیٹی کے ہاتھ میں کچھ رقم تھما دیتیں۔ جب بیٹوں کے گھر جاتیں تو ان کے لیے اچھے تحائف لے کر جاتیں۔ عید بقر عید پر جب سب بچے گھر آتے تو خوب رونق ہو جاتی۔

امینہ کے ہاتھ میں پیسہ نہیں رکتا تھا۔ انہوں نے دوسرا پلاٹ اچھی قیمت پر بیچ دیا اور سب بچوں کو ان کا حصہ دے دیا۔

''امی! آپ کو اتنی جلدی کیا ہے پلاٹ بیچنے کی؟'' عاصمہ نے جرمنی سے فون کر کے کہا۔

''لو...... کیا یہ پلاٹ میں اپنے ساتھ قبر میں لے کر جاؤں گی؟ اچھا ہے یہ پیسہ تم لوگوں کے کام آئے۔ بس ہماری تو یہی خواہش ہے کہ تم سب بہن بھائی خوش رہو۔''

ایک دن مدثر دفتر سے آئے تو انہیں بخار تھا۔ امینہ نے انہیں بخار کی دوا دے دی۔ مگر بخار نہ اترا۔ اگلی صبح ان کے لیے قیامت کی خبر لے کر آئی یہ کیسا بخار تھا۔ مدثر کی جان لے گیا۔ امینہ کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔

''وہ ایسے کیسے جا سکتے ہیں، مجھے بتائے بغیر؟ میرے بارے میں کچھ نہیں سوچا کہ میرا کیا ہوگا؟'' وہ حیرت زدہ تھیں۔

''یہ کیا ہو گیا......؟ کیوں ہو گیا......؟ آگے کیا ہو گا؟ کیسے جیوں گی ان کے بغیر......؟'' اس موقع پر سب بچے گھر آ گئے۔ سب ماں کو تسلی دے رہے تھے۔ چند روز بعد فاروق، ذیشان چلے گئے۔ عاصمہ، عذرا، سنبل ماں سے لگ کر بیٹھی رہتیں۔

''امی آپ اکیلی نہیں ہیں، ہم سب ہیں آپ کے ساتھ۔''

''کب تک رکیں گی میرے پاس......؟ سب کے اپنے، اپنے گھر ہیں...... اپنی ذمے داریاں ہیں۔'' وہ سوچتیں عاصمہ بہت ضد کر رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ جرمنی چلیں مگر امینہ نے منع کر دیا۔ دو ہفتے بعد عاصمہ جرمنی واپس چلی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد عذرا بھی چلی گئی۔ گھر میں سناٹا چھا گیا۔ رضوان رات گئے دفتر سے واپس آتا۔

ایک دن عذرا اپنے بچوں کے ساتھ گھر آئی ہوئی تھی۔ حمیرا کچن میں کھانا پکا رہی تھی۔ اس کے اور عذرا کے بچے صحن میں کھیل رہے تھے۔ کھیل، کھیل میں بچوں کی لڑائی ہو گئی۔ حمیرا نے عذرا کی بیٹی کو تھپڑ مارا۔

''بھابی آپ نے میری بچی کو اس لیے مارا کہ آج میرا باپ ہمارے سر پر نہیں رہا۔'' عذرا روتے ہوئے بولی۔

''اس نے میرے بچے کو دھکا دیا، مارا پیٹا اور گالیاں دیں۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔'' عذرا ناراض ہو کر گھر جانے لگی۔ امینہ نے اسے چپ کرایا۔ تسلی دی۔

''بیٹا، تمہارے باپ نہیں ہیں مگر میں تو ہوں! یہ تمہاری ماں کا گھر ہے۔ یہ دروازے تم سب بچوں

کے لیے کھلے ہیں۔ چلو بیٹھ جاؤ...... درگزر سے کام لو...... چھوڑو میں سمجھاتی ہوں حمیرا کو۔'' مگر عذرا شام تک چلی گئی تھی۔

''ماما نے پھپو کی بیٹی کو مارا تھا وہ رو رہی تھیں۔'' رضوان دفتر سے آیا تو بیٹی نے اسے بتایا۔

''تم نے یہ کیا کیا؟ بچی کو کیوں مارا؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا؟'' رضوان نے اسے ڈانٹا۔

''سارے گھر کا کام کرتی ہوں...... دن بھر کاموں میں لگی رہتی ہوں۔ آپ مجھے ہی ڈانٹ رہے ہیں۔''

''اس بات کا گھر کے کاموں سے کیا تعلق ہے؟'' رضوان غصے سے بولا۔ ''کام کرتی ہو تو کوئی احسان نہیں ہے...... سب عورتیں کرتی ہیں۔''

''اچھا...... میں سب کی خدمتیں بھی کرتی رہوں اور ڈانٹیں بھی کھاؤں؟'' وہ بگڑ کر بولی۔ ''میں یہاں نہیں رہوں گی بس...... میں جا رہی ہوں اپنی اماں کے گھر......''

''شوق سے جاؤ......'' رضوان نے جل کر کہا۔ حمیرا تینوں بچوں کا ہاتھ تھام کے چلی گئی۔ امینہ کو بہت افسوس ہوا۔ وہ سوچنے لگیں۔ یہ وہ وقت تھا جب حمیرا کو ساس نندوں کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے تھا مگر وہ تو اتنی سی بات پر آگ بگولا ہوگئی اور گھر چھوڑ کر چلی گئی۔

گھر میں سنبل اور امینہ رہ گئیں۔ امینہ گھر کے کام کاج میں لگی رہتیں۔ سنبل کے امتحان ہو رہے تھے۔ جبھی سنبل کے لیے ایک اچھا رشتہ آگیا۔ امینہ نے سب بچوں سے رائے مشورے کے بعد اس کی شادی طے کردی۔ عذرا، ذیشان اور اس کی بیوی غزالہ شادی کی تیاریوں میں لگ گئیں۔ امینہ نے حمیرا کو فون کر کے بلایا بلکہ رضوان کو بھیجا۔ وہ بالآخر آگئی۔ اس نے سنبل کی شادی میں ہاتھ بٹایا۔ شادی کا دن آیا۔ عدنان نہیں آسکا باقی سب بہن، بھائی اکٹھے ہوئے۔ سب کو اپنے والد کی کمی محسوس ہو رہی تھی مگر صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ شادی خیر وخوبی سے ہوگئی۔ شادی کے بعد سب بیٹے، بیٹیاں اپنے، اپنے گھروں کو جانے لگے۔ امینہ گھر میں اکیلے رہ جانے سے گھبرا رہی تھیں۔

''حمیرا بیٹی اب تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ...... دیکھو میں یہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟ گھر تمہارے بغیر سنسان پڑا ہے۔'' انہوں نے حمیرا سے کہا۔

''آپ نے کہہ دیا بس میں نے مان لیا...... آپ اکیلی کیوں رہیں گی۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔'' امینہ کو اطمینان ہوگیا۔

کچھ دن بعد عذرا آئی اور بہت اصرار سے ماں کو اپنے ساتھ لے گئی۔ وہاں عذرا اور اس کے میاں نے امینہ کا بہت خیال رکھا۔ امینہ کے دل کو اطمینان ملا۔ ایک ہفتے بعد وہ اپنے گھر آگئیں۔

جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئیں تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں کوثر اور لبنیٰ کی چارپائی پڑی ہے، ان کی میز اور کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ امینہ کچھ پریشان ہوئیں مگر منہ سے کچھ نہیں بولیں۔ دوپہر کو رضوان کے بچے کمرے میں آجاتے خوب شور مچاتے ان کے آرام میں خلل پڑتا۔ ان کی نیند خراب ہوجاتی۔ وہ صبر سے کام لیتیں اور بچوں کو کچھ نہ کہتیں۔

ایک دن امینہ نے دیکھا ان کا پلنگ باہر برآمدے میں رکھ دیا گیا تھا۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ کسی سے کوئی شکایت نہیں کریں گی...... زندگی کے تھوڑے سے دن باقی ہیں، بس گزر ہی جائیں گے...... رضوان رات کو دیر سے گھر آیا۔ امینہ اپنے بستر پر سوچکی تھیں۔ رات کو کسی وقت بارش ہوگئی، ٹھنڈی ہوا اور پانی کی بوچھاڑ نے انہیں بھگو دیا۔ سخت سردی لگی۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر کوثر اور لبنیٰ سوچکی تھیں۔ دروازہ نہ کھلا...... وہ اسی چارپائی پر چادر اوڑھ کر بیٹھ گئیں۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ تمام رات اسی طرح آنکھوں میں کٹ گئی۔ صبح کا اجالا پھیلا۔ رضوان نے دیکھا وہ سردی سے ٹھٹھر رہی تھیں۔ سخت بخار اور جسم میں درد سے کراہ رہی تھیں۔ رضوان کو بہت غصہ آیا۔

''سب آرام سے سو رہے تھے کمروں کے اندر اور امی بارش میں بھیگتی رہیں، تم لوگوں کو ان کا خیال کرنا

Digest Library . Com

چاہیے تھا۔ شرم کرو......" اس نے حمیرا سے کہا۔

"تم بھی آرام سے سوتی رہیں اور میری ماں بارش میں بھیگتی رہیں۔ افسوس ہے تم پر......"

"ہمیں کیا پتا تھا کہ رات میں بارش ہو جائے گی۔" حمیرا نے جواب دیا۔ "ہم نے چار پائی اس لیے باہر رکھ دی تھی کہ کمرے میں گرمی ہوتی ہے۔ باہر ہوا ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔"

رضوان انہیں لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ اس نے انجکشن لگایا، دوا دی اور تاکید کی کہ انہیں آرام کرنے دیں۔ امینہ کا دل دکھ گیا۔

"یہ ہے میری حیثیت...... اب اس گھر میں میری کوئی جگہ نہیں رہی۔ اگر جگہ ہے تو رضوان اور اس کے بیوی، بچوں کی۔ مدثر تو یہ مکان میرے نام کر کے گئے تھے۔ یہ میرا گھر ہے۔ بلاشرکتِ غیرے میرا ہے۔ ہم نے تو رضوان کو بھی اس کا حصہ دے دیا تھا اور چاہتے تھے کہ رضوان اور اس کی فیملی یہاں میرے ساتھ پیار محبت سے رہے۔ مگر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ مجھے گھر سے نکالنے کی ترکیبیں ہو رہی ہیں۔" دل پر بڑے زور کی چوٹ لگی۔ کچھ کھانے پینے کو جی چاہا نہ کسی کام میں دل لگا۔

دوپہر کو ان کی ایک پڑوسن عارفہ آ گئیں۔ ان کی بات سن کر بولیں۔

"امینہ...... یہ بڑا برا وقت ہے۔ یہاں کسی کا بھروسا نہیں...... ہر کوئی اپنا فائدہ ڈھونڈتا ہے۔ ہر کوئی خودغرض ہو چکا ہے۔ آپ نے حمیرا کو یہاں بلا کر ٹھیک نہیں کیا۔ وہ بہت تیز مزاج ہے۔"

"مدثر کے سامنے اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ مجھ سے کوئی بدتمیزی کرتا...... اگر میں اسے نہیں بلاتی تو میرا رضوان پریشان رہتا۔ میں بھلا اس کا خیال نہ کرتی اور میں کیسے اکیلی رہتی؟"

"آپ رضوان سے بات کریں!" عارفہ نے مشورہ دیا۔ "وہ ضرور آپ کا خیال کرے گا۔"

"ہاں کروں گی!" امینہ نے کہا۔ "وہ مجھ سے

یاد رکھیں

☆ وہ لوگ دوریوں کے ہی قابل ہیں جنہوں نے آپ کی نزدیکیوں کی قدر نہ کی۔

☆ اخلاقیات کا یہی تقاضا ہے، کسی کی زندگی میں اتنا ہی تعلق رکھو جتنا وہ آپ کو اجازت دے۔

☆ راستے پر کنکر پڑے ہوں تو پرانا جوتا پہن کر بھی بہ آسانی چلا جا سکتا ہے لیکن جوتے کے اندر ایک بھی کنکر موجود ہو تو اچھی سڑک پر بھی چلنا محال ہوتا ہے۔

☆ ہم باہر کی مشکلات سے نہیں، اپنے اندر کی کمزوریوں سے ہارتے ہیں۔

☆ ہمارا تعلق ایسے منافق معاشرے سے ہے جہاں اختلاف رکھو تو بدتمیزی، سچ بولو تو بے ادبی، چپ رہو تو منافقت اور حقائق بتاؤ تو ناراضی کا سامنا ہوتا ہے۔

مرسلہ: اسما شاہد، لاہور

خلیل جبران کہتے ہیں

☆ تمہاری فطرت تمہیں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کہتی ہے کہ ایلیٹ کلاس اور امیر کبیر خاندانوں سے رشتے جوڑے جائیں۔

میرا تخیل مجھے کہتا ہے کہ میں صرف اپنے آپ پر بھروسا کروں۔

☆ تمہارا خیال تمہیں کہتا ہے کہ تم حسین محلوں میں رہنے کے خواب دیکھا کرو، جن کا فرنیچر اور گھریلو سامان نایاب ہو اور فن کاری کا بہترین نمونہ ہو اور ان محلوں کے پردے الف لیلوی تاروں سے بُنے گئے ہوں۔

میرا تخیل مجھے کہتا ہے کہ میری روح اور میرا جسم اتنا پاکیزہ ہونا چاہیے کہ مجھے یہ بھی پروا نہ رہے کہ میں اپنا سر کہاں ٹیکوں۔

مرسلہ: نازنین حبیب، لاہور

بہت محبت کرتا ہے۔''
امینہ نے رضوان سے بات کی۔ اس نے امینہ کی چارپائی واپس ان کے کمرے میں ڈال دی اور بچوں کی میز، کرسی اور چارپائی کمرے سے نکال دی۔ حمیرا کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے دوسرے کمرے میں وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔
''حقیقت یہ ہے کہ رضوان اور اس کے بچوں کو ایک اور کمرا چاہیے۔ میری وجہ سے بچے بے آرام ہوتے ہیں، یااللہ...... میں کیا کروں؟ کہاں چلی جاؤں؟'' امینہ سوچنے لگیں۔ دل کہہ رہا تھا کہ ''یہ گھر ان بچوں کے حوالے کر دو پھر خود کہاں جاؤں......؟'' دماغ نے پوچھا۔ ''خود بے گھر ہو جاؤں؟ کیا کہیں فٹ پاتھ پر دری بچھا کے رہنے لگوں......؟ توبہ، توبہ استغفار...... یااللہ! میں کہاں چلی جاؤں؟ میں کیا کروں......؟'' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دل بہت پریشان تھا۔
''وہ ماں ہیں میری......! انہوں نے ساری عمر ہمیں دیا ہے...... بہت کچھ دیا ہے، مجھے ان کے آرام اور ان کی عزت کا خیال رکھنا ہے......'' رضوان کہہ رہا تھا...... ''اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہو گئی تو مجھے اللہ معاف نہیں کرے گا۔''
''ہاں تو کوئی میرا آرام کا بھی خیال رکھے۔ گھر میں نہ کوئی نوکر ہے جو کام کاج میں میرا ہاتھ بٹا دے۔ دن بھر کھانے پکاتی ہوں، کئی، کئی دفعہ چائے بناتی ہوں، ان کا کھانا دیتی ہوں، چائے دیتی ہوں بھاگ، بھاگ کر ان کی خدمتیں کرتی رہوں؟
''بات سنو...... وہ ماں ہیں میری......'' رضوان نے کہا۔
''وہ تمہاری ماں ہیں میری نہیں...... میں کیوں ان کی ذمے داری اٹھاؤں......؟'' وہ تڑخ کے بولی۔
''ان کی اور بھی بہویں ہیں، مزے سے اپنے گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔ وہ تو ان کی کوئی خدمت نہیں کرتیں۔ ایک میں ہی لونڈی غلام بنی رہوں ......'' رضوان کو بہت غصہ آیا۔ وہ چیخ کر بولا۔
''حمیرا بکواس بند کرو...... وہ مالکن ہیں اس گھر کی، تم ان کے گھر میں رہ رہی ہو...... جب سب لوگ اکٹھے ایک گھر میں رہتے ہیں تو مل جل کر رہتے ہیں...... وہ ہر مہینے مجھے خرچہ دیتی ہیں جس سے ہمارا گھر چلتا ہے اگر تم ان کے لیے دو روٹی ڈال دیتی ہو یا چائے بنا کر انہیں دے آتی ہو تو اللہ ضرور تمہیں اس کا اجر دے گا۔ کیا بزرگوں کی خدمت کرنا بری بات ہے؟ وہ ماں ہیں، سب سے پیار کرتی ہیں، سب کو دعائیں دیتی ہیں، جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ دیکھو ایسے مت سوچا کرو...... میرا فرض ہے کہ میں ان کی خدمت کروں، بیٹا ہوں ان کا......'' رضوان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''دیکھو وہ بھی تمہارا کام میں ہاتھ بٹا دیتی ہیں، تم بازار جاتی ہو، بچوں کو ان کے پاس چھوڑ کر بے فکری سے چلی جاتی ہو۔''
''اچھا...... بیٹے تو اور بھی ہیں ان کے ...... وہ کیوں ماں کی خدمت نہیں کرتے؟'' حمیرا تیز آواز میں بولی۔ امینہ کا دل یہ سب سن کر دکھ سے بھر گیا۔
''اتنی نفرت کرتی ہے یہ مجھ سے؟''
''کوئی اور بیٹا خدمت کرے یا نہ کرے، میں کروں گا مجھے اوروں سے کوئی مطلب نہیں...... آئندہ تمہارے منہ پر یہ بات نہیں آئے ورنہ دھکے مار کر گھر سے نکال دوں گا...... تم میری ماں کی بے عزتی کرو اور ایسی گندی باتیں کرو...... یہ میں برداشت نہیں کروں گا...... سمجھیں......'' رضوان نے اسے لتاڑ دیا۔
''ہائے اللہ......! اسے تو میرا وجود اس گھر میں گوارا نہیں......'' امینہ کا دل مضطرب ہو گیا۔
ایک طرف اپنا آرام اور دوسری طرف بیٹے کی مشکلات...... حالات کبھی اتنے تلخ ہوں گے...... انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ساری رات دل بے چین رہا۔
''امی کیسی طبیعت ہے؟ آپ ٹھیک ہیں ناں؟'' صبح عذرا کا فون آیا۔ اس نے پوچھا۔
''ہاں طبیعت تو ٹھیک ہے مگر دل پریشان ہے...... کچھ اچھا نہیں لگ رہا......''

''امی آپ میرے پاس آجائیں، بچے بھی آپ کو یاد کررہے ہیں، آپ گھر سے نکلیں گی تو دل بہل جائے گا......آپ کے پانچ، چھ گھر ہیں......آپ کے بچوں کے گھروں میں آپ کے لیے جگہ کی کوئی کمی نہیں......آپ میرے پاس ہوتی ہیں تو گھر میں رونق ہو جاتی ہے۔ آپ کے وجود سے برکت ہوتی ہے۔''

شام کو عذرا کا شوہر علی انہیں لینے آگیا۔ وہ چند دن وہاں رکیں پھر گھر واپس آگئیں۔ دو دن بعد ذیشان انہیں لینے آگیا تھا۔ انہوں نے کپڑے اور ضروری سامان لیا پھر حمیرا کے پاس گئیں اور اس سے کہا کہ میں...ذیشان کے گھر جارہی ہوں، بچوں سے کہہ دینا کہ میرے کمرے میں اٹھیں بیٹھیں، آرام کریں۔'' انہوں نے فراخ دلی سے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' حمیرا نے کہا۔

ایمنہ، ذیشان کی گاڑی میں بیٹھیں اور دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں کہ ''میرے بچے میرا خیال کرتے ہیں، اللہ ان کو خوش رکھے۔'' ذیشان کی بیوی غزالہ ان کی بھانجی تھی وہ بہت خوش ہوئی اور بولی۔

''خالہ جان اب آپ یہیں رہیں، یہ آپ کا گھر ہے، آپ اور کہیں نہیں جائیں گی۔'' ایمنہ خوش بھی ہوئیں اور دل دکھ بھی گیا۔

''یا اللہ میں ایسی بے گھر ہوگئی ہوں کبھی ایک کے گھر، کبھی دوسرے کے گھر......اے اللہ مجھے عزت کے ساتھ رکھ۔''

چند دن غزالہ نے بڑی آؤ بھگت کی پھر ایمنہ نے دیکھا کہ وہ اس سے بات چیت بہت کم کرتی ہے۔ ایمنہ اپنے کمرے میں اکیلی چپ چاپ پڑی رہتیں۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں گھسی رہتی۔ موبائل پر ڈرامے دیکھتی رہتی۔ اکثر دوستوں سے فون پر گھنٹوں لمبی، لمبی باتیں کرتی۔ کبھی شاپنگ کے لیے چلی جاتی۔ بیوٹی پارلر کے چکر لگاتی۔ اس کے پاس ساس کے لیے کوئی وقت نہیں تھا۔ ایمنہ خاموشی سے یہ سب برداشت کررہی تھیں۔

''امی چلیں آج کھانا باہر کھائیں گے۔'' ایک شام ذیشان نے کہا۔

ایمنہ نے منع کر دیا۔

''تم لوگ جاؤ، میں گھر پر آرام کروں گی......''

غزالہ نے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ ایمنہ نے منع کر دیا۔ وہ دونوں بچوں کے ساتھ باہر جانے لگے تو ایمنہ کے کان میں کمرے کا دروازہ بند کرنے کی آواز آئی۔ پھر تالا ڈالنے کی آواز آئی۔ وہ لوگ باہر نکل گئے۔ ایمنہ نے دیکھا کہ غزالہ نے کمرے کے دروازے پر بڑا سا تالا لگایا ہوا ہے۔ انہوں نے سوچا ''گھر میں اور تو کوئی بھی نہیں ہے صرف ایک میں ہوں......میری موجودگی میں کمرے کو تالا لگانے کی کیا ضرورت ہے بھلا......؟ یہ تو بڑی قبیح حرکت ہے، کیا اس کو مجھ پر شبہ ہے کہ میں اس سے پیسے یا جیولری چرالوں گی؟ استغفر اللہ! کیا یہ مجھے جانتی نہیں ہے۔ پتا نہیں اسے کون پٹیاں پڑھا رہا ہے۔'' ایمنہ کے کانوں میں بار، بار دروازہ بند کرنے اور تالا ڈالنے کی آواز گونجتی رہی اور انہیں تکلیف دیتی رہی۔ ذیشان اور بچے رات دیر تک واپس لوٹے۔

ایک دن ایمنہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کررہی تھیں۔ انہوں نے دیکھا سامنے سینٹرل ٹیبل پر دو دھاتی لیمپ رکھے تھے جو کافی پرانے تھے۔ ان کا رنگ خراب ہو چکا تھا وہ کافی گندے لگ رہے تھے۔ ایک لیمپ کا شیشہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ ایمنہ نے انہیں اٹھا کر کونے والی چھوٹی میز پر رکھ دیا۔

ذرا دیر میں غزالہ کمرے میں آئی۔ اس نے لیمپ کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بہت سیخ پا ہوئی۔ بڑی ناگواری سے اونچی آواز میں بولی۔

''آپ نے یہ لیمپ کیوں اٹھائے؟ انہیں میں نے یہاں رکھا ہے، یہ میرا گھر ہے۔'' ایمنہ کو برا لگا۔

''بیٹا! یہ لیمپ پرانے ہوگئے ٹوٹے پھوٹے اور گندے لگ رہے ہیں۔ میں نے انہیں باہر نہیں نکالا بلکہ سامنے سے ہٹا کر دوسری طرف رکھ دیا ہے۔'' ایمنہ نے ملائمت سے جواب دیا۔

''مجھے یہ جگہ پسند ہے، میں نئے لیمپ لاؤں گی

digest library.com

وہ بھی یہیں رکھوں گی۔'' وہ ضدی اور تکبرانہ لہجے میں بولی۔ اور دونوں لیمپ اٹھا کر دوبارہ سامنے میز پر جما دیے۔ امینہ نے سوچا ڈرائنگ روم میں اچھی اور خوب صورت سجاوٹی اشیا رکھی جاتی ہیں اگر اس جاہل کو اتنی سمجھ ہی نہیں ہے تو میں کیا کروں؟'' وہ سمجھ گئیں کہ غزالہ نہیں چاہتی کہ وہ یہاں مزید رہیں۔

اگلے دن وہ رضوان کے پاس آگئیں۔ فاروق بار، بار فون کر کے انہیں اپنے پاس بلا رہا تھا۔ فاروق نے ان کے پاسپورٹ ویزا کا انتظام کیا۔ وہ فاروق کے ہاں سعودی عرب آگئیں۔ فاروق کی بیوی شجر ان کا بہت خیال رکھتی۔ بہت عزت کرتی، ہمیشہ ادب سے بات کرتی۔ شجر خاندان سے باہر کی لڑکی تھی۔ وہ روزانہ دیر تک ان کے پاس بیٹھتی باتیں کرتی۔ ان کے کھانے پینے کا خیال رکھتی۔ کبھی چائے کبھی گرم دودھ کبھی میوہ جات لے آتی اور اصرار کر کے کھلاتی۔ اکثر وہ لوگ گھومنے پھرتے چلے جاتے۔ فاروق نے امی کو عمرہ کرانے کا ارادہ کیا امینہ بہت خوش ہوئیں۔ مکہ میں جا کے عمرہ کیا پھر مدینہ گئے اور مسجد نبوی میں نمازیں ادا کیں اور دعائیں مانگیں۔ فاروق نے بہت سارے تحائف خرید کر دیے۔ چند دن بعد امینہ نے واپسی کا ارادہ کیا۔

''آنٹی ابھی نہ جائیں ابھی اور رہیں گھر میں کتنی رونق ہوگئی ہے۔'' شجر بولی۔

''بس اب جانا ہے۔ اتنے دن تمہارے پاس رہی، تم نے بہت خدمت کی۔ اللہ تمہیں جزائے خیر دے۔ تم بہت اچھی بیٹی ہو، اللہ تمہیں خوش رکھے۔'' امینہ نے کہا۔

''آپ کا یہاں رہنا بہت اچھا لگا۔ پھر کب آئیں گی؟'' وہ محبت سے بولی۔

''جب اللہ کو منظور ہوگا۔'' امینہ نے کہا۔ شجر کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔ امینہ نے اسے گلے لگا کر پیار کیا۔

''خوش رہو، آباد رہو!'' امینہ نے دعا دی پھر وہ فاروق کے ساتھ ائرپورٹ روانہ ہوگئیں۔

ہوائی جہاز کا سفر ختم ہوا۔ ہوائی اڈے سے قدم باہر نکالتے ہوئے وہ فکرمند ہوگئیں۔

''کہاں جاؤں گی؟ کہاں ہے میرا گھر؟ میرا کوئی گھر ہے بھی یا نہیں......؟ یا اللہ! تیری اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسی جگہ بھی ہے جسے میں اپنا گھر کہہ سکوں؟''

دل اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ لاؤنج کے باہر رضوان اور حمیرا کھڑے تھے۔ انہوں نے امینہ کو دیکھ کر ہاتھ ہلائے۔ وہ مسکرا دیں۔ رضوان نے آگے بڑھ کر سوٹ کیس تھام لیا اور گرم جوشی سے ماں کو گلے لگایا۔ امینہ نے اسے پیار کیا۔ حمیرا بھی ان کے گلے لگ گئی اور پوچھا۔

''کیسی ہیں امی؟ سفر ٹھیک گزرا؟'' حمیرا کے ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ تھا۔

''ہاں، اللہ کا شکر ہے۔'' حمیرا نے انہیں پھولوں کا گلدستہ پکڑایا۔ امینہ نے مسکرا کر گلدستہ لے لیا۔ تھوڑے سے فاصلے پر رضوان کی گاڑی کھڑی تھی۔ رضوان نے سوٹ کیس گاڑی میں رکھا۔

''امی آئیں، دیکھیے یہ گاڑی میں نے آپ کے لیے لی ہے۔'' رضوان نے کہا اور آگے کا دروازہ کھولا۔

''واہ...... ماشاء اللہ بہت مبارک ہو۔'' امینہ نے خوش ہو کر کہا۔

''یہ سب آپ کی دعاؤں کی وجہ سے ہے، آپ کو معلوم ہے ان کی ترقی بھی ہوگئی ہے۔'' حمیرا نے بتایا۔

''اللہ کا شکر ہے۔'' امینہ نے کہا۔ ''تمہیں بھی مبارک ہو۔''

وہ لوگ گھر پہنچے۔ امینہ اپنے کمرے میں گئیں تو حیران رہ گئیں۔ کمرا خوب سجا ہوا تھا۔ بستر پر نئی چادر بچھی ہوئی تھی۔ گلدان میں تازہ پھول رکھے تھے۔ نیچے خوب صورت قالین تھا۔ دیوار پر اے سی لگا ہوا تھا۔ ایک جانب ٹی وی ٹرالی پر ٹی وی موجود تھا۔ امینہ یہ سب دیکھ کر مسرور ہوگئیں۔

''امی ذرا ادھر آئیں...... یہ دیکھیں۔'' رضوان نے کہا۔ امینہ باہر آئیں تو دیکھا وہاں صحن میں ایک اور

کمرا بنا ہوا تھا۔
''یہ کمرا بچوں کے لیے بنوایا ہے۔ تاکہ یہ لوگ آپ کو پریشان نہ کریں۔ آپ کے آرام میں خلل نہ پڑے۔'' اس کمرے میں بچوں کی رائٹنگ ٹیبل کرسیاں اور کتابوں کی الماری رکھی تھی۔ لبنیٰ، کوثر اور طاہر سب آکر ملے۔
''دادی ہم آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔ آپ اتنے دنوں کے بعد آئی ہیں۔'' لبنیٰ نے کہا۔
''آپ اب کہیں اور مت جایئے گا۔'' کوثر نے کہا۔
''بس آپ اِدھر ہی رہیں۔'' طاہر نے محبت سے کہا۔
حمیرا ٹرالی میں چائے بسکٹ اور کیک لے کر آئی۔ رضوان بھی وہاں آگیا۔
'' آپ آئی ہیں تو گھر میں رونق ہو گئی۔'' حمیرا نے کہا۔ امینہ سوٹ کیس کھول کر سب کو تحفے دینے لگیں، سب خوش ہوگئے۔ سب لوگ چائے پینے لگے۔
''امی آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہو تو مجھے معاف کردیں۔'' حمیرا نے کہا۔
''نہیں، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ اللہ تم سب کو خوش رکھے۔ یہی میری دعا ہے۔'' امینہ نے حمیرا کا ہاتھ تھام کر اپنائیت سے کہا۔ سب لوگ مسرور تھے۔ امینہ نے دیکھا سب لوگ ان کے پاس موجود تھے۔ اطمینان کی ایک لہر دل میں پھیل گئی۔
''یہی تو میرا گھر ہے جہاں سب مل جل کر محبت سے رہتے ہیں۔''
دروازے پر گھنٹی بجی۔ رضوان نے دروازہ کھولا تو عدنان اندر آگیا۔ دونوں بھائی محبت سے گلے ملے۔ امینہ نے خوشی سے بے تاب ہوکر عدنان کو گلے لگالیا۔
''تم اچانک......؟''
''ہاں آپ لوگوں کو سرپرائز دینا تھا ناں......'' عدنان نے ہنستے ہوئے کہا۔
''یہ تو بہت اچھا ہوا۔'' حمیرا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہاں! اب تمہاری شادی بھی تو کرنی ہے۔'' امینہ نے کہا۔
''خیال نیک ہے۔'' عدنان نے ہنستے ہوئے کہا۔
''ٹھیک ہے بس ابھی لڑکی ڈھونڈتے ہیں۔'' حمیرا نے کہا۔
''جی ضرور!'' عدنان نے کہا اور سوٹ کیس کھول کر سب کو تحفے دینے لگا جو وہ اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔
''اور یہ میری امی کے لیے۔'' اس نے چھوٹی سی ڈبیا کھول کر سب کو دکھائی۔ اس ڈبیا میں بڑے خوب صورت ٹوپس رکھے تھے۔
''بہت خوب صورت ہیں شکریہ......'' امینہ نے کہا۔ ''پہن کے دکھائیں۔'' امینہ نے ٹاپس پہن لیے سب کو پسند آئے۔
''ہاں چائے تو پیو......'' حمیرا نے کہا۔ ''بیٹھو میں ابھی تازہ چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' حمیرا کچن میں چلی گئی۔
''امی، آپ ٹھیک ہیں، طبیعت ٹھیک ہے؟'' عدنان نے پوچھا۔
''ہاں، اللہ کا شکر ہے۔'' امینہ نے جواب دیا۔
''اچھا ہاں جلدی سے اچھی سی لڑکی ڈھونڈیں پھر آپ میرے ساتھ امریکا جائیں گی۔'' عدنان نے کہا۔
''نہیں بھئی......میں یہیں ٹھیک ہوں......'' امینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
''کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا میرا حق نہیں کہ آپ میرے ساتھ رہیں۔''
''ہاں ہے تو سہی......'' امینہ مسکرائیں۔
''بس پھر آپ میرے ساتھ چلیں گی۔'' عدنان نے خوش ہوکر کہا۔ ''بس تیاری کریں۔''
امینہ کو بیٹے کی اپنائیت اور محبت کا احساس مسرور کرگیا۔
''چلو تھوڑے دن تمہارے گھر میں رہ لیں گی ٹھیک ہے۔ مگر جلدی اپنے گھر واپس آجائیں گی۔'' رضوان نے کہا۔
''جی امی! آپ جلدی گھر واپس آجایئے گا۔'' حمیرا نے محبت سے کہا۔
''ٹھیک ہے......'' امینہ نے مسکرا کر ہامی بھرلی۔ اور بچوں کو گلے سے لگالیا۔

ایک زمانہ تھا جب گھر کی عورتیں گھر کے تمام کام خود کیا کرتی تھیں جو سر بلینڈر، چوپر، واشنگ مشین اور ایسی ہی دوسری مشینیں گھروں میں نظر نہیں آتی تھیں۔ قیمہ پیسنا ہو یا چٹنی سل بٹا استعمال کیا جاتا تھا اور مسالا کوٹنے کے لیے هاون دستہ یا پن کٹی۔ بچپن ہی سے روٹی گول بنانی سکھائی جاتی تھی، کپڑے بھی ہاتھ سے ہی دھوئے جاتے تھے، سلائی، کڑھائی، شادی بیاہ کے کپڑے سب گھر پر ہی تیار ہوتے تھے اور تو اور دلہنیں بھی گھر پر ہی تیار ہوتی تھیں۔ پارلر کا تو تصور ہی نہیں تھا۔ کیا سادہ زمانہ تھا مگر اس پر بھی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ عورتوں کو پھر بھی ٹائم مل جاتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے گھر اپنے پانچ چھ بچوں کو لے کر آرام سے چلی جاتی تھیں اور کوئی برا بھی نہیں مانتا تھا

ملکہ اور شہزادیاں

مریم شہزاد

Digest Novel Lovers Group

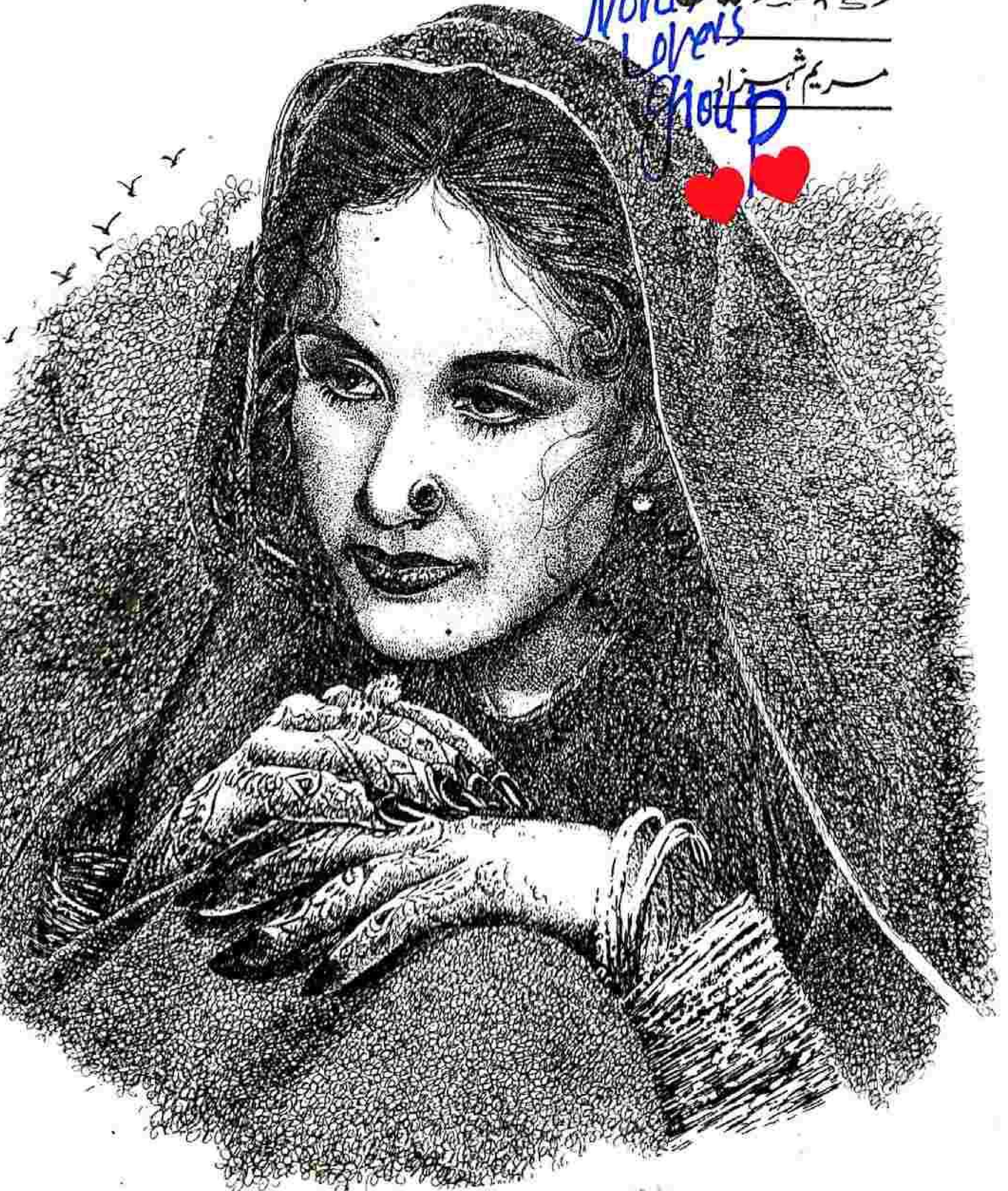

گھٹنوں بیٹھ کر سبزی بنا رہی ہیں اچار، چٹنیاں، مربے اور نہ جانے کتنی ہی چیزیں گھر پر ہی بنا لی جاتی تھیں اور ایک دوسرے کے گھر بھی بھیجی جاتی تھیں مگر اچانک ہی عورتوں کو محسوس ہوا کہ ان کے باپ کہتے تھے۔

''تم تو میری شہزادی ہو۔''

بھائی کہتا...... ''میری سوہنی بہن، میں ہوں ناں، تم کو کیا فکر......''

پھر شوہر نے کہا۔ ''تم اس گھر کی ملکہ ہو۔''

بیٹے کہتے۔ ''اماں آپ تو بس ملکہ کی طرح حکم چلایا کریں......''

اور عورتوں نے اس کے جواب میں مردوں کو آرام دینے کے بجائے خود کو واقعی ملکہ اور شہزادی سمجھنا شروع کر دیا۔

پہلے گھر میں مشینیں آئیں اور پھر ماسیاں، پہلے پہل کسی، کسی کام کے لیے بطور ہیلپر ان کام والیوں کو رکھا گیا۔ مشینوں کو ان کو ہاتھ نہیں لگانے دیا جاتا تھا مگر آہستہ، آہستہ سارے کام ان کے حوالے ہوتے چلے گئے اور اب کرنے کو کچھ نہیں رہا سبزی بنانے سے لے کر کھانا بنانے تک اور کپڑے دھونے اور گھر کی مکمل صفائی سب ماسیوں کے ہاتھ میں آ گیا اور ان ملکہ اور شہزادیوں کے پاس وقت کی کمی ہوتی گئی جب گھر کی عورت گھر سے بے پروا ہو گئی تو مردوں نے بھی گھر سے باہر وقت گزارنا شروع کر دیا۔ جگہ، جگہ چائے خانے بھی بن گئے جہاں رات گئے تک رش رہتا۔

سب بہت اچھا چل رہا تھا تم اِدھر خوش اُدھر مطمئن، سب اپنے آپ میں... مگن کسی کو کسی کی فکر نہیں...... کوئی پڑوسی بھوکا سوئے یا کسی کا بچہ فوت ہو، کہیں مسلمان پر ظلم و ستم ہو، بس چچ چچ کہا یا ایک لائک اور زندگی آگے بڑھ گئی کسی کے پاس کسی کے لیے وقت نہیں، سب یہ ہی کہتے ہم کیا کر سکتے ہیں یا ہمارے کہنے سے کیا ہوگا۔

اچانک ہی ایک تیز معاشی آندھی چلی، جس نے چائے خانوں کو اڑا کے رکھ دیا۔ کچھ کے کاروبار تباہ ہو گئے۔ تو مرد زیادہ وقت گھر پر گزارنے لگے پھر ماسیاں گاؤں جانے لگیں تو سب ملکہ اور شہزادیاں سب ہی اچانک گہری نیند سے جاگ گئیں...... ہاتھوں سے موبائل اور طوطے اڑ گئے گویا۔

ایک ہی صف میں کھڑی ہو گئیں ماں، بیٹی، بہو اور ساس
نہ ہی ڈراما رہا اور نہ فیس بک کا ساتھ

جہاں جوائنٹ فیملی سسٹم تھا وہاں تو صبر شکر سے ساس، بہو، نند، بھاوج، دیورانی، جیٹھانی نے مل جل کر کام بانٹ لیے مگر شہزادیاں اس زعم میں تھیں کہ ان کی بادشاہت قائم رہے گی اور وہ الگ گھر لے کر رہ رہی تھیں تو وہ اب پریشان کہ بچے سنبھالیں کہ گھر... گھر اور بچے تو میڈ ہی دیکھتی تھی ان کو تو بچوں کے کھانے پینے کے بارے میں بھی نہیں معلوم...... ان کے پاس ٹائم ہی کہاں تھا وہ تو اپنے آپ کو فٹ رکھنے میں اپنی ڈائٹ، کافی پارٹیوں اور شاپنگ میں مصروف تھیں۔ اب وہ کبھی امی کو فون کرتی ہیں کہ آپ نے روٹی بنانی کیوں نہ سکھائی تو کبھی سہیلی سے واشنگ مشین کے استعمال کا طریقہ پوچھتی ہیں مگر اب کسی کے پاس گھر کے کاموں سے فرصت نہیں کہ الٹے سیدھے مشورے دے اب تو چھوٹی، چھوٹی بچیوں کو بھی امیاں ساتھ کام میں لگا کر رکھتی ہیں کہ کام سیکھ لو اگلے گھر جا کر کیا کرو گی......

موبائل پیکج چیخ، چیخ کر پیکجز دے رہے ہیں مگر کوئی ان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا بیچارہ موبائل چارجنگ کے لیے راہ تکتا رہ جاتا ہے۔

ماڈرن نانی، دادی روایتی نانی دادی بن گئی ہیں جو سبزی بناتی ہیں، پوتا، پوتی، نواسا، نواسی سنبھالتی ہیں، بیٹی، بہو کو گھر سنبھالنے کے گُر بتاتی ہیں اور بچوں کو کہانی سناتی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کا ذکر ہے کہ ایک جگہ ہر گھر کی عورتیں شہزادیوں کی طرح رہتی تھیں ان کے سب کام ان کے نوکر کرتے تھے وہ صرف گھومتی پھرتی اور حکم چلاتی تھیں...... مگر نہ جانے کیوں یہ کہانی سناتے وقت ان کی آنکھیں بھیگ سی جاتی ہیں۔

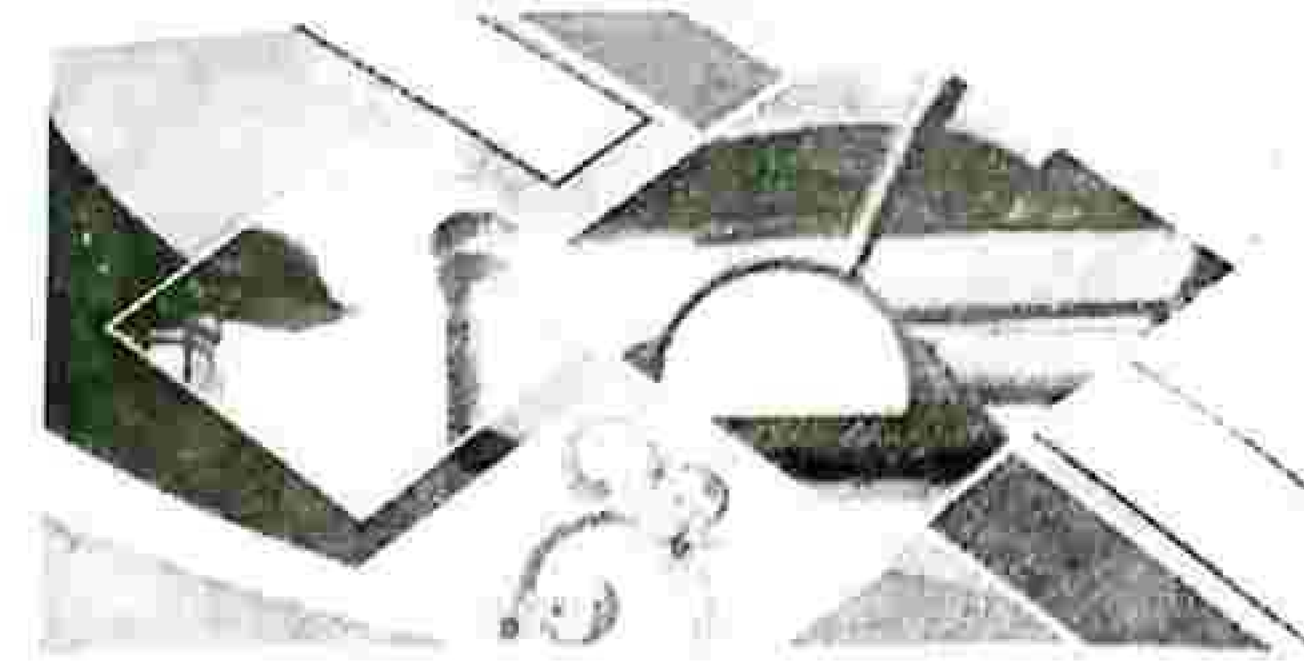

شمعِ ہدایت

اختر شجاعت

رجال سازی میں خواتین کا کردار

Digest library.com

تمام تر حمد وثنا اللہ رب العزت کے لیے ہے جو ہمارا خالق اور رازق ہے۔ جو بغیر کسی ابتدا اور آغاز کے کون و مکاں سے بھی پہلے اول و ازلی ہے۔ اس عظیم رب نے ہر شے کی تخلیق کو کمال بخشا اور جسے چاہا اس پر اپنا فضل کیا اور سب کے لیے اپنے عدل کو پھیلایا۔

تو اے میرے عظیم الشان پروردگار! جس کی بزرگی و عظمت کے عجائب ختم ہونے والے نہیں تو ہمیں اپنی عظمت کے پردوں میں چھپا کر کج اندیشوں سے بچالے۔

اے میرے رب......! تیری رحمت کے خزانے ختم ہونے والے نہیں تو اس رحمت میں ہمارا حصہ بھی قرار دے۔

اے میرے اللہ! تیرے مشاہدے سے آنکھیں قاصر ہیں تو اپنی بارگاہ سے ہم کو قریب کر لے۔ ہمیں اپنے یہاں عزت عطا کر......رسوا نہ کرنا۔

اے رب کریم......! تو ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے جو تیری طرف دعوت دینے والے ہیں اور تیری طرف آنے کا راستہ بتانے والے ہیں اور اپنے خاص الخاص مقربین میں شامل فرما......اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے پروردگار تو رحمت نازل فرما نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آلؑ پر اور ان کے اصحابؓ پر......شفاعت و حوضِ کوثر کے ذریعے مخصوص ہیں وسیلہ اور مقامِ محمود کے ساتھ......

درود و سلام ہو اس عظیم نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم پر......

☆☆☆

آج ہمارا موضوع ''رجال سازی میں خواتین کا کردار......'' اور رجال......رجل کی جمع ہے جس کے معنیٰ ''مرد'' کے ہیں۔ اور رجال کے لغوی معنی ہیں بہت سے مرد......اسی حوالے سے آج بات کریں گے کہ مردوں کی شخصیت سازی اور کردار سازی میں خواتین کا کردار......

آج ہمیں شدت سے ضرورت ہے ایسی خواتین کی جو ہماری تاریخ کا حصہ بن کر امر ہوگئیں۔ ہماری تاریخ گواہ ہے کہ ہر کامیاب ترین آدمی جو بہترین مفسر ہو، محدث، عالم یا فقیہ یہاں تک کہ بڑے، بڑے دانشور، سائنسدان، مفکر اپنے شعبے میں کامیاب اور بلند مقام و مرتبے پر ہیں ان کی کامیابی اور کامرانی کے پیچھے عفت مآب، دین شناس، کردار ساز، رجال ساز خواتین کا ہاتھ تھا۔

وہ خواتین اسلامی تعلیمات سے واقف اور اپنی ذمے داریوں سے آگاہ ہوتی تھیں وہ یہ بات بخوبی سمجھتی تھیں کہ وہ صرف ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک معاشرے کی تربیت اور شخصیت سازی کررہی ہیں۔ یہ دین شناس خواتین اپنی زندگی کو دینِ اسلام کے اصولوں کے مطابق ڈھالتی ہیں بلکہ اپنے اردگرد لوگوں کے لیے ایک نمونہ ہوتی ہیں......ان خواتین کے پیشِ نظر چند اہم باتیں ہمیشہ رہیں اور ان پر ہی انہوں نے فوکس کیا۔

۱۔ گھر اور خاندان کی تربیت......

۲۔ معاشرتی اصلاح......

۳۔ دینی علم کا فروغ......

۴۔ اعتدال اور امن کی تعلیم......

۵۔ اخلاقی نمونہ......

یہ وہ دین شناس خواتین تھیں جو علمی و عملی، اخلاقی اور روحانی لحاظ سے رول ماڈل تھیں۔ وہ اپنے اعمال اور گفتار سے اسلامی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے دوسروں کے لیے قابلِ تقلید مثال بنیں اور یہی خواتین نہ صرف اپنے خاندان بلکہ پوری امتِ مسلمہ کے لیے بہترین تربیت اور کردار سازی کا ذریعہ بنیں۔

امت مسلمہ اور دوسری قابل ترین شخصیات کی سوانح حیات کا مطالعہ کریں تو یہ پتا چلتا ہے کہ وہ مرد شخصیات جنہوں نے اپنی قابلیت، علمیت اور ذہانت کا سکہ بٹھایا۔ ان تمام کے پیچھے یعنی اس رجال سازی میں خواتین کا اہم کردار نظر آئے گا۔ یہ خواتین کہیں ماں کے روپ میں، کہیں بہن یا بیٹی کی صورت میں اور کہیں شریکِ حیات کی شکل میں مرد کی شخصیت سازی کرتی نظر آئیں گی۔ ماضی کی جن قابلِ قدر ہستیوں پر ہم فخر کرتے ہوئے ان کے کارنامے بیان کرتے ہیں ان سب کی تعلیم و تربیت، کردار سازی، حوصلہ افزائی اور شخصیت نکھارنے کے سلسلے میں ان باکمال خواتین کی کوشش وکاوشیں شاملِ حال نہ ہوتیں تو ان میں سے بہت سے حضرات تاریخ کا ایک گمشدہ باب ہوجاتے۔ ان رجال ساز خواتین میں سب سے پہلے شہزادی کونین، لختِ جگر رسول اللہ ﷺ، ملکہ عرب حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی صاحبزادی سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہیں جنہوں نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ جیسے شہزادے اسلام کی بقا کے لیے عطا کیے۔ یہ وہ رجال ساز اور کردار ساز خاتون ہیں جن کی تربیت کے نتیجے میں حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی ایسی شخصیت بنی کہ وہ تاریخ میں امر ہوگئے۔ ان کی شخصیت سازی میں ان کی والدہ سیدہ فاطمہؓ کا بڑا اہم کردار رہا۔ وہ ہمیشہ اپنے بچوں کو ہر فعل میں رضائے الٰہی کو مقدم رکھنے کی تلقین کرتیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں کہ بنت رسول فاطمۃ الزہراؓ جیسی سلیقہ شعار عورت میں نے کوئی نہیں دیکھی۔ باوجود کچا مکان ہونے کے جناب سیدہ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا نے صفائی کے لحاظ سے اپنے گھر کو جنت کا ٹکڑا بنا رکھا تھا۔ گھر میں اگرچہ سامان کچھ زیادہ نہ تھا مگر آپؓ نے ہر چیز کو بہت سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ آپ زیادہ تر اپنا وقت عبادت و ریاضت میں بسر کرتیں اور اس کثرتِ عبادات کے باوجود آپ تمام امورِ خانہ داری میں پوری، پوری دلچسپی رکھتیں۔ گھر کا تمام کام کاج اپنے ہاتھوں سے کرتیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب ترین بیٹی گھریلو کام کاج میں اس قدر مشقت برداشت کرتیں، آپ چکی پیستیں جس سے آپ کے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے۔ جھاڑو لگاتیں، پانی بھر، بھر کر لاتیں، ہنڈیا کے نیچے آگ لگاتیں تو چولھے میں پھونکیں مارنے سے آپ کی آنکھوں میں دھوئیں کی وجہ سے آنسو آجاتے۔ مگر کبھی حرفِ شکایت نہ لاتیں.... آپ کے چہرۂ منور پر ہمیشہ ایک پُروقار معصومیت اور متانت نظر آتی۔ ان تمام کاموں کے ساتھ، ساتھ اپنے صاحبزادوں کی بہترین پرورش فرمارہی ہوتیں۔ آپؓ نے صاحبزادے کو گود میں اٹھایا ہوا ہوتا اور چکی بھی پیس رہی ہوتیں بالعموم گھر کا سارا کام بچے کو سینے سے لگا کر ہی نبٹاتیں...... سیدہ فاطمۃ الزہراؓ چکی پیس رہی ہوتیں تو دونوں شہزادے آپ کی گود میں ہوتے اور آپ کے لبوں پر تلاوتِ قرآن پاک ہوتی۔

حضرت امام حسنؓ فرماتے ہیں کہ ہماری والدہ اکثر پوری پوری رات عبادت میں بسر کرتیں اور تمام شب رو، رو کر گزارتیں مگر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے وقت اپنی ذات کے لیے کبھی کوئی چیز طلب نہیں کرتیں۔

آپ اپنے ہاتھوں سے چکی میں جَو پیستی تھیں زبان سے قرآن پاک پڑھتی تھیں دل سے قرآن کی تفسیر فرماتی تھیں پاؤں سے اپنے بچوں کو جھولا جھلاتی تھیں۔

پھر آپؓ کی دختر شہزادی حضرت زینب سلام اللہ علیہا جیسی باکمال و جراُت مند خاتون جن کی تربیت کا شاہکار عون و محمد اپنی کم سنی کے باوجود میدانِ جنگ میں اپنے لہو کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

ایک لمبی فہرست ہے مسلم خواتین کی جن کا ذکر صفحات کی قلت کے باعث ممکن نہیں لیکن یہاں میں کچھ رجال ساز، کردار ساز، دین شناس خواتین کا ذکر کرنا چاہوں گی۔

حضرت امام بخاریؒ کو عظیم محدث بنانے میں ان کی ماں کا کردار......

حضرت امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری مشہور شہر بخارا میں پیدا ہوئے۔ امام بخاریؒ کے والد ایک صالح بزرگ تھے۔ آپ کے والد خوشحال اور دولت مند تھے۔ جس قدر دولت مند تھے اسی قدر پرہیزگار تھے...... ابھی ایام طفلی تھے کہ امام بخاریؒ کے والد کا انتقال ہوگیا وراثت میں کافی دولت چھوڑی...... آپ کی والدہ انتہائی سمجھدار

خاتون تھیں آپ کی تربیت کی تمام تر ذمے داری آپ نے سنبھال لی...... آپ کی خواہش تھی کہ آپ کا بیٹا ایک جلیل القدر عالم بن کر دنیا کے افق پر چمکے اور اپنے علم سے تاریک دنیا کو منور کردے۔ لیکن آپ کی حسرت و یاس کا کوئی ٹھکانا نہ رہا جب بچپن میں ہی حضرت امام بخاریؒ نابینا ہو گئے...... اب یہ بچہ نابینا ہونے کی صورت حصولِ تعلیم کے لیے علما کے دروس میں شرکت سے معذور تھا۔ اور نہ وہ حصولِ علم کے لیے دوسرے شہروں کا سفر اختیار کرسکتا تھا۔

آپ کی والدہ بے حد پریشان تھیں وہ بڑی عابدہ اور زاہدہ خاتون تھیں۔ اس وقت کے مشہور معالجین سے رجوع کیا مگر بات نہ بنی...... بس ان کو یہ غم کھائے جارہا تھا کہ آخر ان کے بچے کا کیا ہوگا؟ وہ عالم دین کیسے بن سکے گا؟ بینائی کے بغیر علم کا حصول کیسے ممکن ہوگا؟ ان کی خواہش کی تکمیل کے لیے ایک ہی راستہ تھا اور وہ راستہ تھا اپنے عظیم رب سے دعا کا...... چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دعا کے دروازے کھول دیے اور پورے اخلاص اور سچی نیت کے ساتھ دربارِ الٰہی میں گڑگڑا کر رونے لگیں اور اللہ رب العزت کے سامنے دستِ سوال دراز کر کے بچے کی بینائی کے لیے دعائیں مانگنے لگیں۔ یہ دعائیں نہ جانے کتنی مدت تک ہوتی رہیں...... بالآخر دریائے رحمت جوش میں آیا اور ایک رات آپ کو خواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زیارت ہوئی اور آپؑ نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ نے تمہاری آہ وزاری اور دعاؤں کی کثرت کے سبب تمہارے بیٹے کی بصارت لوٹا دی ہے۔“ صبح جب امام بخاریؒ بستر سے اٹھے تو ان کی آنکھیں روشن تھیں۔ سبحان اللہ! تب...... بے ساختہ والدہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ ”اے پروردگار! پریشان حال کی دعائیں تیرے علاوہ کون سن سکتا ہے اور کون ہے جو بندوں کی تکلیفوں کو دور کرتا ہے......“ اس عظیم خاتون نے بیٹے کی بینائی لوٹ آنے کے بعد ان کی تعلیم و تربیت اس قدر محنت سے کی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بیٹے پر علوم وفنون کے دروازے کھول دیے...... یہی بچہ زندگی کے مختلف مراحل طے کرتا کرتا بہت بڑا محدث بنا اور قرآن پاک کے بعد دنیا کی صحیح ترین کتاب مرتب کی جو ”صحیح بخاری“ کے نام سے مشہور ہے اور بچے کو لوگ امام بخاری کے نام سے جانتے ہیں جن کا پورا نام محمد بن اسماعیل البخاریؒ ہے۔

☆☆☆

دوسری اہم شخصیت حضرت امام شافعیؒ کی ہے، جن کی تعلیم و تربیت میں آپ کی والدہ کا بہت اہم کردار رہا...... آپ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت عبداللہ تھا۔ حضرت امام شافعیؒ قریشی تھے انہوں نے ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں جو افلاس و غربت کا شکار تھا۔ جس کی بود و باش جوارِ فلسطین میں تھی۔ ابھی وہ چھوٹے ہی تھے کہ آپ کے والد کا انتقال ہوگیا اور والدہ انہیں مکہ لے گئیں کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ یہاں کے ماحول میں لڑکا اپنے نسب شریف کو ضائع کردے گا۔ ایک جگہ خود امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ”میری ولادت یمن میں ہوئی پھر والدہ کو میرے بگڑنے کا اندیشہ ہوا چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ تو یہاں رہا تو ان ہی لوگوں کا سا ہوجائے گا مجھے ڈر ہے کہیں تیری نسبی شرافت اس طرح خاک میں نہ مل جائے...... چنانچہ وہ مجھے لے کر مکہ پہنچیں۔ پھر میں یہیں رہا اور پھر حصولِ علم میں مصروف ہوگیا۔“

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خاندانی اور نسبی اعتبار سے ان کے شرف و رفعت کا پایہ بہت بلند تھا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی زندگی غربت و افلاس میں بسر ہوئی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے پاؤں پر نہ کھڑے ہوگئے...... آپ کی والدہ نے آپ کی تربیت ایسی عمدہ کی کہ بچپن ہی سے انہیں علم کا شوق پیدا ہوگیا۔ ذکاوت و ذہانت قدرت کا عطیہ تھی سب سے پہلے انہوں نے قرآن حفظ کیا اور بہت جلد حافظ قرآن ہوگئے پھر وہ حفظ حدیث پر متوجہ ہوئے۔ حصولِ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شوق انہیں بے تاب رکھتا تھا۔ حالت یہ تھی کوئی حدیث سنی اور ازبر ہوگئی...... پھر کبھی اسے کپڑے پر لکھ لیتے کبھی کھال پر کبھی کوئی بیاض تیار کرلیتے...... اور اس کے اوراق پر جو کچھ یاد کرتے قلمبند کرلیتے۔ علم سے ان کی محبت اور شیفتگی حد درجہ بڑھی ہوئی تھی۔

چونکہ مالی حالات ان کے کافی کمزور تھے یہاں تک کہ حضرت امام شافعیؒ کی والدہ کے پاس معلم کو دینے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ لیکن آفرین ہو اس ماں پر کہ اپنے بیٹے کے تعلیمی سفر کے لیے اس کے اخراجات پورے کرنے کی خاطر اپنا گھر گروی رکھ دیا...... پھر دنیا نے دیکھا کہ اس تعلیم و تربیت کا نتیجہ ایک بہت بڑے فقیہ اور امام کی صورت میں

نکلا جس کی تعلیمات سے آج بھی امت مستفید ہو رہی ہے۔ امام شافعی طبعاً فیاض تھے، اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیا کرتے تھے...... بے حد غیور اور خود دار تھے...... اہلِ ثروت و اقتدار سے کبھی کسی چیز کی طمع اور توقع نہ رکھتے، بے حد خلیق اور بامروت تھے کبھی کوئی شخص محبت و عقیدت سے نذرانہ پیش کرتا تو اسے رد نہیں کرتے تھے تاہم فیاضیٔ طبع کی بنا پر اس کو اپنے پاس بھی نہیں رکھتے تھے اور لوگوں میں تقسیم کر دیتے۔

☆☆☆

ہمارے اسلاف کی ایک اور اہم شخصیت حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کی ہے...... آپ کی تربیت میں آپ کی والدہ قرسم خاتون کا بہت اہم کردار رہا۔ حضرت قرسم خاتون بے حد عبادت گزار خاتون تھیں...... ان کی روحانی عظمت کا اندازہ اس واقعے سے ہوتا ہے کہ ایک رات قرسم خاتون تہجد کی نماز میں مصروف تھیں، اس وقت ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا...... ایک چور جو اس گھر میں داخل ہوا یہی سوچ کر کہ یہاں ایک بیوہ عورت اور چار معصوم بچے مقیم ہیں۔ کوئی محافظ مرد تو موجود ہے نہیں...... چور جیسے ہی اندر داخل ہوا اس کی نظر قرسم خاتون پر پڑی بابا فریدؒ کی والدہ نماز میں مشغول تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اپنے خالق کے تصور میں کھوئی رہتی تھیں۔ چور آگے بڑھا مگر ابھی اس نے چند قدم کا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کی روشنی سے محروم ہو گیا۔ یہ ایک ناقابلِ یقین حادثہ تھا وہ بہت دیر تک گھر کی دیواروں سے سر ٹکراتا رہا مگر اسے فرار کا راستہ نہ مل سکا۔ تب اسے احساس ہوا کہ یہ قہرِ آسمانی ہے تب اس نے چیخنا شروع کر دیا کہ

''میں ایک بت پرست ہوں اور چوری میرا پیشہ ہے میں یہاں بھی چوری کی غرض سے آیا تھا مگر میری آنکھوں کی روشنی چلی گئی یہ کوئی اتفاق بات نہیں بلکہ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ اس گھر میں کوئی ایسی بزرگ ہستی موجود ہے جس کی دہشت نے مجھے اندھا کر دیا...... میں اس ہستی سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ مجھے معاف کر دے......'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ قرسم خاتون نے غور سے اس توانا شخص کو دیکھا مگر خاموش رہیں۔ چور بدستور درخواست کرتا رہا کہ ''میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میری بینائی بحال ہو گئی تو میں اسلام قبول کر لوں گا......'' اس چور کی گریہ وزاری سن کر قرسم خاتون نے اپنا وظیفہ ترک کر دیا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے...... ''دنیا سمجھتی ہے کہ میں بے یار و مددگار ہوں مگر تو جس کا محافظ ہو اسے کون لاوارث کہہ سکتا ہے......'' تائید غیبی پر قرسم خاتون کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''تیری رحمت جس گھر کی نگہبانی کرتی ہو اسے رہزنوں سے کیا خطرہ......؟ اے اللہ! تو نے میری حفاظت کی اور ایک ظالم کے شر سے محفوظ رکھا لیکن اب میں التجا کرتی ہوں کہ تو نے جس کی بینائی سلب کی ہے اس کی آنکھوں کو دوبارہ روشن کر دے۔''

وہ بہت خوب صورت الفاظ کے ساتھ اپنے رب کے آگے دعا کرتی رہیں۔ تب اس چور کو احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں کے اندھیرے چھٹ گئے، اس کی بینائی بحال ہو چکی تھی۔ وہ لرزتے قدموں سے آگے بڑھا جہاں قرسم خاتون محوِ عبادت تھیں۔ وہ ان کے پاس آ کر اظہارِ ندامت کرنے لگا تو آپ نے کہا کہ ''اے شخص! جس نے تیری بینائی کو زائل کر دیا تھا وہی اس کائنات کا خالق ہے اور دوبارہ جس نے تیری روشنی بحال کی ہے وہی ذات عبادت اور پرستش کے لائق ہے۔ میرا تو بس اتنا فرض ہے کہ میں تجھ سے تیرا حال دریافت کروں یقیناً تجھے کسی ضرورت نے پریشان کیا ہو گا میرے یہاں تیری حیثیت ایک مہمان کی سی ہے اگر ہو سکے تو اپنی ضرورت بیان کر...... شاید میں تیرے کسی کام آ سکوں......'' قرسم خاتون ایک بزرگ کی بیٹی تھیں اس کے علاوہ آپ نسلِ سادات سے بھی تعلق رکھتی تھیں یہی وجہ تھی کہ آپ ایک لٹیرے کے سامنے بھی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کر رہی تھیں...... لٹیرا شرم سے گڑا جا رہا تھا...... تب اس نے کہا...... ''خاتون! بس میرے لیے یہی کافی ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں......'' قرسم خاتون نے پُرجلال لہجے میں کہا...... ''ان سے معذرت طلب کر جو تیری وجہ سے برباد ہو گئے اور اس کی بارگاہ میں دامن پھیلا جس نے تجھے عقل بخشی مگر تو بے جان چیزوں کی پرستش کر رہا ہے۔ واپس جا اور اس روشنی کی آواز سن جو تجھے پکار رہی ہے......'' یہ کہہ کر انہوں نے منہ پھیر لیا...... وہ خاموشی سے چلا گیا...... اگلے دن محلے والوں نے دیکھا کہ ایک دراز قامت شخص اپنے بیوی بچوں کے ساتھ قرسم خاتون کے

دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے قرسم خاتون سے کہا کہ ”بس اب آپ مجھے اور میرے اہلِ خانہ کو دولتِ ایمان عطا کر دیجیے کہ ہمارے دل بھی بتوں سے پاک ہو جائیں۔“

اور یوں وہ انسان ہدایت پا گیا...... ان ہی عظیم خاتون کے بطن سے تین فرزند اور ایک صاحبزادی ہاجرہ تھیں جن کی آغوشِ محبت میں مشہور بزرگ حضرت علی احمد صابری کلیریؒ نے آنکھ کھولی۔

حضرت بابا فریدالدینؒ کا دورِ یتیمی دیگر اہلِ خاندان کی نظر میں آفات و مصائب کا زمانہ تھا لیکن آپ کی والدہ قرسم خاتون اپنے اللہ کے فیصلے پر راضی بہ رضا تھیں۔ جب رشتے دار خواتین نے ان سے یہ سوال کیا کہ ان بچوں کا کیا ہوگا تو حوصلہ مند ماں نے پُرعزم لہجے میں کہا...... ”بے شک ان بچوں کا باپ اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہے کہ جب انہیں محفوظ سائبان کی ضرورت تھی لیکن اس ظاہری محرومی کے باوجود میں خود کو لاوارث سمجھتی ہوں اور نہ میرے بچے بے سہارا ہیں۔ میں جس اللہ کی پرستش کرتی ہوں وہ اول و آخر بھی ہے ظاہر و باطن بھی اور حی و قیوم بھی......“ قرسم خاتون کا جواب سن کر خواتین خاموش ہو گئیں اور یہ پاک سیرت خاتون ان چاروں بچوں کی تربیت میں مشغول ہو گئیں۔ وہ اپنے بیٹے بابا فرید کو نماز کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا کرتیں...... ”فرزند! نماز ادا کیا کرو...... اس سے اللہ راضی ہوتا ہے اور اپنے عبادت گزار بندوں کو بے شمار انعامات سے نوازتا ہے......“ حضرت بابا فریدؒ اس وقت بہت کم سن تھے اپنی والدہ سے پوچھنے لگے۔ ”جو بچے نماز پڑھتے ہیں تو اللہ کی طرف سے انہیں کیا انعام ملتا ہے؟“ قرسم خاتون نے کہا۔ ”نمازی بچوں کو پہلے شکر ملتی ہے پھر جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں تو اللہ انہیں دوسرے انعامات سے نوازتا ہے۔“ بابا فریدؒ والدہ کی بات سن کر مطمئن ہو گئے پھر جب وہ اِدھر اُدھر چلے جاتے تو قرسم خاتون خاموشی سے مصلے کے نیچے پڑیا رکھ دیتیں۔ حضرت بابا فریدؒ نماز ادا کرتے اور مصلے کا کونہ اٹھا کر شکر کی صورت میں اپنا انعام پا لیتے۔ یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلتا رہا۔ پھر ایک روز قرسم خاتون اپنا روزانہ کا یہ عمل بھول گئیں۔ دوسرے دن یاد آیا تو بابا فریدؒ کو بلا کر پوچھا۔

”بیٹا! کیا کل تمہیں مصلے کے نیچے سے شکر ملی تھی؟“

قرسم خاتون کے لہجے سے اضطراب نمایاں تھا۔ ”جی ہاں! مجھے ہر نماز کے بعد شکر مل جاتی ہے۔“ بابا فرید نے بصد احترام عرض کیا...... بیٹے کی بات سن کر قرسم خاتون کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ دل ہی دل میں اپنے اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں کہ ”اے میرے رب تو نے مجھے فرید کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچا لیا۔“ تب انہوں نے پیار سے بابا فرید کو گلے لگایا اور نہایت محبت آمیز لہجے میں فرمایا۔ ”میرا بیٹا فریدالدین مسعود گنج شکر ہے۔“ یوں ان کی بہترین تربیت کے باعث آپ نے تصوف کی دنیا میں ایک بہت بڑا مقام پایا۔

☆☆☆

ایک اور اہم شخصیت حضرت بابا نظام الدین اولیاؒ کی ہے۔ جن کی پرورش ان کی والدہ بی بی زلیخا نے کی...... حضرت خواجہ نظام الدینؒ کا خاندان وسط ایشیا کے مشہور علمی و روحانی مرکز بخارا سے تعلق رکھتا تھا مگر جب چنگیز خان نے شہروں کو تباہ کرنا شروع کیا تو خواجہ نظام کے دادا سید علی بخاری کو ہجرت کرنا پڑی تو برصغیر کا رخ کیا...... خواجہ احمد (والد حضرت نظام) درویشانہ مزاج کے رکھنے والے بزرگ تھے۔ گھر میں بیٹھے اللہ، اللہ کرتے رہتے۔ خواجہ نظام ابھی کم سن ہی تھے کہ خواجہ احمد کا وصال ہو گیا۔ باپ کے سائے سے محروم ہو گئے مگر بی بی زلیخا بڑی حوصلہ مند خاتون تھیں۔ انہوں نے بیٹے کو یتیمی کا احساس نہ ہونے دیا اور اتنی بہترین تربیت کی کہ نظام الدین محبوبِ الٰہی بھی ہوئے اور محبوبِ خلائق بھی۔

بی بی زلیخا کے وسائل محدود تھے۔ گھر میں اللہ کا نام تھا۔ کبھی، کبھی فاقے کی نوبت بھی آ جاتی...... ایسے موقع پر وہ بہت پیار سے خواجہ نظام الدین سے کہتیں۔ ”بیٹا نظام! آج ہم اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں۔“ خواجہ نظام نیک بخت ماں کی یہ بات سن کر خوش ہو جاتے۔ مہمانی وہ بھی اللہ تعالیٰ کی...... بھولے سے بھی بھوک کی شکایت نہ کرتے۔ صبر و رضا اور بھوک، پیاس برداشت کرنے کا پہلا سبق جان فدا کرنے والی اسی ماں سے ملا...... محدود وسائل کے باوجود، بی بی زلیخا نے خواجہ نظام الدین کی تعلیم کو مقدم سمجھا کیونکہ خوب جانتی تھیں کہ علم ہی سے آدمی اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے اور انسان بھی بنتا ہے۔ بی بی زلیخا چاہتی تھیں کہ اکلوتے بیٹے کو

کسی اچھے استاد کے سپرد کردیں۔ جو عام استادوں کی طرح محض کتابیں ہی نہ پڑھائے بلکہ شخصیت اور کردار کی بھی تعمیر کرے۔ بچے میں صحیح اسلامی روح بھی بیدار کرے اور اسے روحانی زندگی کے اخلاق و آداب سے بھی آشنا کرے..... بی بی زلیخا نے بہت سوچ سمجھ کر خواجہ نظام الدین کو مشہور عالم، درویش اور نیک بخت استاد مولانا... علاؤالدین اصولی کے سپرد کیا۔

بدایوں میں ان کی تعلیم مکمل ہوگئی۔ بی بی زلیخا اپنے پیارے بیٹے کی علمی ترقی اور سعادت مندی سے بڑی مطمئن تھیں۔ انہوں نے بیٹے کے لیے زندگی کے جس انداز کا تصور کیا تھا...... ہونہار اور لائق بیٹا اسی انداز کو اختیار کرنے کی دھن میں تھا۔ بی بی زلیخا کو اپنے بیٹے سے بڑی امیدیں تھیں۔ جانتی تھیں کہ ہونہار ہے، ذہین ہے درویشانہ مزاج رکھتا ہے اسی لیے مزید علم کی طلب میں آپ نے ان کو دلی بھیجا۔ دلی میں ابتدائی تین چار سال بڑی محنت اور ریاضت کے گزارے۔ جلد ہی علمائے شہر کے حلقے میں آپ کی ذہانت، برجستہ گوئی اور علمی قابلیت کا شہرہ ہوگیا۔ آپ نے اپنے عہد کے ہر علم سے شناسائی پیدا کی۔

قرآن، حدیث، فقہ، ادب تواریخ سیر وسوانح سب کا گہرا مطالعہ کیا۔ غرضیکہ ایک ماں کی بہترین تربیت کے نتیجے میں حضرت نظام الدینؒ نے بہت شہرت پائی......اور مخلوق کو بہت فیض پہنچایا۔

☆☆☆

تاریخ کی ایک اور اہم شخصیت جس کی کامیابی کے پیچھے اس کی محبت کرنے والی ماں تھی۔ یہ شخصیت نوبل انعام یافتہ انیسویں صدی کا سب سے بڑا سائنسدان تھامس ایڈیسن کی ہے...... جب وہ ایک گیارہ سالہ نالائق طالب علم تھا۔ یہ لڑکا اپنے ہم عمر لڑکوں سے بہت پیچھے تھا۔ کچھ عرصہ شدید بخار ہوا تو اس کی سماعت بھی شدید متاثر ہوئی نیم بہرے پن کا شکار...... وہ سب سے بے نیاز اپنی ہی دنیا میں مگن رہنے والا بچہ تھا۔ اس کا دماغ عجیب وغریب چیزیں سوچتا رہتا۔ غربت کا شکار...... کچھ عرصے کے بعد وہ جس اسکول میں زیر تعلیم تھا وہاں کے پرنسپل نے اسے ایک سربہ مہر لفافہ دیا اور کہا یہ خط اپنی ماں کو دے دینا۔ خط اس نے گھر پہنچنے کے بعد ماں کو ہاتھ میں دیا اور حیران کن نگاہوں سے ماں کو دیکھنے لگا...... ماں نے خط پڑھنا شروع کیا تو اس کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ پھر اس نے تھامس ایڈیسن کو بتایا کہ اس خط میں لکھا ہے کہ تمہارا بیٹا تھامس ایک جینئس ہے۔ یہ اسکول اس کے لیے بہت چھوٹا ہے اور یہاں اتنے اچھے استاد نہیں جو اسے پڑھا سکیں۔ لہٰذا آپ اسے خود ہی پڑھائیں۔

پھر تھامس کی ماں نے اپنے بیٹے کے لیے خود ہی موتی چننا شروع کیے اور یوں اس کے لیے علم کا سمندر تلاش کرکے اس کی رگ وجاں میں سمونے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ بچہ زینہ، بہ زینہ ترقی کی منازل طے کرنے لگا اور پھر ایک وقت آیا کہ گھر پر تعلیم حاصل کرنے والے اس لڑکے نے سائنس کی دنیا میں تہلکہ مچادیا۔ ایک ہزار سے زائد ایجادات کا موجد بنا۔ سیکڑوں ایجادات کا سہرا اپنے سر پر سجایا۔ بلب کی ایجاد کے سلسلے میں ایڈیسن نے ایک ہزار کے قریب تجربات کیے جن میں نو سو ننانوے بار اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن جب بھی اس کا کوئی تجربہ ناکام ہوتا تو اس کے ذہن میں اپنی ماں کے الفاظ گردش کرنے لگتے کہ ”تمہارا بیٹا جینئس ہے۔“ اور پھر وہ ایک شام کامیاب ہوگیا اور بلب روشن ہوگیا۔ اس نے کائنات کو روشن کردیا۔ 84 سال کی عمر میں اس نے بہت جدوجہد سے ایجادات کا انبار لگا کر بہترین سائنس دان کے طور پر اپنے آپ کو منوالیا اور ”بابائے ایجادات“ کہلایا۔ ایک شام وہ اپنے گھر کی پرانی الماری میں سے کچھ کاغذات تلاش کررہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک بوسیدہ کاغذ پر پڑی یہ وہی خط تھا جو بچپن میں اس نے اپنی والدہ کو اسکول کی طرف سے لاکر دیا تھا۔ اب اس کی والدہ کو گزرے کافی عرصہ ہوچکا تھا۔ اس نے خط کھولا اس میں لکھا تھا۔ ”آپ کا بیٹا انتہائی غبی (کند ذہن) اور ذہنی طور پر ناکارہ ہے ہم اسے اب مزید اسکول میں نہیں رکھ سکتے آپ اسے خود گھر پر پڑھائیں۔“ خط کی اصل عبارت پڑھ کر ایڈیسن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ جی بھر کر رو دیا۔ اس رات ایڈیسن نے اپنی ڈائری میں یہ شاندار جملہ لکھا۔ ”تھامس ایڈیسن ایک ذہنی طور پر ناکارہ بچہ تھا۔ مگر اس کی عظیم ماں نے اسے ایک جینئس بنادیا۔“

☆☆☆

اب موجودہ دور کی خواتین کا جائزہ لیں بحیثیت ماں ان کا کیا کردار ہے؟ جبکہ ان خواتین کو احساس ہونا چاہیے کہ عورت صرف ایک مرد کی تربیت نہیں کرتی...... بلکہ وہ امت کے رہنما اور ایک معاشرے کی تربیت کرتی ہے۔ عورت تاریخ ساز افراد کی پرورش کرتی ہے۔ اس کی گود سے قوم کا سر فخر سے بلند کرنے والے بھی تیار ہوسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مشہور فقہا، محدثین اور دیگر اکابرین امت کی تعلیم وتربیت میں خواتین کا اہم کردار رہا ہے۔ وہ خود گمنام رہیں لیکن انہوں نے امت کے لیے کئی رہنما تیار کیے...... جنہوں نے دینی، علمی، سماجی اور ملی خدمات انجام دیں۔ لہٰذا دورِ حاضر میں ایسی رجال ساز خواتین کا تذکرہ لوگوں کے سامنے پیش کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے بلکہ ان کی سیرت کو بھی اپنانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ عہدِ حاضر کی خواتین بھی ان کی پیروی کر کے ایک فرد کے بجائے رجال کار تیار کریں۔ عورت اور مرد دونوں کی بہترین تربیت کی ذمے دار بالآخر عورت ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کریم آقا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچوں کی محافظت اور تربیت کا ذمے دار ماں کو ٹھہراتے ہوئے فرمایا۔ ''عورت اپنے شوہر کے گھر اور اولاد کی نگران کار ہے۔'' مگر عورتیں یہ ذمے داری بخوبی اسی وقت نبھا سکتی ہیں جبکہ وہ خود عملی طور پر اسلامی تعلیمات کی پابند اور اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوں...... اس کی مثال آج فلسطینی مائیں ہیں...... معروف مصنف عرب کے ادھم شرقاوی کہتے ہیں میری اہلیہ نے مجھ سے کہا کہ ''جب غزہ کی جنگ ختم ہوگی تو ہم غزہ کے یتیم بچے لے کر اپنے بچوں کے ساتھ ان کی پرورش اور تربیت کریں گے......'' میں نے اہلیہ کو جواب دیا کہ ''جب جنگ ختم ہوگی تو ہم اپنے بچے بھی اہلِ غزہ کو دے دیں گے تاکہ وہ ہمارے بچوں کی تربیت کریں۔''

بچوں کی تربیت کا عمل حمل ٹھہرنے کے ساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے۔ سلف صالحین کے زمانے میں عورتیں باوضو ہوکر بسم اللہ پڑھ کر اس نیت سے بچوں کو دودھ پلاتی تھیں کہ بچہ بڑا ہوکر اسلام کا شہسوار...... دین کا داعی، عالم، قائد، مجاہد اور شان والا بنے...... یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں عظیم شخصیات سامنے آئیں...... لیکن آج کی اکثر عورتیں اپنے بچوں کو اس نیت سے دودھ پلاتی ہیں کہ بچہ بس سو جائے اسی لیے آج امت سو رہی ہے جبکہ عہدِ حاضر میں تو ماؤں کی ذمے داریاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ کیونکہ ٹیکنالوجی نے آج حشر برپا کردیا ہے...... آج زیادہ تر مائیں دن کا زیادہ تر وقت کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور موبائل کے ساتھ گزار دیتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں فیس بک، انسٹا گرام، واٹس ایپ، ٹوئیٹر، یوٹیوب اور دوسری دیگر...... سرگرمیوں میں گزار رہی ہیں اور ان کی توجہ بچوں کی تربیت کی طرف نہ ہونے کے برابر ہے۔

دین، قرآن، نماز، اخلاقیات سے دور کا بھی تعلق نظر نہیں آتا۔ جب ہی ہمارا معاشرہ آج بے ہنگم ہجوم بن کر رہ گیا ہے۔ یہ ایک قوم اور ایک امت کہیں سے بھی نہیں نظر نہیں آتی۔ برائیوں کا ایک طوفان ہے جو ہمارے معاشرے کو تباہ کررہا ہے۔ یاد رکھیں ایک تربیت یافتہ لڑکا یا مرد اپنی پوری نسل کو سنوار سکتا ہے اور اس سے گھر کا ماحول بھی صحت مند اور خوشگوار رہے گا۔ ہمیں ہر دم اپنے رب سے دعا کرتے رہنے کی ضرورت ہے کہ ''یارب العالمین ہماری اولادوں کو آگے آنے والی نسلوں کو ہر شیطانی حربے سے محفوظ رکھ اور انہیں آنکھوں کی ٹھنڈک بنا آمین...... الٰہی آمین!''

Digest Library.Com

حرفِ آخر:

احساسِ ندامت کے ساتھ اپنے رب کے حضور دعا گو ہوں کہ اس مضمون میں کوئی غلطی دانستہ یا نادانستہ ہوگئی ہو تو رب کریم مجھے معاف فرمادے کہ میں اس کی بارگاہ میں توبہ کرتی ہوں...... اور ان تمام قابلِ احترام ہستیوں کی شکر گزار ہوں کہ جن کی کتب سے میں نے مضامین کا انتخاب کیا اللہ کریم ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

کتاب، مصنف

۱۔ البتول، حضرت علامہ صائم چشتی

۲۔ حضرت امام شافعی، محمد ابوزھرہ (مصر)

۳۔ تذکرۃ المحدثین، مولانا علامہ غلام رسول سعیدی

۴۔ دبستان نظام، ڈاکٹر اسلم فرخی

۵۔ اللہ کے سفیر، جناب خان آصف

۶۔ علمی وفکری لیکچر، محترمہ عالمہ سعدیہ حبیب صاحبہ

آہ...... سائرہ رضا

نزہت اصغر

اور وہ زندگی ہار گئی

زندگی کتنی ناپائدار ہے یہ بات ازل سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہے مگر ہم پھر بھی حقیقت سے نظر چرائے رہتے ہیں۔ اس کا یقین تب آتا ہے جب اچانک ہمارا کوئی اپنا اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

کتنے ہی لوگ روز داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہیں مگر دل دُکھ سے اس وقت بھر جاتا ہے جب کسی کے متعلق ایسا کبھی نہ سوچا ہو کہ یوں داغِ مفارقت دے جائے حتیٰ کہ اسپتال کے آئی سی یو میں مشینوں میں جکڑے شخص کے لیے بھی زندگی و صحت کی امید بھری دعائیں جاری رہتی ہیں۔

سائرہ رضا ایک ایسی شخصیت کہ جس سے جب بھی بات ہوئی کسی اجنبیت کا احساس کبھی نہ ہوا، حتیٰ کہ پہلی مرتبہ میں بھی اتنا خیر مقدمی انداز تھا۔

ماہنامہ دلکش کا اجرا ہوا تو سائرہ رضا کی متاثر کُن تحریریں بھی اس کا حصہ بنیں پھر کچھ وقفے کے بعد ماہنامہ پاکیزہ کے لیے اس نے اکٹھی دو تین کہانیاں دے ڈالیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ جب وہ اپنے ہاتھ کے لکھے مسودے دیا کرتی، اس کے حلقے کی لکھنے والیاں اسے اسکرپٹ رائٹنگ کے لیے اکساتی رہیں اور اس نے بالآخر ہمت پکڑ لی اور ایک کے بعد ایک ڈرامے منظرِ عام پر آتے رہے۔ آخری اسکرپٹ شاید یحییٰ کا تھا جو آٹھ اقساط پر مشتمل تھا۔ اس نے خاص طور پر زیادہ بیٹیوں والے گھر کی کہانی، وہاں کے مسائل کو ڈسکس کیا۔ اس کا قلم اگرچہ اپنے اردگرد بکھری معاشرتی کہانیوں کو موضوع بناتا تھا مگر اس میں سنجیدہ اور اصلاحی پہلو بھی نمایاں ہوتا، کبھی ہلکے پھلکے انداز میں بڑی سے بڑی بات بھی کہہ جاتی اور یہ ایک کامیاب رائٹر کی خوبی ہوتی ہے کہ ہر دو سطروں میں کوئی سوچ کا عنصر ہو، کوئی فکر انگیز بات ضرور ہو۔

وہ اپنی والدہ سے بہت اٹیچڈ تھی، اگرچہ ہر ماں بیٹی ہوتی ہیں مگر لگتا تھا وہ ان کی رائے، ان کے مشورے کے

بغیر کچھ نہیں۔ اس کے لکھنے کی صلاحیت میں ان کی بہت حوصلہ افزائی شامل تھی...... وہ اپنی ہر ممکن کوشش کرتیں کہ سائرہ کی گھر داری کے ساتھ اس کے لکھنے کا عمل متاثر نہ ہو۔ ماں چلی جائے تو بیٹیاں ویسے بھی اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرنے لگتی ہیں۔

یہ کوئی چھ، آٹھ سال پہلے کی بات ہوگی جب اس نے اپنی جڑواں نو زائدہ بچیوں کا بھی غم اٹھایا۔ اولاد کا غم بہت بڑا ہوتا ہے اور پھر ایک کے بعد ایک بچیاں چلی جائیں جنکہ ماں نے پورے نو مہینوں کی تکلیف سہہ کر دردِ زہ سے گزر کر جنم دیا ہو۔ اس حادثے کے بعد بھی سائرہ کا حوصلہ نہیں ٹوٹا۔ اس نے اپنی جسمانی اور ذہنی اذیتوں پر قابو پا کر نئے سرے سے قلم تھاما۔ اس کے لیے اس کے شریکِ سفر کا ساتھ بھی قابلِ تعریف تھا۔ بہر حال دل غم سے بوجھل ہے، آنکھ اشکبار ہے، جواں سال شازیہ چودھری، فرحانہ ناز ملک اور رخ چودھری کی طرح وہ بھی اچانک ہی اپنے خیر خواہوں اور مدّاحوں کو سکتے میں ڈال کر ملکِ عدم روانہ ہوئی۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ عالمِ ارواح میں سائرہ رضا کے درجات بلند ہوں اور تمام متعلقین خصوصاً اس کی پیاری بیٹیوں کو صبرِ جمیل عطا ہو، الٰہی آمین۔

اُڑتی پھرتی تتلی

عنیزہ سید

سائرہ رضا ہم سب کے ارد گرد اپنی دُھن میں اڑتی پھرتی، زندگی کے باغ میں کھلے خوب صورت ترین پھولوں کا رس چوستی وہ خوب صورت ترین تتلی تھی جس کے پروں کے رنگ قوسِ قزح کے رنگوں سے میل کھاتے تھے اور اس قوسِ قزح کے رنگوں میں رنگی اس تتلی کے ہر رنگ کی اپنی ایک الگ خصوصیت تھی۔ کبھی ہم ڈائجسٹ میں لکھتے تھے اور وہ پڑھتی تھی، ہم سے بہت بعد میں اس نے لکھنا شروع کیا، وہ ڈائجسٹ کی دنیا میں آئی اور چھا گئی۔ تب وہ لکھتی تھی اور ہم پڑھتے تھے نا صرف پڑھتے تھے بلکہ پڑھ کے سر بھی دھنتے تھے۔ اس کے کردار، اس کے جملے، اس کی منظر نگاری، اس کے مکالمے مل کر ایک ایسی کہانی کو جنم دیتے جو دل پہ ایک یادگار نقش چھوڑ جاتی تھی اور ہم ایک مہینے میں شائع ہونے والی کہانی پڑھ کے مسحور ہوتے ہوئے اگلی کہانی کے منتظر رہنے لگے۔ اس نے اس خوب صورتی سے اپنی کہانیوں کے ذریعے دل کو چھوا کہ میں اس کا نمبر ڈھونڈھ کے اس سے بات کرنے کی خواہش دل میں کر بیٹھی اور پھر مجھے اس کا نمبر مل بھی گیا۔ میں نے پہلی بار اس سے رابطہ کیا تو وہ جیسے کھل سی اٹھی اور الٹا اس نے مجھے میری لکھی کئی ایسی کہانیوں کی یاد دلائی جو اس نے پڑھ رکھی تھیں اور مجھے بھول چکی تھیں۔ پھر فون پر گفتگو کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم کبھی گھنٹوں بات کیا کرتے تھے۔ کہانیوں پر، کرداروں پر، اپنے ارد گرد بسنے والے لوگوں پر، زندگی پر، زندگی کے مسائل پر خدا جانے وہ کون سا موضوع تھا جس پر ہم نے بات نہ کی ہو۔ اپنی آنے والی کہانیوں پر، ذہن میں کلبلاتی کہانیوں پر، کرداروں کی گہرائی پر ہم نے بہت باتیں کیں اور ان باتوں نے ہماری کئی کہانیوں کی نوک پلک سنوارنے میں ہماری بہت مدد بھی کی۔ ایسی گفتگو کے دوران مجھے اندازہ ہوا کہ زندگی کے متعلق اپنی پیاری بیٹیوں کے متعلق آنے والے وقت کے لیے اس کی آنکھوں میں بہت سے خواب سجے تھے اور ان خوابوں کو پورا کرنے کے لیے وہ کسی بھی طرح کی محنت سے ہچکچانے والی خاتون نہیں تھی۔ بیٹیوں کی تعلیم سے متعلق بہت حساس تھی۔ میرا تعلق کیونکہ تعلیم کے میدان سے بھی جڑا تھا اس لیے وہ مجھ سے بیٹیوں کی تعلیم کے بارے میں مشورے بھی لیا کرتی تھی۔ گفتگو کے طویل سلسلے اس وقت تک تسلسل سے جاری رہے جب تک سائرہ صرف ڈائجسٹ کے لیے لکھتی تھی۔ ڈائجسٹ سے نکل کے جب اس نے اسکرپٹ رائٹنگ کے میدان میں قدم رکھا تو یہ سلسلے مختصر ہوتے، ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گئے۔ اب وہ اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے بڑے پلیٹ فارم پر قدم جما رہی تھی۔ اس کے بارے میں ہر نئی بات اور خبر اس کے فیس بک اسٹیٹس سے ملنے تک محدود ہو گئی۔ لیکن اسکرپٹ رائٹنگ کی دنیا میں اس کی ہر نئی کامیابی پہ اسے مبارک باد اور دعا دینے کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کی کامیابیاں، اس کی خوشی اس کا جوش و خروش دل کو خوش کرتا رہا۔ میرے ہم سفر اور دل موم کا دیا کی کامیابی نے اسے ایک نئے افق پر بیٹھا دیا اس سے آگے کے سارے میدان اور سارے منظر یقیناً اس کے تھے۔ گزشتہ سال حج کی ادائیگی کے دوران اس کی امی کے انتقال کی خبر ملی۔ میں حج پر تھی لہٰذا اس سے کسی قسم کی تعزیت نہ کر سکی۔ میں اپنی امی سے اس کے بے حد جذباتی تعلق سے

digestlibrary.com

واقف تھی اور میرا دل کہتا تھا کہ اسٹیٹس پر رسمی تعزیت اس تعلق کی توہین تھی۔ حج سے واپسی پر میں نے اسے کال کی اور اس سے تعزیت کی اس نے تفصیل سے اپنے دل کا حال ویسے ہی سنایا جیسے کبھی پہلے ہم بات کرتے تھے۔ پھر اس کے اسٹیٹس سے اسے چکن گونیا کی بیماری لاحق ہو جانے کی خبر ملی۔ میں نے اسے ایک بار پھر عیادت کے لیے کال کی وہ بہت تکلیف میں تھی۔ بیماری نے اس پر شدت سے حملہ کیا تھا، اس کے لیے دعا کا سلسلہ جاری رہا پھر وہ صحت یاب ہو کے عملی زندگی میں ایک بار پھر واپس آ گئی۔ کئی ایوارڈ شوز اور چینلز کی تقریبات میں اس کی شمولیت کی تصاویر دیکھنے کو ملیں دل کو بہت خوشی ہوئی، سائرہ وہ پانے جا رہی تھی جس کی خواہش اس کے دل میں کب سے تھی۔ لیکن ایک چیز جو میں نے نوٹس کی وہ ان تصاویر میں کمزور اور تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ آٹھ مئی کو کسی موضوع پر بات کرنے کے لیے میں نے اسے کال کی۔ اس سے وہ کال مس ہو گئی۔ پھر اس نے کال بیک کیا اور ہم ہمیشہ کی طرح ایک طویل گفتگو میں محو ہو گئے اس نے مجھے ایک ایسا مشورہ دیا جو زندگی بھر میرے کام آنے والا تھا۔ اس گفتگو کا سلسلہ میرے گھر مہمان آ جانے پر ٹوٹا۔ میں نے یہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا کہ اچھا سائرہ بعد میں بات ہوتی ہے، مجھے کیا خبر تھی کہ وہ بعد کبھی نہیں آنے والا۔ میں اس طویل گفتگو میں بھی اس سے یہ پوچھنا بھول گئی کہ سائرہ تم اتنی کمزور کیوں لگنے لگی ہو۔ سوچا کسی دن پھر پوچھ لوں گی وہ کسی دن آیا ہی نہیں اور اچانک یہ تکلیف دہ خبر سننے کو ملی کہ سائرہ دل کے شدید دورے کے نتیجے میں اسپتال میں داخل ہو گئی۔ قلم قبیلہ بشمول میرے اور اس کی دوستوں، اس کی تحریروں کے مداحین کی ان گنت تعداد ہاتھ اٹھا کے، سجدوں میں جھک کے اس کے لیے دعا گو ہو گئی۔ سب ایک دوسرے سے رابطہ کر کے اس کے بارے میں پوچھ رہے تھے، رات گئے تک ہاتھ دعا کے لیے اٹھے رہے اور دل بے چین ہوتے رہے۔ اگلا پورا دن بھی اسی بے چینی اور رابطوں میں گزر گیا، تیسرے دن صبح فجر کے بعد دل کیا فون کھولوں کسی سے اس کے بارے میں پوچھوں لیکن ہمت نہیں ہوئی کیونکہ کوئی حوصلہ افزا خبر ملنے میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر دل کڑا کر کے اعتل سے پوچھا اعتل، سائرہ کے متعلق کوئی اپ ڈیٹ۔ جواب میں اعتل نے دل دہلا دینے والی خبر سنائی عنیزہ وہ چلی گئی...... میں فون ہاتھ میں لیے کتنی دیر دم بخود بیٹھی رہی۔

ان گنت کہانیوں کی خالق، خوب صورت اسکرپٹس سے اپنے ملک اور بیرون ملک شہرت پانے والی، آنے والے وقتوں کے لیے نہ جانے کیسے، کیسے خواب آنکھوں میں سجا رکھنے والی ہم سب کی سائرہ رضا رات کے نہ جانے کون سے پہر زندگی اور موت کی کشمکش میں زندگی ہار گئی۔ وہ دن قلم قبیلے پر بے حد بھاری رہا۔ سب ہی اتنے دکھی تھے کہ کسی کا کوئی کام کرنے پر دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اپنی دھن میں زندگی کے باغ میں قوسِ قزح کے رنگوں میں رنگی اڑتی پھرتی، اپنے من پسند ڈال پر کھلے پھولوں کا رنگ چوستی وہ تتلی موت کی مٹھی میں بند ہو کے دم دے گئی۔ اس کے سوکھے پر ہوا کے دوش پر نہ جانے کن دیسوں کی سیر کے لیے اڑ گئے اور ہم ہاتھ ملتے رہ گئے۔ دل ابھی تک غمزدہ ہے۔ اس کی بیٹیوں کے لیے بے چین ہے۔ کیونکہ خوب صورت تحریروں کے ساتھ، ساتھ وہ آبگینہ، تزکی اور اعناب کی شخصیتوں کی بنت اور اس گھر کی بھی خالق تھی جو آبگینہ، تزکی اور اعناب کا گھر تھا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ سائرہ کو اپنے خصوصی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور آبگینہ، تزکی اور اعناب کو ہمت اور صبر عطا فرمائے۔ ماں کی یہ لاڈلیاں زندگی کے میدان میں ماں کی طرح ہی سر اٹھا کے جنگ جوؤں کے انداز میں جئیں اور اپنی ماں کی آنکھوں میں اپنے لیے سجے خوابوں کو تعبیر میں ڈھال لیں۔ آمین

سائرہ رضا...... لفظوں سے جگمگانے والی روشنی

فہمیدہ جاوید ملتان

کچھ شخصیات لفظوں سے نہیں، دل سے پہچانی جاتی ہیں......

اور کچھ لوگ چلے جاتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ہمارا اندر کا ایک کونا اجڑ گیا ہو، جیسے کوئی مہربان سایہ تھا جو خاموشی سے دعائیں دیتا رہتا تھا اور اب وہ نہیں رہا۔ سائرہ رضا انہی سائے جیسی شخصیت تھیں۔ نرم، باوقار، خاموش مگر بہت گہرے اثرات چھوڑ جانے والی۔

سائرہ کی وفات کی خبر سن کر یوں لگا جیسے دل پر ایک بوجھ اتر آیا ہو جیسے اچانک خاموشی میں ایک آہٹ غائب ہو گئی ہو جیسے وہ صوفی سا لہجہ جو لفظوں میں بولتا تھا، اب خاموش ہو گیا ہو۔ اُن کے جانے سے ایک خلا پیدا ہو گیا

ہے......ایسا خلا جسے صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جس نے ان کی تحریروں کو دل سے پڑھا، جذب کیا اور ان لفظوں میں خود کو ڈھونڈا۔

وہ صرف مصنفہ نہیں تھیں۔ وہ انمول روشنی تھیں۔ وہ الفاظ کی وہ قسمت تھیں جو ہر قاری کی زندگی میں خوشبو بن کر اتری۔ جب وہ لکھتی تھیں تو صرف کہانی نہیں سناتی تھیں، وہ قاری کے زخموں پر مرہم رکھتی تھیں۔ ان کے ناول صرف عشق کی داستانیں نہیں تھیں، وہ روح کے سفر کی روداد ہوتی تھیں۔ اُن کی کہانیوں میں دکھ بھی ہوتا تھا، دردمندی بھی، مگر عجیب بات یہ کہ پڑھ کر دل سکون پاتا تھا اور مزاحیہ پن بھی ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے ہمارے دل کی آواز سن لی ہو اور لفظوں میں اُتار دی ہو۔

ان کی ہر کہانی میں عورت کا کرب، اس کی خاموشی، اس کی خودداری اور اس کا درد بہت گہرے انداز میں چھپا ہوتا تھا۔ لیکن وہ کبھی چیخ کر نہیں لکھتیں، وہ خاموشیوں کی زبان بولتی تھیں۔ اُن کی کہانیاں روایتی نہیں تھیں، وہ روحانی تھیں۔ وہ سوال چھوڑتی تھیں، اور کہیں اندر جا کے قاری خود ہی اُن کا جواب ڈھونڈنے لگتا تھا۔

سائرہ رضا کی تحریریں صرف پڑھنے کے لیے نہیں ہوتیں، وہ محسوس کرنے کے لیے ہوتی تھیں۔ ان میں سادگی بھی تھی، گہرائی بھی۔ وہ پیچیدہ باتوں کو اتنی آسانی سے لکھ دیتی تھیں جیسے وہ زندگی کے سب راز جانتی ہوں۔ ان کا ہر جملہ کسی دعا کی طرح لگتا تھا۔ کبھی وہ ایک بیٹی کے روپ میں بولتی تھیں، کبھی ایک ماں کی صورت میں، کبھی عاشقہ کی طرح، تو کبھی ایک صوفی درویش کی طرح تو کبھی ایک شوخ سی مگر اخلاق کے دائرے میں رہنے والی ہیروئن کی طرح۔

ان کا اندازِ بیان الگ تھا۔ وہ کسی بھی فیشن، کسی بھی لکھنے کی دوڑ میں شامل نہ تھیں۔ وہ اپنے انداز میں جیتی تھیں، اور اپنے انداز میں لکھتی تھیں۔ شاید اسی لیے ان کی تحریروں میں خلوص تھا، باوقار سا ہنسی مذاق تھا، محبت تھی، اور وہ درد تھا جو کاغذ سے نکل کر سیدھا دل میں اُترتا تھا۔

اور ان کی شخصیت......! جو کوئی ان سے ملا، اس نے کہا کہ وہ انسان نہیں، محبت کا پیکر تھیں۔ سادگی، حیا، شائستگی، اور عاجزی کا ایسا امتزاج تھیں کہ لگتا تھا جیسے صوفی سوچ کو جسم ملا ہو۔ ہر کسی کے لیے نرمی، ہر کسی کے لیے دعا، اور کسی کے لیے بھی تلخی نہیں۔ ان کے لبوں پر ہمیشہ مسکراہٹ، اور دل میں سب کے لیے خیر کی تمنا۔ ان جیسی رائٹر بن جانا شاید ممکن ہو، لیکن ان جیسا انسان بننا.... بہت مشکل ہے۔

ان کی وفات نے ہمیں ادب کے ایک دور سے محروم کر دیا ہے۔ ایک ایسا دور جو لفظوں سے روحانی تسکین دیتا تھا۔ آج جب ہر طرف شور، دکھاوا اور مصنوعی جذبات کا طوفان ہے، وہاں سائرہ آپی جیسے لوگ چراغ کی طرح جلتے رہے، روشنی دیتے رہے اور پھر خاموشی سے چلے گئے... مگر ان کی مہک باقی رہ گئی۔

ہم ان کے قاری، ان کے لفظوں سے پیار کرنے والے، صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ سائرہ آپ دنیا سے چلی گئیں، مگر آپ لفظوں میں زندہ ہیں۔ آپ ہمارے دلوں میں، ہماری دعاؤں میں، ہماری یادوں میں ہمیشہ رہیں گی۔ آپ کی تحریریں زندہ رہیں گی، اور ہر صفحے سے آپ کی موجودگی محسوس ہوتی رہے گی۔

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے، انہیں جنت کی وہ منزل عطا کرے جہاں محبت، روشنی، سکون، اور دعائیں بس ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں۔

Digest Library.com

بہت ملال رہ گیا

غزالہ نگار اورکزئی......امریکا

سائرہ کا اس طرح اچانک جانا سکتے میں ڈال گیا ہے۔ مجھے تو اس کی بیماری کا بھی پتا نہیں چلا۔ فیس بک کھولتے ہی غزالہ نقوی کی پوسٹ سے اس کے دنیا سے اٹھ جانے کی اطلاع ملی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

کمال کی رائٹر تھی۔ دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ تو میں نے خود بڑھ کے تھام لیا۔ وہ انسان بھی اتنی ہی پیاری اور اچھی تھی۔ جتنے اچھے افسانے اس نے لکھے۔ بس افسوس اس بات کا کہ بالمشافہ ملاقات نہ ہو پائی۔ دل میں بہت، بہت ملال رہ گیا ہے۔ بہت یاد آئے گی۔ اللہ اس کی روح کو شاد کام رکھیں۔ اس کی بچیوں کے والی وارث ہوں۔ اور اس کو اگلے جہان میں اپنی مرحومہ والدہ کے ساتھ خوش وخرم رکھیں۔ آمین!

اللہ کی اماں میں......

عالیہ بخاری کی تعزیت

اللہ کی اماں میں سائرہ اس کی رحمت میں رہو۔ اللہ پاک تمہاری بچیوں کے دلوں کو تھام لیں! آمین بہت بڑا دکھ دے گئیں اتنا اچانک......

اپنی عادت کی تبدیلی امرِ محال یا کارِ سہل

شائستہ زریں

عادت کیا ہے؟ خصلت، خُو، سرشت، طور طریقہ، لت، کوئی ایسا فعل جو ایک بار نہیں کئی بار غیر ارادی طور پر سرزد ہو عادت کے زمرے میں آتا ہے۔ مثلاً لوگوں سے حُسنِ سلوک سے پیش آنا اچھی اور برا رویہ رکھنا بری عادتوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اوروں کی بری، بھلی عادات کا تجزیہ کر کے اس پر تبصرہ کرنا بہت آسان ہے لیکن جب بات اپنی اچھی، بری عادات کے بیان کی آجائے تو یہی کارِ سہل بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اپنی اچھی عادت کے بارے میں گفتگو کرنے سے حجاب آتا ہے، خود ستائی کا احساس ہوتا ہے کہ یہ تو اوروں کا کام ہے ہمارا نہیں اور جب بات اپنی بری عادت کے تذکرے کی ہو تو جھجک دامن گیر ہوتی ہے گویا آپ خود ہی اپنی ناقدانہ تلوار کی زد پر ہیں۔ اچھی عادات تو خیر ہوتی ہی بھلی ہیں لیکن اپنی بری عادتوں پر قابو پانے کی خواہش ہر ذی شعور انسان کے اندر پنپ رہی ہوتی ہے۔ جو عادتیں زیادہ پرانی نہ ہوں ان کو بدلنا تو شاید آسان ہوتا ہے لیکن جو عادات اتنی پختہ ہو گئیں کہ عادتِ ثانیہ کے زمرے میں آتی ہیں ان کی تبدیلی گویا خود کو آزمائش میں ڈالنے کے مترادف ہے کہ تبدیلی کے اس عمل سے گزرتے ہوئے اندر ایک جنگ چھڑ جاتی ہے اور جنگ بھی وہ جس کے... مدِمقابل حریف آپ خود ہوں۔ اس ضمن میں ہر شخص کا تجربہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ حقائق جاننے کے لیے ہم نے معلوم کیا کہ......

سوال 1۔ آپ کی وہ اچھی عادت جو آپ کے قلبی سکون کا باعث بنتی ہے اور وہ بری عادت جس کی وجہ سے آپ کو شرمندگی یا نقصان اٹھانا پڑتا ہے؟

سوال 2۔ عادتیں بدلنا آسان ہوتا ہے یا خود سے جنگ لڑنی پڑتی ہے؟ آپ کا تجربہ کیا کہتا ہے؟

Digest Library.com

سلمیٰ غزل

قلم کار، شاعرہ

1۔ میری یہ اچھی عادت ہے کہ اپنا ہو کہ غیر میں ہر طرح سے اس کے کام آنے کی کوشش کرتی ہوں۔ مالی، جسمانی، روحانی۔ مثلاً اکثر میں دوسروں کے کہنے پر روزے بھی رکھ لیتی ہوں۔ سلمیٰ تم روزہ مان لو اللہ ضرور سنے گا کہ ہمارا یہ کام ہو جائے اور یہی میری بری عادت ہے۔ شرمندگی تو خیر کبھی نہیں ہوئی مگر نقصان ضرور اٹھانا پڑا۔ میری اس عادت سے بچے خوش ہیں نہ میاں خوش تھے۔ بلکہ میری نواسی تو اکثر کہتی ہے ”نانو آپ خود کو اتنا underestimate کیوں کرتی ہیں؟“ مگر اس عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے۔

2۔ میں سمجھتی ہوں کہ عادت بدلنا کافی مشکل کام ہے۔ میں بہت بولتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ کم بولوں لیکن لگتا ہے زبان میں کھجلی ہو رہی ہے۔ خاموش رہنا کافی مشکل لگتا ہے۔ لگتا ہے خود سے جنگ لڑنی پڑتی ہے حالانکہ زیادہ تر لوگ یہی کہتے ہیں کہ آپ خوب اور اچھا بولتی ہیں (بھئی میاں مٹھو نہیں بن رہی) ان زیادہ تر لوگوں میں مجھے بھی شامل کر لیجیے (زریں) مگر میں خود بھی اپنی اس عادت سے زیادہ خوش نہیں لیکن شوہر کے جانے

کے بعد اب بولنے کا موقع کم ہی ملتا ہے کیونکہ وہ کم بولتے تھے اور کہتے بھی تھے تم کتنا بولتی ہو تھکتی نہیں ہو۔ مگر میں کیا کروں مجھے بولنا اور سننا دونوں ہی اچھا لگتا ہے۔ ویسے میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ زیادہ بولنے والے دل کے صاف ہوتے ہیں۔ میرے بڑے بھائی مرحوم بہت کم بولتے تھے اور امی مرحومہ بھی، کبھی غصے میں کہتی تھیں گھنا ہے ہاتھی کی طرح دل میں رکھتا ہے۔ اور مجھے اور ان کو ہم دونوں کو ہنسی آجاتی تھی۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ بولتے رہنا چاہیے کتھارسس کے لیے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ (کہیے قارئین! کیا خیال ہے؟)

سیما رضا مصنفہ،
براڈ کاسٹر، شاعرہ

1۔ کسی کا کام out of way جا کر کرنا روحانی خوشی دیتا ہے۔ بری عادت میرے نزدیک یہ ہے کہ میں وہاں بول پڑتی ہوں جہاں بالکل نہیں بولنا چاہیے اور پھر مجھے شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ عجیب عادت ہے۔ بے ساختہ ہوتا ہے یہ سب مگر پھر لوگ مجھے جذباتی اور جلد باز کہتے ہیں میں کوشش کرتی ہوں یہ عادت ختم کرلوں کیونکہ خاموشی میں راحت ہے اور حفاظت بھی چھپ جاتی ہے۔

2۔

خدا کا شکر ہے میں خود شناس ہوں ورنہ
بدلتا کون پُراسرار عادتیں میری

عادتیں بدلنا بہت مشکل کام ہے۔ ایک زمانے میں میں نے اسٹریٹ تھیٹر شروع کیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں اسٹریٹ تھیٹر ایک نشہ ہوتا ہے اس میں سے آپ نکل نہیں سکتے کہ یہ آپ کی عادت بن جاتی ہے۔ آصف مالک بہت اچھے تھیٹر رائٹر ہیں۔ ان کی خواہش پر میں نے ایک تھیٹر ''دل کے اس پار'' کیا اس کے بعد ''دادی اماں کی کہانی'' کی اور پھر چسکا پڑ گیا۔ پھر آرٹس کونسل میں کرتے رہے۔ ایک دن مجھے یاور بھائی (یاور مہدی صاحب) نے بلایا اور کہا کہ آپ تھیٹر نہیں کیجیے، یہ آپ کی جگہ نہیں ہے۔'' مگر کیوں یاور بھائی؟ میں نے کہا تو آپ نے کہا میں کہہ رہا ہوں ناں کہ آپ نہ کریں۔'' مجھے بہت افسوس ہوا کہ مجھے کیوں منع کر رہے ہیں۔ پھر میں نے محسوس کیا میرا تھیٹر کرنا ابو کو پسند نہیں ہے اسی وقت میں نے فیصلہ کرلیا اب تھیٹر نہیں کروں گی۔ آصف مالک سے کہا تو انہوں نے کہا مشکل ہے اس فیلڈ سے نکلنا۔ میں نے کہا کہ میں کر کے دکھاؤں گی۔ تو کچھ لوگ اور کچھ تعلق ہوتے ہیں جو اس وقت روک دیتے ہیں اور پھر اپنے ابو اور اپنے والد معنوی (یاور مہدی صاحب) کی خواہش پر اپنی تھیٹر والی عادت بالکل ختم کردی۔ اپنے آپ کو منع کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خود سے جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ ابو اور یاور بھائی کی بات ماننے کا فائدہ یہ ہوا کہ بہت ساری کامیابیاں میرے حصے میں آئیں کیونکہ ریڈیو میرے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ اللہ کی عطا کردہ زرخیز تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت میرے کریڈٹ پر ریڈیو سے کئی کامیاب پروگرام نشر ہوئے اور اللہ کے کرم سے شاندار کارکردگی پر کئی اعزازات سے نوازا گیا۔

غزالہ عزیز
لکھاری، ڈراما نگار

1۔ اچھی عادت یہ ہے کہ اپنی بساط کے مطابق کسی کی بھی مدد کرنے کو ہر وقت تیار رہتی ہوں جو میرے لیے قلبی سکون کا باعث بنتی ہے۔ بری عادت یہ کہ لوگوں پر نہ چاہ کر بھی بھروسا کرلیتی ہوں اور ہمیشہ نقصان اٹھاتی ہوں۔ یہ عادت چھوڑنا چاہتی ہوں لیکن

بندہ بشر ہوں۔ پھر سے بھروسا کرنا پڑتا ہے یہی زندگی ہے۔ اور اس زندگی میں شامل مختلف عادات اور فطرت کے مالک لوگ بارٔبار زور آزماتے ہیں۔ میں اپنی روش پہ قائم بار، بار دھوکا کھاتی ہوں۔

2۔ میرے خیال میں عادتیں بدلنا آسان ہوتا ہے۔ مگر کچھ پختہ عادتیں ترک کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کسی بھی انسان کے لیے کوشش کا پہاڑ سر کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ کیونکہ انسان بذاتِ خود ایک مضبوط چٹان کے مانند ہوتا ہے۔ وہ ہر بلند چوٹی سر کرسکتا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ میں بھی کچھ عادتیں بدل نہیں پائی ہوں۔

تسنیم ماپارا

شیف، پاکیزہ قاری

1۔ الحمدللہ سب کے ساتھ افہام و تفہیم سے رہنا درگزر کرنا اور اللہ کی خاطر معاف کر دینا میری اچھی

عادتوں میں سے ہے اور باعثِ سکون بھی۔ ویسے تو ایسی کوئی بری عادت نہیں جس کی سے شرمندگی ہو اور نقصان بھی اٹھانا پڑا ہو۔

2۔ عادتیں بدلنا بالکل آسان نہیں۔ آپ کو اپنے آپ سے جہاد کرنا پڑتا ہے۔ دل و دماغ کو سمجھانا پڑتا ہے اور یہ ایک مشکل عمل ہے کیونکہ شیطان بار، بار اکساتا ہے اور غلط راہ کی طرف ہی متوجہ رکھتا ہے۔ سو جنگ تو دل و دماغ سے چلتی ہی رہتی ہے۔ اور یہ مرحلے زندگی میں اکثر و بیشتر آتے رہتے ہیں اور ایسے موقعوں پر بہت سمجھداری سے کام لینا ہی عقلمندی کا تقاضا ہے۔

ہما علی

رائٹر، شاعرہ

1۔ کبھی میں نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا کہ

میری اچھی عادتیں کیا ہیں آج آپ کے سوال نے سوچنے پر مجبور کر دیا تو جناب دوسرے کے کام آکر، مدد کر کے چاہے وہ مالی ہو یا اور کسی طریقے سے اور اکثر پرندے اور بلیاں جو میری پالتو نہیں ہیں لیکن ان کے کھانے کا خیال رکھ کے خصوصاً ٹھنڈا پانی ان کے برتن میں ضرور ڈالتی ہوں یہ سوچ کر کہ یہ بھی اللہ کی مخلوق ہے جیسے ہمیں گرمی لگتی ہے۔ پھر جس وقت کوئی اور چڑیاں وہ پانی پی رہے ہوتے ہیں تو بڑی قلبی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ بری عادت یہ ہے کہ ہت جلد دوسروں پر اعتبار کر لیتی ہوں۔ شرمندگی تو اللہ کے کرم سے کبھی نہیں ہوئی ہاں البتہ نقصان ضرور اٹھایا ہے۔

2۔ عادتیں بدلنا تو میرے نزدیک مشکل نہیں ہوتا ہاں اگر فطرت کی بات ہو تو وہ مشکل ہوتا ہے۔ میں شروع ہی سے بہت سمجھوتا کرنے والی ہوں۔ اس لیے ہر طرح کے ماحول میں بڑی آسانی سے ایڈجسٹ کر لیتی ہوں۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے عورت کی فطرت میں یہ چیز رکھی ہے کہ وہ ہر طرح کے ماحول میں خود کو ڈھال لے۔

صائمہ قیصر

رائٹر، شیف

1۔ میرے لیے خوشی اور غم دونوں میں نماز ادا کرنا

اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا، اللہ تعالیٰ سے اپنے جذبات شیئر کرنا، فیملی کے لیے کچھ بہتر کرنا، کسی کی مالی و اخلاقی معاونت کرنا قلبی سکون کا باعث بنتا ہے۔ جبکہ بلا سوچے سمجھے سیدھی بات کر دینا یا ہر موقع پر کھرا سچ بول

دینا کہ جہاں بات کو طریقے سے یا بنا کر کرنا بھی ضروری ہو۔ کبھی، کبھی شرمندگی یا نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔

2۔ عادتیں آسانی سے نہیں بدلی جاتیں۔ لیکن جن کا مقصود بھلائی ہو۔ خواہ اپنی یا دوسرے کی وہ خود کو بدلتے ہیں، چاہے خود سے جنگ لڑنا پڑے۔ یا پھر خود کو جذباتی طور پر مار کر ماحول کو پراگندہ ہونے سے بچالیا جائے۔ بہت سے انسان ایسے ہیں جنہوں نے اپنی ''میں'' مار کر اوروں کی زندگیاں پُر بہار کر دیں اور سچ تو یہ ہے کہ عادت تو کیا فطرت کو بدل لینا بھی صرف انسان کی ہی معراج ہے۔ ورنہ حیوان تو اس خاصیت سے محروم ہیں۔

دعا یہ ہے کہ ہم میں اگر کچھ بری عادات موجود ہیں تو اللہ تعالیٰ ہمیں ان عادات کو بدل کر بہتر عادت اپنا لینے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے آمین!

المیس جبار

لکھاری

1۔ میں خاصی دیر تک اس سوال کا جواب سوچتی رہی خاصا مشکل سوال ہے لیکن اچھا سوال ہے۔ اس تیز رفتار زندگی میں ذرا دیر رک کر اپنے اندر جھانکنے کا موقع ملا اچھی عادت یہ ہے کہ میں دوسروں کو بینیفٹ آف ڈاؤٹ (یعنی شک کا فائدہ) دیتی ہوں۔ فلاں نے ایسا کیا یا کہا تو اس کے پیچھے ضرور یہ وجہ ہوسکتی ہے اس لیے خود بھی مطمئن رہتی ہوں یا خود کو مطمئن کر لیتی ہوں، بری عادت؟ ہمارا غصہ جو اکثر ہی ہمیں شرمندہ کرواتا ہے۔ لیکن اب اس پر قابو پانا سیکھ لیا ہے۔

2۔ عادتیں بدلنا آسان نہیں ہوتا خود سے جنگ لڑنی پڑتی ہے اسی کو تو جہاد بالنفس کہتے ہیں اور یہ جدوجہد ہماری آخری سانس تک جاری رہتی ہے اور اگر ہم اپنی عادتیں نہیں بدلتے تو نہ ہماری زندگی بدلتی ہے، نہ ایمان بڑھتا ہے، نہ دل میں تغیر بپا ہوتا ہے۔ وہ تغیر جو دل میں کسی بری عادت کو چھوڑنے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور سکون میں ڈھل جاتا ہے تو عادتیں بدلنا آسان نہیں ہوتا لیکن جب یہ بدل جائیں تو پھر بہت سی آسانیاں اور بہت سا سکون لے کر آتی ہیں۔

ثوبیہ خانم

ٹی وی پروڈیوسر

1۔ اپنے قریبی لوگوں کی بہتری کے لیے جی جان سے کوشش کرتی ہوں اور کسی بھی حد تک جا سکتی ہوں۔ پھر مثبت نتیجہ ملنے پر قلبی سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ جب مجھے کوئی ناپسندیدہ بات کہی جائے یا کسی کی کوئی حرکت ناگوار گزرے تو میں دل پر جبر کر کے سہہ لیتی ہوں۔ جس کی وجہ سے دماغی بے سکونی ہوتی ہے جو صحت پر منفی اثر ڈالتی ہے۔ اور صحت کا نقصان یقیناً بہت بڑا ہوتا ہے۔

2۔ عادتیں بدلنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا اس کے لیے خود سے شدید جنگ لڑنی پڑتی ہے۔

وردہ بخاری

شاعرہ، لکھاری

1۔ حقیقی خوشی اور سکون تو دوسروں کو خوشی دینے میں ہے۔ تواضع یہی ہے، دردمندی یہی ہے۔ میری اچھی عادت یہ ہے کہ میں لوگوں سے بدلہ نہیں لیتی۔ کوئی عزتِ نفس کو ٹھیس پہنچائے تو کنارہ ضرور کر لیتی ہوں (گو کہ بعض دفعہ قریبی رشتوں کے باعث یہ بھی ممکن نہیں ہوتا) تو میں اپنے رب کے فیصلے کا انتظار کرتی ہوں، فوری طور پر غصہ روک لیتی ہوں اور جواب نہیں دیتی تو یقین جانیں مجھے اس کا بعد میں بہت فائدہ ہوا۔ گو نفس ہمیشہ کھل کر جواب دینے پر اکساتا ہے۔ بے شک وہ رب بہترین جواب دینے والا ہے۔ آپ کو کوئی کانٹا بھی چبھ جائے تو وہ اسے جانے نہیں دیتا اور جب میں لوگوں کی اٹھتی انگلیاں اور جملے خود اُن کی طرف پلٹتے دیکھتی ہوں تو اپنے رب کی

رحمت پر یقین کچھ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ بقول میرے امی، ابو میری بری عادت یہ ہے کہ ان کے گھر رہنے جاتی ہوں تو کمرا بہت بکھیرتی ہوں۔ کمرا تو خیر بچے بکھیرتے ہیں، ہاں میں فوری طور پر سمیٹتی نہیں ہوں۔ امی کے گھر جاتے ہی شدید قسم کی سستی سوار ہو جاتی ہے۔ دل ہر طرح کی روٹین سے ہٹ کر کام کرنا چاہنے لگتا ہے۔

2۔ عادتیں بدلنا قطعاً آسان نہیں ہوتا ہے اس لیے بچپن ہی سے بچوں کو ڈسپلن سکھانا چاہیے۔ دیر سے سو کر اٹھنا آج کل کے بچوں اور نوجوانوں کی عادت بن گئی ہے۔ اور اسے ترک کرنا ان کے لیے سخت محال ہے لہٰذا جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو دفتر جانے میں تاخیر ہوتی ہے۔ شادی کے بعد لڑکیوں کو گھر سنبھالنا پڑتا ہے تو مسئلہ ہو جاتا ہے۔ بچوں کی تربیت میں یہ بات شامل... کرنی چاہیے کہ صبح کا وقت برکت والا ہوتا ہے صبح سویرے کام شروع کرنے کے لیے رات جلد سونا اور صبح جلدی اٹھنے کی عادت بہت ضروری ہے۔

فرحت انصاری

ٹیچر، رائٹر

1۔ عادت انسانی کردار کا نہ صرف پتا دیتی ہے بلکہ اس سے انسانی کردار کی شناخت بھی ہوتی ہے۔ ہر انسان اچھی بری عادات کا مالک ہوتا ہے۔ مجھ میں بھی دونوں عادتیں ہیں۔ اپنی ذات میں جھانکنا بعض اوقات مشکل امر ثابت ہوتا ہے۔ بہر حال سوالنامہ ملتے ہی فرصت میں خود کو جھانکا تو مجھے احساس ہوا کہ میں بہت صاف دل کی مالک ہوں۔ لوگوں کی خود سے کی گئی ساری زیادتیاں محض اللہ کی رضا کی خاطر بھلانے والی، نرم دل اتنی کہ کسی کے بارے میں بدگمانی دل میں آنے ہی نہیں دیتی اگر آ جائے تو یہ خیال سوچ کر جھٹک دیتی ہوں کہ مجھے وہم ہوا ہے یا میری غلط فہمی ہے۔ حالانکہ میں خوابوں کی دنیا کی باسی بھی نہیں ہوں اور اسی حقیقت پسندی سے زندگی میں آئے ہر خوشی و غم کا سامنا کرتی ہوں۔ رہی بات بری عادت کی تو سب سے بری عادت یہ ہے کہ لوگوں کے جھوٹ اور دھوکے کو سچ سمجھ کر اکثر دھوکا کھا جاتی ہوں۔

2۔ کہاں بھئی! عادات بدلنا کب آسان ہوتا ہے۔ خود سے اچھی خاصی جنگ کرنا پڑتی ہے۔ ہر دھوکا زندگی کا ایک نیا سبق دیتا ہے مگر جب اگلا دھوکا کھاتا ہے تو پچھلا سبق بھول چکا ہوتا ہے۔ عادات بدلنے کے لیے اپنی شخصیت بدلنا پڑتی ہے اور میری فطرت میں بار، بار شخصیت بدلنا نہیں ہے۔ الحمدللہ میرا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ بعض اوقات لوگ میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ذاتی مفاد پورے کرتے ہیں۔ اکثر بعد میں اصلیت کھل جاتی ہے مگر میں کسی سے بحث و مباحثہ نہیں کرتی اور خاموشی سادھ لیتی ہوں۔ البتہ قدرے محتاط ضرور ہو جاتی ہوں۔

اسما حسین

آر جے ایف 101

1۔ مہمان کے آنے پر ہمیشہ خوش ہونا۔ سب سے

مخلص ہونا اس سے مجھے قلبی سکون ملتا ہے۔ بہت جلد سب پر اعتبار کر لیتی ہوں جس کی وجہ سے نقصان بھی اٹھاتی ہوں۔

2۔ عادتیں بدلنا اتنا مشکل نہیں ہوتا اگر کوئی بدلنا چاہے تو۔ اور اللہ پاک نے انسان کو اتنا طاقتور بنایا ہے کہ وہ اپنی منفی عادات کو اپنی قوت ارادی سے مثبت میں بدل لے۔

☆☆☆

معزز قارئین! شرکا کی اچھی بری عادتوں کے بارے میں پڑھ کر کہیں نہ کہیں آپ نے بھی کچھ نہ کچھ سیکھا ضرور ہوگا۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن باشعور افراد ان کمزوریوں، خامیوں اور برائیوں کے خاتمے کے در پے رہتے ہیں خواہ اس کے لیے ان کو اپنے اندر کے طوفانوں سے ٹکرانا کیوں نہ پڑے۔

☆☆☆

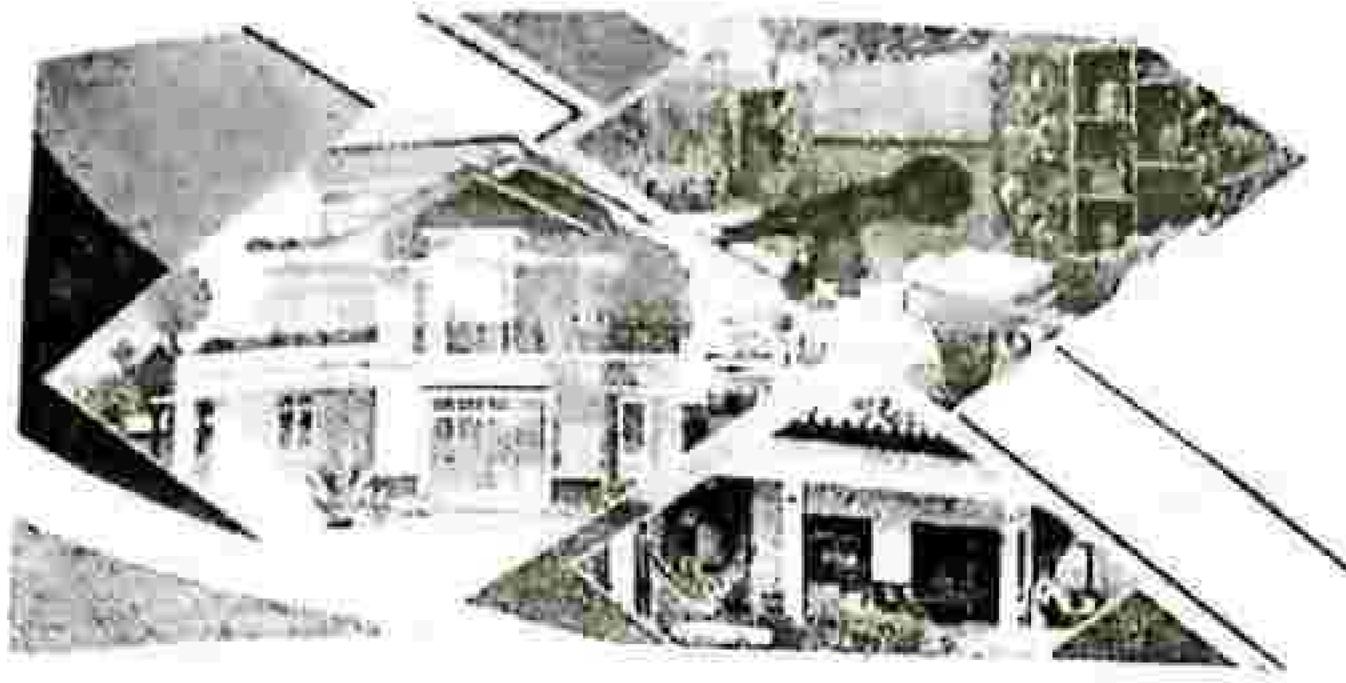

گھر آنگن کے تارے

بنتِ زیب

بہنا ہے میرا گہنا

ممتاز سماجی و ادبی شخصیت شگفتہ فرحت اور شائستہ فرحت سے دلچسپ گفتگو

Digest Novels Lovers Group

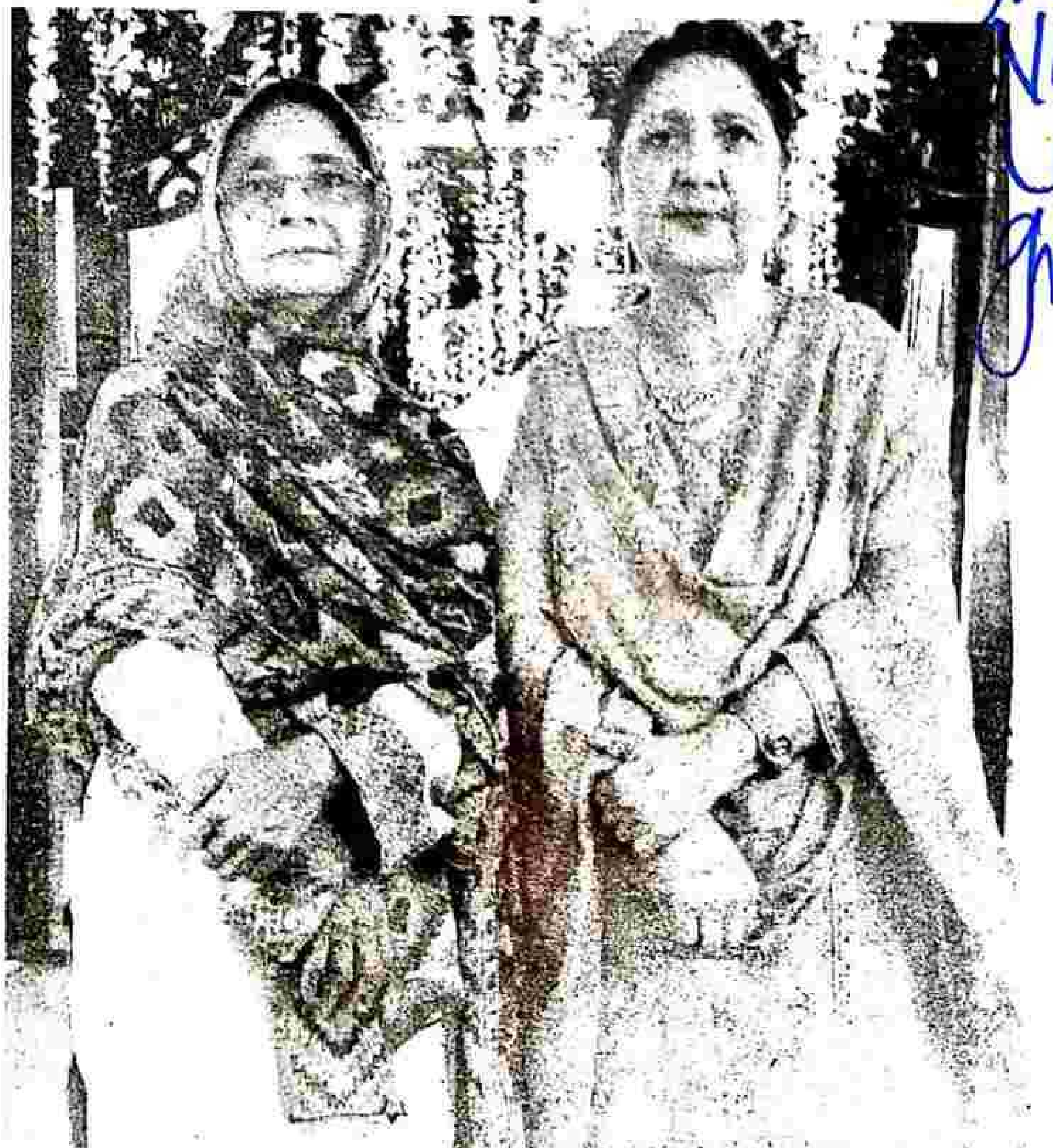

شگفتہ فرحت اور آپ کی بڑی بہن شائستہ فرحت دونوں نے اپنی والدہ ساجدہ بیگم فرحت بھوپالی کی وراثت سے قلم کا ہنر لیا اور نہایت کمسنی سے لکھنے کا آغاز کردیا۔ دونوں نے غیر نصابی سرگرمیوں میں خوب حصہ لیا۔ کالج کی یونین کے انتخابات میں بھاری اکثریت سے نائب صدر منتخب ہوئیں۔ بزم ادب کی سیکرٹری اور کالج کی مدیرہ رہیں۔ زمانہ طالب علمی میں شائستہ نے کئی افسانے لکھے آپ کے طنز و مزاح

سے بھرپور مضامین کئی رسائل میں شائع ہوئے آپ نے صحافت میں ایم اے کیا اور مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق افراد کے انٹرویوز کیے۔ کراچی کی مختلف ادبی و سماجی تنظیموں اور اداروں سے آپ کی وابستگی رہی۔ شادی کے بعد سعودی عرب چلی گئیں لیکن اب کراچی میں مقیم ہیں اور اپنی گھریلو ذمے داریوں کی ادائیگی کے ساتھ، ساتھ مطالعہ اور قلم دوستی بھی نبھا رہی ہیں۔ چھوٹی بہن شگفتہ فرحت نے اسکول کے زمانے سے بچوں کے رسائل میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ادبی و سماجی موضوعات پر آپ کے مضامین اخبارات، جرائد اور ماہناموں میں چھپتے رہے اپنے آباؤ اجداد سے محبت کا عملی ثبوت پیش کرتے ہوئے آپ نے ایک ہزار صفحات پر محیط ''تذکرۂ شخصیاتِ بھوپال'' لکھا جو کتابی شکل میں شائع ہوا۔ کتاب کی تقریب اجرا میں محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان خاص طور پر بطور مہمان خصوصی اسلام آباد سے تشریف لائے تھے۔ سماجی، ثقافتی امور میں آپ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں اس سفر میں آپ کے ہم سفر اویس احمد ادیب انصاری آپ کا بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔ شگفتہ فرحت کے قائم کردہ محبانِ بھوپال فورم اور بھوپال انٹرنیشنل فورم کے پلیٹ فارم سے ایک ہزار سے زائد کامیاب تقریبات کا انعقاد کیا جا چکا ہے۔ ''عکسِ بھوپال'' کے نام سے آپ نے تین ضخیم مجموعے شائع کیے۔ شگفتہ فرحت کو ان کی خدمات پر کئی انعامات و اعزازات سے سرفراز کیا گیا۔ آپ کراچی کی نمائندہ تنظیموں آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی، کراچی پریس کلب، اہلیانِ شہرِ قائد، عالمی مشاعرہ کمیٹی، ساکنانِ شہرِ قائد ٹرسٹ کی بہت فعال رکن ہیں۔

شائستہ فرحت اور شگفتہ فرحت ایک جان دو قالب ہیں۔ آپ نے ہمارے سلسلے ''گھر آنگن کے تارے'' میں شرکت کے لیے خاص طور پر اور بخوشی وقت نکالا کہ پاکیزہ سے دلی تعلق محسوس کرتی ہیں۔ بہنوں کا باہمی اخلاص، محبت، ایثار ان کی زندگی کی زیب و زینت کے لیے کسی گہنے سے کم نہیں کہ دونوں ہی ایک دوسرے کی آن، بان اور شان ہوتی ہیں۔ چلیں قارئین ان دونوں بہنوں سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......بچپن شرارتیں کرتے گزرا یا پڑھائی، پڑھائی اور صرف پڑھائی کرتے؟

شائستہ فرحت ❖......دونوں ہی کام ہوتے تھے۔

شگفتہ فرحت ❖......ہم صرف پڑھاکو ہی نہیں تھے بلکہ جب، جہاں موقع ملا خوب شرارتیں کیں۔

پاکیزہ ✧......بچپن میں سب سے زیادہ کس کھیل میں مزہ آتا؟

شائستہ فرحت ❖......رسی کودنا، چھپن چھپائی۔

شگفتہ فرحت ❖......بچپن میں پہل دوج اور چھپن چھپائی پسندیدہ کھیل تھے۔

پاکیزہ ✧......کبھی والدین سے شکوہ ہوا کہ ''اس کو'' مجھ سے زیادہ چاہتے ہیں؟

شائستہ فرحت ❖......نہیں کبھی نہیں کیونکہ آخری پیس ہونے کی وجہ سے شگفتہ سب کی لاڈلی تھی۔ ہماری بھی۔ پھر شکوہ کیسا؟

شگفتہ فرحت ❖......شکوہ کبھی نہیں کیا۔ وہ بڑی

[illegible] ڈراما نگار حسینہ معین کے ساتھ دونوں بہنوں کی ایک یادگار تصویر

ہونے کے ناتے ان کو زیادہ فوقیت دیتے اور چاہتے تھے کیونکہ شائستہ فرحت کی بات میں وزن اور سمجھداری ہوتی تھی۔

پاکیزہ ✧......بہنوں میں دوستی کا آغاز کب اور کیسے ہوا؟

شائستہ فرحت ❖......عمر میں فرق ہونے کے سبب دوستی کم ہی رہی لیکن ان کے بڑے ہونے کے بعد سب برابر ہوگئے۔

شگفتہ فرحت ❖......دوستی نہیں کہہ سکتے، ان سے ہمیشہ ذہنی ہم آہنگی رہی۔ دوستی انہوں نے ہمیشہ اپنی سطح کے لوگوں سے کی، بھلا ہم کس گنتی میں تھے۔

پاکیزہ ✧......بچوں میں بہت معصوم سی لڑائیاں ہوتی ہیں دونوں کی بچپن کی کوئی لڑائی جسے یاد کر کے آج بھی بے ساختہ ہنس دیتی ہیں؟

شائستہ فرحت ❖......ہماری عمروں میں فرق ہونے کی وجہ سے لڑائی تو کبھی نہیں ہوئی ہاں شگفتہ نے پیار بہت بٹورا ہمارا۔

شگفتہ فرحت ❖......لڑائی جھگڑا؟ توبہ توبہ الحمدللہ! آج تک نوبت نہیں آئی۔ بچپن تو خیر دور کی بات ہے۔

پاکیزہ ✧......بچپن کی وہ ایک یاد جو بھلائے نہیں بھولتی؟

شائستہ فرحت ❖......بچپن اور لڑکپن کی ایک ناقابلِ فراموش یاد جو تکلیف دہ بھی ہے جب مشرقی پاکستان کو پاکستان سے جدا ہوتے دیکھا یعنی دو بھائی جدا ہوگئے۔ ٹکڑے، ٹکڑے ہوگئے یہ ایک تلخ حقیقت تھی جسے بالآخر تسلیم کرنا ہی پڑا۔ میرے لیے اس کو بھلانا ممکن نہیں۔

شگفتہ فرحت ❖......آٹھویں کلاس میں جب میں نے سعدی گرلز لوئر سیکنڈری اسکول کے یونین الیکشن میں بھاری اکثریت سے نائب صدر کا انتخاب جیتا تھا۔ صدر کا عہدہ ہماری ہیڈ مسٹریس مس بدر خان کے پاس تھا جو یونین انچارج اور ہم سب کی پسندیدہ تھیں۔ پہلی مرتبہ باقاعدہ طالبات کے ووٹ سے الیکشن جیتنے کی بہت خوشی ہوئی تھی عجب سا فخر محسوس ہوا تھا کہ طالبات نے ہم پر اعتماد کیا ہے۔ یہ ایک بہت ہی خوشگوار اور ناقابلِ فراموش واقعہ بن گیا۔

پاکیزہ ✧......زمانۂ طالب علمی میں غیر نصابی سرگرمیوں میں کون بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا؟

شائستہ فرحت ❖......دونوں نے ہی اپنے، اپنے زمانۂ طالب علمی میں غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

شگفتہ فرحت ❖......بہت زیادہ حصہ لیا مگر شائستہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بہت آگے تھیں۔ ان کو ہی دیکھ کر ہم نے سیکھا۔

پاکیزہ ✧......بڑی بہن نے لاڈ زیادہ اٹھائے یا اپنے کام زیادہ کروائے؟

شائستہ فرحت ❖......ہم نے بڑی بہن ہونے کے ناتے شگفتہ کے زیادہ لاڈ اٹھائے اور ان

شگفتہ فرحت معروف صحافی حمیرا اطہر کو اپنی کتاب شخصیات بھوپال پیش کرتے ہوئے

digest library.com

امریکی ثقافتی مرکز واقع کراچی میں شائستہ فرحت اور عصمت کھتری علی پٹیل صاحب کے ساتھ

کے کام بھی زیادہ کیے۔

شگفتہ فرحت ❖...... چھوٹی ہونے کی وجہ سے انہوں نے ہمارے بہت ناز اٹھائے اور ہمارے ان گنت کام بھی بہت کیے مگر ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ان کا حق ادا نہ کر سکے۔

پاکیزہ ✧...... آپ کے بچپن کی وہ ایک خوبی جو آج تک قائم ہے؟

شائستہ فرحت ❖...... بچپن ہی سے مطالعے اور لکھنے کا شوق دونوں میں رہا جو آج تک قائم ہے۔

شگفتہ فرحت ❖...... مطالعہ کرنا اور دوسروں کے کام آنے کی کوشش کرنا۔

پاکیزہ ✧...... بہنوں کی باہمی محبت کے لیے لفظی اظہار ضروری ہے یا رویّہ ہی کافی ہے؟ آپ کا طرزِ عمل کیا ہوتا ہے؟

شائستہ فرحت ❖...... لفظی اظہار ضروری نہیں طرزِ عمل، رویّے سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔

شگفتہ فرحت ❖...... ہم دونوں بہنوں کو کبھی اظہار کی ضرورت نہیں پڑی، بہترین رویّہ، لب و لہجہ، ایک دوسرے کے کام آنا ہی لفظی اظہار کے مترادف ہے۔ بعض باتیں بار، بار اظہار اور محبت جتانے سے اپنی وقعت کھو دیتی ہیں۔

پاکیزہ ✧...... دونوں کی غذائی عادات میں کتنے فیصد مطابقت ہے؟

شائستہ فرحت ❖...... میں کھٹا، چٹپٹا سب الم غلم کھا لیتی ہوں شگفتہ ذرا میانہ روی سے چلتی ہیں۔

شگفتہ فرحت ❖...... میں سبزیوں، ترکاریوں کی شیدائی ہوں وہ نہیں، وہ دالیں، چاول اچار، چٹنی۔ نت نئی چیزیں اور خاص طور پر چٹپٹی چیزیں زیادہ شوق سے کھاتی ہیں، میں کم کھاتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... طبعاً، عادتاً ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہیں؟

شائستہ فرحت ❖...... بہت زیادہ۔ یوں سمجھ لیجیے ان معاملات میں ہم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

شگفتہ فرحت ❖...... عادتاً اور طبعاً دونوں کے مزاجوں میں خاصا فرق ہے میں جلد باز ہوں جبکہ وہ بہت سوچ سمجھ کر اور پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنے کام کرتی ہیں۔

پاکیزہ ✧...... امی سے وہ کیا سیکھا؟ جس پر آج بھی فخر محسوس کرتی ہیں؟

شائستہ فرحت ❖...... امی کی تحریریں ساجدہ بیگم فرحت بھوپالی کے نام سے اخبارات اور رسائل میں چھپتی تھیں وہ شاعرہ و ادیبہ تھیں دونوں بیٹیوں نے ان

Digest library.com

سے فیض حاصل کیا۔

شگفتہ فرحت ❖......امی شاعرہ، ادیبہ اور افسانہ نگار تھیں ہمیں فخر ہوتا تھا کہ امی اتنی اچھی شاعرہ اور لکھنے والی ہیں تو اس سے ہم نے بہت کچھ سیکھا اور فیضیاب ہوئے۔

پاکیزہ ✧......ماں کے ہاتھ کا ذائقہ کس کے ہاتھ میں زیادہ ہے؟

شائستہ فرحت ❖......میں تو بس پکا لیتی تھی شگفتہ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔

شگفتہ فرحت ❖......ماں کے ہاتھ کا ذائقہ کسی نے نہیں لیا۔ بچپن میں بہن کے ہاتھوں کی گرم، گرم روٹیاں اور اس میں گھی لگا کر ان ہی کے ہاتھ کا بنا ہوا مسالا چپڑ کر کھاتے تھے تو بہت مزہ آتا تھا وہ ذائقہ ہم آج تک نہیں بھولے۔

پاکیزہ ✧......والدین نے آپ کی کون سی خوبی کو سب سے زیادہ سراہا اور سب سے بڑا گلہ ان کو آپ سے کیا رہا؟

شائستہ فرحت ❖......والدین تو اب رہے نہیں اس لیے نہیں پتا کہ کون سی خوبی کو سراہا اور کیا گلہ رہا ہوگا۔

شگفتہ فرحت ❖......والدین ہماری غیر نصابی سرگرمیوں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ سراہتے تھے۔ کبھی ان کو ہم سے کوئی گلہ نہیں رہا بس ان کی ایک ہی نصیحت تھی کہ خاندان کی عزت کا خیال رکھنا ہے اور لڑکیوں کی کیا حد ہوتی ہے یہ نہیں بھولنا چاہیے۔

پاکیزہ ✧......آپ اپنے والدین کی کون سی خوبیوں سے متاثر ہیں؟ اس کے اثرات آپ کی زندگی پر کیسے مرتب ہوئے؟

شائستہ فرحت ❖......ہمارے والدین چاہتے تھے کہ ہم زندگی کے ہر میدان میں آگے رہیں لیکن اسلام اور تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے۔ ہم نے ہر شغل کیا لیکن شادی کے بعد گھر اور بچوں کو فوقیت دی۔

شگفتہ فرحت ❖......ہمارے والدین بہت نیک معصوم اور دوسروں کے کام آنے والے تھے۔ جب بھی کوئی کام کرنا چاہا اپنے رول ماڈل والدین کی صورت نگاہوں میں آجاتی۔

پاکیزہ ✧......شادی سے پہلے گھر میں رونق لگائے رکھتی تھیں یا اپنے آپ میں مگن رہتی تھیں؟

شائستہ فرحت ❖......دونوں ہی کام ہوتے تھے۔ ہم دونوں بہنوں کی سہیلیاں بہت رہی ہیں۔ اس لیے ان کا آنا اور ہمارا جانا بھی لگا رہتا تھا۔

شگفتہ فرحت ❖......کہتے ہیں کہ گھر میں رونق لڑکیوں کے دم سے ہوتی ہے سو خوب ہنسی مذاق چلتا تھا لیکن امتحان کے دنوں میں خود میں مگن ہو جاتی۔

پاکیزہ ✧......میکے کی وہ یاد جو ساون بھادوں میں پل کی پل میں بابل کے انگنا میں پہنچا دیتی ہے؟

شائستہ فرحت ❖......پکوڑے تلنا اور موسم سے

آرٹس کونسل کراچی میں معروف فنکارہ اور براڈ کاسٹر اور رائٹر نیلوفر عباسی کی کتاب کی تقریب اجرا کے موقع پر قیصر مسعود جعفری، شگفتہ فرحت اور ادیس ادیب انصاری

کتاب تذکرہ شخصیات بھوپال کی تقریب اجرا کے موقع پر محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کے ساتھ

بھرپور لطف اندوز ہونا۔

شگفتہ فرحت ❖......میکے کی یاد کسی بھی موسم میں دل سے نہیں جاتی اور بارش تو ہے ہی یادوں کا موسم۔ سو ہم بھی بے شمار یادوں کے ہمراہ پل کی پل میں بابل کے انگنا میں پہنچ جاتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......شادی کے بعد بہنوں کی دوستی اور تعلق میں زیادہ پائداری آجاتی ہے یا دیگر رشتے اس محبت پر غالب آجاتے ہیں؟

شائستہ فرحت ❖......میرے خیال میں زیادہ پائداری آجاتی ہے۔

شگفتہ فرحت ❖......بہنوں کی محبت کا تعلق اور رشتہ اپنی جگہ ہے اور دوسرے رشتے اپنی جگہ۔ سب کا اپنا، اپنا قابلِ احترام مقام ہے کوئی رشتہ کسی پر غالب نہیں آسکتا۔

پاکیزہ ✧......شادی سے پہلے کس میں الھڑپنا زیادہ تھا؟ اور شادی کے بعد کس نے زیادہ ذمے داری نباہ کر حیران کردیا؟

شائستہ فرحت ❖......شگفتہ نے شادی کے بعد ذمے داری نباہ کر حیران کردیا۔

شگفتہ فرحت ❖......شادی سے پہلے مجھ میں زیادہ الھڑپن تھا مگر بہن میں مفاہمت، سنجیدگی اور رشتوں کو نبھانے کی صلاحیت اور عزم تھا جو انہوں نے کر دکھایا شادی کے بعد میں نے بھی اپنے طور بہت کوشش کی اب یہ تو بھگتنے والے ہی بتا سکتے ہیں کہ ان پر کیا گزری؟ (اویس بھائی کا آپ کی رفاقت میں قابلِ رشک اطمینان آپ کی کامیاب کوشش کا ثبوت ہے۔ زرین)

پاکیزہ ✧......افتاد پڑنے پر ہاتھ پاؤں چھوڑ دیتی ہیں یا حواس قابو میں رکھتے ہوئے پریشانی کا حل نکالتی ہیں؟

شائستہ فرحت ❖......چھوٹی ہونے کے باوجود شگفتہ حواس برقرار رکھتے ہوئے پریشانی کے حل کی ترکیب سوچتی ہیں۔ میں جلدی پریشان ہوجاتی ہوں۔

شگفتہ فرحت ❖......اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور الحمدللہ اکثر کامیاب بھی ہوجاتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......اچانک دعوت کا اہتمام کرنا پڑ جائے تب کیا حکمتِ عملی اختیار کرتی ہیں؟

شائستہ فرحت ❖......عام طور پر... کوفتے، کباب، یخنی وغیرہ بنا کر رکھتی ہوں لیکن جب اچانک کوئی مہمان آجائے تو کبھی سب ختم ہوا ہوتا ہے اور کبھی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی گیس نہیں ہوتی۔

شگفتہ فرحت ❖......چند گھنٹوں کے نوٹس پر بھی ہوسکتی ہے اگر پلاؤ، یخنی یا بریانی کا مسالا اور دیگر چیزیں بنا کر فریز کردیں تو کوئی آفت نہیں آتی مگر گیس کے مسئلے نے سب کے چولہے اور ارمان ٹھنڈے کردیے۔

پاکیزہ ✧......اپنی غلطی تسلیم کرنے میں وقت لگتا ہے یا احساس ہوتے ہی مان لیتی ہیں؟

شائستہ فرحت ❖......اپنی غلطی فوراً تسلیم کرلیتی ہوں۔

شگفتہ فرحت ❖......احساس ہوتے ہی نہ صرف فوراً غلطی تسلیم کرلیتی ہوں بلکہ اسے سدھارنے کی کوشش بھی کرتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......کون زیادہ بذلہ سنج ہے؟

شائستہ فرحت ❖......شگفتہ ہیں بھئی۔

شگفتہ فرحت ❖......ہمارے ابو بہت بذلہ سنج تھے سو یہ ہمارے حصے میں آیا۔ میں شور مچاتی ہوں بذلہ سنج ہوں لیکن شائستہ فرحت دھیمے مزاج کی مگر بھرپور بذلہ سنج ہیں۔

پاکیزہ ✧......دورانِ خریداری بھاؤ تاؤ میں کسے عبور حاصل ہے؟

شائستہ فرحت ❖......خریداری اور بھاؤ تاؤ میں شگفتہ۔

شگفتہ فرحت ❖......میرا خیال ہے تقریباً سب ہی خواتین ماہر ہوتی ہیں لیکن صحیح بھاؤ تاؤ اور پہچان میں انہی کو عبور حاصل ہے ہم تو کورے ہیں۔

پاکیزہ ✧......کس کی قوت برداشت زیادہ ہے؟

شائستہ فرحت ❖......الحمدللہ میری زیادہ ہے۔

شگفتہ فرحت ❖......میرا مزاج کوئی غلط بات مجھ سے برداشت نہیں ہوتی جبکہ وہ برداشت کی مثال ہیں۔

پاکیزہ ✧......فیصلہ جذبات میں آکر عجلت میں کرتی ہیں یا بہت سوچ سمجھ کر کرتی ہیں؟

شائستہ فرحت ❖......بہت سوچ سمجھ کر کرتی ہوں۔

شگفتہ فرحت ❖......میں فیصلہ کرنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں کرتی جبکہ وہ جذباتی فیصلوں سے کوسوں دور بہت سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کر کے فیصلہ کرتی ہیں۔

پاکیزہ ✧......بے بنیاد الزام پر اپنی بات کی سچائی ثابت کر کے دم لیتی ہیں یا خاموشی اختیار کر لیتی ہیں؟

شائستہ فرحت ❖......خاموشی اختیار کر لیتی ہوں۔

شگفتہ فرحت ❖......بے بنیاد بات پر غلط سلط الزام لگے تو جب تک بات کلیئر نہ ہو جائے مجھے سکون نہیں ملتا جبکہ وہ خاموشی اختیار کر لیتی ہیں کہ سچائی خود ہی سامنے آ جائے گی۔

پاکیزہ ✧......تنقیدی رگ کس کی زیادہ پھڑکتی ہے؟ اور کس میں تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ زیادہ ہے؟

شائستہ فرحت ❖......شگفتہ کی تنقیدی رگ زیادہ پھڑکتی ہے اور مابدولت میں تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ زیادہ ہے۔

شگفتہ فرحت ❖......اس قسم کی رگیں ہم میں پھڑکتی ہیں، تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ ان میں زیادہ ہے بلکہ وہ مالا مال ہیں۔

پاکیزہ ✧......

جو ڈوبنا ہو تو اتنے سکون سے ڈوبو
کہ آس پاس کی لہروں کو بھی پتا نہ لگے

اس ہنر میں کتنے فیصد طاق ہیں؟

شائستہ فرحت ❖......صد فیصد۔

شگفتہ فرحت ❖......صد فیصد کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ شور شرابے سے بہتر ہے کہ کوئی بات ہے تو اسے حقیقت سمجھ کر قبول کر لیں اور پُرسکون رہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

پاکیزہ ✧......چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے میں کسے مہارت حاصل ہے؟

شائستہ فرحت ❖......دونوں ہی اس ہنر میں طاق ہیں۔

شگفتہ فرحت ❖......الحمدللہ اس سے پوری طرح متفق ہوں کہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی اور زندگی بھی سکون کے ساتھ گزر جاتی ہے۔

پاکیزہ ✧......باہمی تعلق پر کب سب سے زیادہ فخر محسوس ہوا؟

شائستہ فرحت ❖......شگفتہ کی کتاب "تذکرہ شخصیات بھوپال" کی اشاعت اور اجرا پر جس میں ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب نے تشریف لا کر ہم سب کی عزت افزائی فرمائی۔

شگفتہ فرحت ❖......ہمیشہ رہا لیکن سب سے زیادہ فخر اپنی شادی کی رخصتی پر ہوا جب میری پیاری اکلوتی بہن نے ماں کی طرح میری رخصتی کی اور شادی کے تمام امور سنبھالنے میں اپنا بھرپور اور ممتا بھرا کردار ادا کیا۔

پاکیزہ ✧......اگر آپ کو وزارتِ بہبودیٔ نسواں کے منصب پر فائز کیا جائے تو آپ کے تین اولین اقدامات کون سے ہوں گے؟

شائستہ فرحت ❖......علیحدہ ویمن ٹرانسپورٹ علیحدہ ویمن پبلک باتھ روم، علیحدہ ویمن یونیورسٹیز۔

digest library.com

شگفتہ فرحت ❖......مکمل طور پر جہیز پر پابندی لگاؤں گی جس نے لڑکی والوں کو زندہ درگور کر دیا ہے۔ خواتین کے حقوق غصب کرنے اور مظالم ڈھانے والوں کو سزائیں دلواؤں گی۔ چائلڈ لیبر کا سلسلہ ختم کرا کے بچوں کی مفت تعلیم اور پڑھائی کا انتظام تا کہ وہ اچھے شہری بن سکیں۔

پاکیزہ ✧......پسندیدہ رشتہ، شخصیت، کتاب، موسیقی، رنگ، خوشبو، موسم، وقت، ٹی وی پروگرام، فلم، تفریحی مقام، مشغلہ، کھیل، موسم کے لحاظ سے مشروب اور ڈش؟

شائستہ فرحت ❖......ماں، والد، قرآن کی تفسیر، ہلکی پھلکی موسیقی، سبز رنگ، گلاب کی خوشبو، برسات، شام، کلنگ نیوز، ساحلی علاقے، مطالعہ، ہر موسم میں چائے اور دہی بڑے۔

شگفتہ فرحت ❖......والدین اور اولاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، قرآن مجید، موسیقی وہ جو کانوں کو نہ پھاڑتی ہو، بہار، شام کا وقت، آج کل کوئی نہیں، زرقا، مری، لکھنا پڑھنا، گھر کا بنا ہوا ...، جوس، آلو گوشت کا سالن، مٹر پلاؤ۔

پاکیزہ ✧......آپ کے دلی جذبات ماں جائی کے لیے؟

شائستہ فرحت ❖......اللہ ہر میدان میں کامیاب و کامران کرے۔

شگفتہ فرحت ❖......میں انہیں ہمیشہ خوش، صحتمند اور سلامت دیکھنا چاہتی ہوں۔ اللہ میری عمر بھی انہیں لگا دے۔

پاکیزہ ✧...... پاکیزہ کے بارے میں آپ کی رائے؟ قلم کاروں کے لیے کوئی مشورہ اور پاکیزہ بہنوں کے لیے پیغام؟

شائستہ فرحت ❖......ماہنامہ پاکیزہ نے ہر دور میں اپنا معیار قائم رکھا ہے۔ قلم کار مطالعے پر زیادہ توجہ دیں تا کہ اردو صحیح لکھ سکیں۔

شگفتہ فرحت ❖......پانچویں کلاس میں تھی جب سے پاکیزہ پڑھ رہی ہوں۔ ساتویں کلاس میں تھی تو

دو دوست اور صحافی خواتین شائستہ فرحت اور تابندہ رحمان

ایک بار خیال آیا کہ مارکیٹ سے بار بار منگوانے سے بہتر ہے کہ سال بھر کے پیسے دے کر ایک سال کے لیے منگوالیا جائے۔ پاکیزہ کے سرکولیشن ڈیپارٹمنٹ کو سالانہ خریداری کے پیسے ... بجائے حماقت میں اسکول کا پتہ دے دیا۔ اور پاکیزہ ہمارے اسکول میں آنے لگا۔ بس پھر کیا تھا تمام ٹیچرز بھی مستفید ہونے لگیں (یہ خوشی آپ کے حصے میں بھی آئی کہ نہیں؟ آپ دوبارہ پاکیزہ کی سالانہ خریدار بن جائیں مگر اپنے گھر کے پتے پر، زریں) قلم کاروں کے لیے مشورہ ہے کہ معاشرے کے حالات کی صحیح تصویر کشی کریں، لڑکیوں کو اونچے اونچے خواب اور تصوراتی دنیا سے نکالیں۔ (ماشاء اللہ ہماری قلمکار معاشرے کی نبض پر ہاتھ رکھنا خوب جانتی ہیں) قلم میں بڑی طاقت ہوتی ہے اس سے بڑے بڑے مسئلے حل ہوتے ہیں۔ (بلاشبہ) پاکیزہ بہنیں اپنے گھر، شوہر اور بچوں کے لیے وقت ضرور نکالیں بچوں کے درمیان سارے فاصلوں کو مٹائیں معاشرے میں آپ ہی آپ سدھار آئے گا۔

❀❀❀

digest library.com

کچھ تم بھی کہو...
کچھ ہم بھی سنیں

نزہت اصغر

کوئی انسان کتنا ہی تنہائی پسند ہو، خاموش طبیعت ہو یا آدم بیزار ہو، کسی ایک وقت وہ ضرور چاہے گا کہ کوئی غمگسار، کوئی چارہ ساز، کوئی ایسا سامع ضرور ہو جو اس کی ذہنی و قلبی کیفیات کی داستان سننے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

کچھ لوگ محفل پسند ہوتے ہیں......دوستوں کے مجمعے میں رشتے داروں کے جھرمٹ میں رہنا چاہتے ہیں اور کچھ اس کے برعکس بھی......مگر یہ تو سبھی مانیں گے کہ انسان ہی انسان کی دوا ہے۔جلد یا بدیر کبھی نہ کبھی ہم نشینوں کی ضرورت پڑتی ہے۔بس اسی نظریے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم بھی اپنے قارئین کرام سے ان کا احوال دل بذریعہ قلم سننا چاہتے ہیں۔جاننا چاہتے ہیں۔اسی لیے مختلف سلسلے ترتیب دیتے رہتے ہیں تو عزیزو! اپنی دلی کیفیات، ذہنی رجحانات سے ضرور آگاہ کریں وہ بھی......ان سوالوں کے جواب کے ذریعے......اس سلسلے میں ہر عمر، ہر طبقے ہر فکر کی بہنیں حصہ لے سکتی ہیں۔

۱۔شعوری منازل طے کرنے کے بعد کب احساس ہوا کہ کوئی ہم راز، ہم دم، غم گسار ہونا چاہیے۔کس لمحے، کس موقع پر کسی کا کوئی جملہ کہ جس نے یہ احساس جگایا ہو؟

۲۔حال دل کہنے کے لیے، سنانے کے لیے، بتانے کے لیے کورے کاغذ یا ڈائری کا سہارا لیا یا پھر کسی انسانی وجود کا......؟

۳۔انسان خود اپنا راز دار کیسے ہوتا ہے؟

☆سنیعہ مرزا......ساہیوال

1۔قلم کا استعمال ہمیشہ ان ڈائریکٹ ہی کیا۔اپنا پیغام یا اپنی آواز اپنی تحریروں کے ذریعے پہنچائی جب نزہت اصغر آپی نے مجھ سے اس سلسلے میں شرکت کی فرمائش کی تو میں چند ثانیے کے لیے سوچ میں پڑ گئی کیونکہ سب سے مشکل بات میرے لیے اپنی ذات کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔اپنے آپ کو کھنگالنا اور ٹٹولنا ہے۔بہرحال یہ نزہت کا احترام یا محبت تھی کہ میں نے فوراً حامی بھرلی۔

اسی بات سے اندازہ کریں کہ جو انسان اپنی ذات کے بارے میں کسی سے بات نہ کرنا چاہتا ہو یا کرنے میں دلچسپی نہ رکھتا ہو۔اسے کسی غم گسار کی طلب کہاں رہی ہوگی۔میری بہترین غم گسار میری لٹریچر کی کتابیں ہیں۔نصرت کی موسیقی، عابدہ پروین کی آواز اور پانیوں کا عکس زندگی نے جب، جب جہاں، جہاں موقع دیا ہے میں نے اللہ کے بعد ان سب سے اپنا حالِ دل بانٹا۔ہاں مگر تنہائی کی اس معراج کو پانا بھی آسان نہ تھا۔

لمحوں نے خطا کی تھی
صدیوں نے سزا پائی

بہت سے لوگ زندگی میں ایسے آئے کہ جنھوں نے یہ احساس دلایا کہ محرمِ راز کم از کم کوئی انسان نہیں

Digest Library.com

ہے۔ آپ کا غم گسار کوئی نہیں ہوتا۔ آپ کی اپنی ذات سے بڑھ کر آپ کا محسن اور ہم راز کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کی تباہی اور کم مائیگی کا آغاز ہی کسی سے ہمدردی اور دادرسی کی امید رکھنا ہے۔

اسے آپ یاسیت نہیں، شخصیت کا استحکام کہہ سکتے ہیں یا پھر مجبوری کہ آپ کسی پر بھی انحصار نہ کریں۔

2۔ دوسرے سوال کا جواب بھی پہلے سوال کے جواب میں پنہاں ہے۔ ہاں بہت سے ٹین ایجرز کی طرح مجھے بھی اوائل عمری سے ڈائری کا کریز رہا ہے۔ اور ایک وقت تھا جب ڈائری میری سب سے قیمتی متاع تھی۔ پھر ان چیزوں کی جگہ ٹیکنالوجی نے لے لی لیکن میرے قلم نے میرا ساتھ نہ چھوڑا۔ دل کے حال کو کرداروں میں پُرو دیا۔ دیگر رسائل اور پاکیزہ کے علاوہ کتابی شکل میں بھی میری تمام تحریریں ڈائریوں پر موجود لمحۂ ماضی کی عکاس ہیں۔ کہیں مشاہدے بکھرے پڑے ہیں تو کہیں تجربے۔

لیکن اب بھی پرانے بند کواڑ کھولوں تو ان بوسیدہ ڈائریوں کو دیکھ کر چند مصرعے گنگنانے لگتی ہوں۔

دکھ یہ نہیں کتاب کو دیمک نگل گئی
اس میں پڑے گلاب کو دیمک نگل گئی
ورجینیا کی ڈائری سیلن نے چاٹ لی
بیدل کے انتخاب کو دیمک نگل گئی

الغرض وہ صفحات، وہ کتابیں، وہ قدیم عمارتیں، وہ یونیورسٹیوں کے کاریڈور زیادہ درخت جو آپ کا کل سرمایہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی وقت آگے بڑھ کر انہیں بے معنی کر دیتا ہے۔

3۔ معافی چاہتی ہوں، تیسرے سوال کو بھی میں نے پہلے میں ہی پُرو دیا ہے۔ مزید اور المختصر یہی کہنا چاہوں گی کہ کم عمر ڈائجسٹ ریڈرز بہت معصوم اور پیاری بچیاں ہوتی ہیں۔ وہ زمانے کی ان گنت چالاکیوں سے بے بہرہ اپنی ہی ونڈر لینڈ کی ایلس ہوتی ہیں۔ اور رومانوی کہانیاں انہیں دور دیس لے جاتی ہیں۔ وہ یہیں سے خواب دیکھتی، دیکھتی خود اپنی راز دار بننے کے بجائے دوسروں پر انحصار کرنا سیکھ لیتی ہیں۔

اور یوں تقدیر اور خود غرض انسانوں کے ہاتھوں الجھ جاتی ہیں۔ میری ان کے لیے یہی نصیحت حرفِ آخر ہے کہ ہمیشہ اپنی راز دار اپنی ہم دم خود بننا سیکھیں۔

اپنے دل کے راز کو دل سے بڑھ کو کوئی نہیں رکھ سکتا۔

دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیاں جانے ہو

☆صدف آصف.....آسٹریلیا

1۔ غم بانٹنے سے ہلکا نہیں ہوتا شاید...مگر ساتھ چلنے والا خامشی کی زبان سمجھ جائے تو درد، دوا بن جاتا ہے۔ ہمراز...... غمگسار......ضروری نہیں کہ زخم بھر دے، بس وہ زخم کے ساتھ بیٹھ جائے اور کہے۔ ''تو اکیلا نہیں ہے......'' امی کے جانے کے بعد ہر لمحہ یہ احساس بڑھتا چلا گیا ماں سے بڑھ کر کون غمگسار ہو سکتا ہے دنیا میں۔

2۔ جب دل کسی سے نہیں کہہ پاتا، تو کاغذ دوست بن جاتا ہے اور میری ڈائری ہی کبھی کبھی میری ہمراز بن جاتی ہے۔

3۔ انسان اپنا راز دار تب بنتا ہے... جب وہ خود سے سچ بولنا سیکھتا ہے۔

جب وہ اپنے زخموں سے نظریں نہیں چراتا بلکہ اُنہیں چھپانے کے بجائے سمجھنے لگتا ہے۔ جب وہ خوشی میں خود کو داد دیتا ہے اور غم میں خود کو شرمندہ نہیں، تسلی دیتا ہے۔ جب وہ آئینے میں دیکھ کر صرف چہرہ نہیں، دل پڑھنے لگتا ہے۔ جب وہ اپنی خامیوں کو مان کر ان سے نفرت نہیں کرتا بلکہ اُن کے ساتھ جینا سیکھ لیتا ہے۔ جب وہ اپنی دعاؤں کا پہلا مخاطب خود کو بناتا ہے کہ ''میں ہی ہوں جو خود کو اٹھا سکتا ہوں۔''

☆☆☆

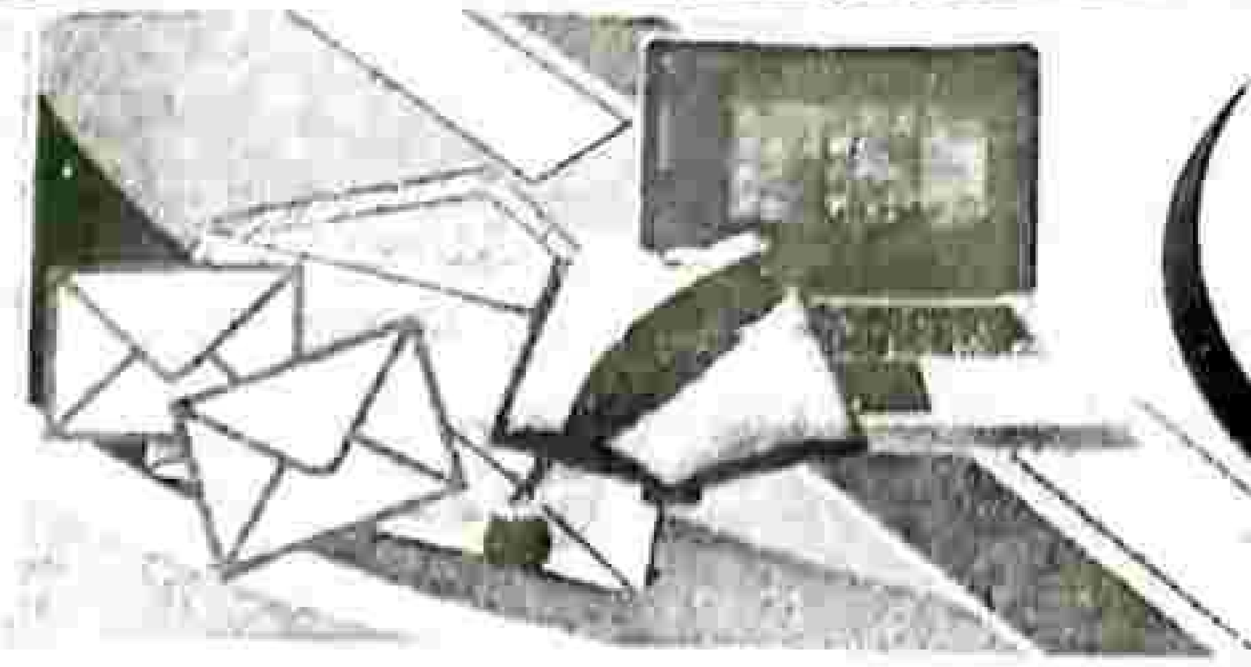

بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:110

پیاری اور محترم بہنو! السلام علیکم!

تمام تر حمد وثنا اس ذات والاصفات کے لیے جو احد ہے، خالقِ کائنات ہے۔ وہ رب العزت جس نے اپنی حکمتِ کاملہ سے ہر صنعت کو محکم بنایا۔ وہ بے مثال، لازوال، ہر ایک کی سننے والا، ہر شے کا دیکھنے والا اور ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

کائنات کی ہر مخلوق ثنائے پروردگار میں مصروف ہے۔ ہر شے اللہ کے پیارے حبیب ﷺ پر دن رات درود وسلام بھیجتی ہے۔ خدایا رحمت نازل فرما حضرت محمد مصطفی ﷺ پر کہ جن کو تو نے بہترین دین کے ساتھ بھیجا اور تمام عالم کے لیے نجات کا وسیلہ قرار دیا۔ بس تھامے رہو دامن رحمۃ اللعالمین کہ وہی دنیا و آخرت میں مددگار اور شفیع روزِ محشر ہیں۔

تمام اہلِ وطن کے لیے پرخلوص دعائیں اور نیک تمنائیں لیے حاضر ہیں۔

Digest Novels Lovers group

☆☆☆

عزیز و دلکش بہنوں کے لیے پیار بھرا سلام

پُرخلوص دعائیں لیے حاضر ہیں۔

سب سے پہلے ان تمام خوش نصیب مسلمان بہنوں، بھائیوں کو ایک دفعہ پھر مبارک باد دیتے ہیں کہ اتنی عظیم سعادت حاصل کی۔ حج کا فریضہ بے شک تمام عاقل، بالغ و صاحبِ استطاعت مسلمانوں پر فرض ہے اور جو اسے اپنی بہترین صحت میں انجام دے لے اس سے بڑا خوش قسمت کون ہوگا۔ اس سال بھی ادارہ پاکیزہ سے تعلق رکھنے والی ہماری بہت سی مصنفات اور قارئین نے یہ سعادت حاصل کی، الحمدللہ۔ ان سب کو ہم ایک دفعہ پھر مبارک باد دیتے ہیں۔ اب تو عازمین کی واپسی بھی تقریباً مکمل ہو چکی ہے اور بہت سے اب عمرے کے لیے تیاریوں میں مشغول ہیں۔ اللہ پاک سب کو اپنے درِ اقدس پر بلائے، آمین۔

بین الاقوامی منظر نامہ عجب منظر پیش کر رہا ہے۔ مسلمانوں پر ہر طرف سے سختی و تنگی کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ایک طرف فلسطینی عوام عرصے سے شہید ہو رہی ہے اب جنگ کا رخ کسی اور سمت ہو چلا ہے۔ اگر تمام مسلمان متحد ہوتے، ایک اللہ، ایک رسول ﷺ اور ایک قرآن پاک پر تو کس کافر کی مجال تھی کہ اپنی ناپاک میلی آنکھ ڈالتا۔ اب بھی وقت ہے کہ اپنی آنے والی نسل کو اس بے دینی، اس بے ایمانی سے بچالیں...... دل خون کے آنسو روتا ہے اور ہاتھ دعاؤں کے لیے اٹھتے ہیں۔ اللہ پاک ہمارے دل و دماغ ایمان کی اصل طاقت سے منور ہو جائیں، ہم اسلام کے سچے اور پکے پیروکار ہو جائیں، دنیا کو حقیر جانیں اور آخرت کے تحفے سمیٹنے میں کوشاں رہیں۔ اپنا حق نہ چھوڑیں اور کسی اور کے حقوق غصب نہ کریں۔ افسوس ہے کہ...

آج دنیا میں کیا امن کو غارت کس نے ...... اسلحی دوڑ نے، ان ایٹمی ہتھیاروں نے

☆☆☆

پیاری بہنو...... حسبِ روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوصِ دل سے درود ابراہیمؑ

اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہلِ وطن کو بھی یاد رکھیں۔

☆☆☆

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ مصنفہ ریما نور رضوان، کراچی کے بھائی جان محمد آصف اور بھابی جان عینی آصف نے اس سال حج کی سعادت حاصل کی۔ (بے حد مبارک ہو)

☆ نامور افسانہ نگار نگہت اعظمی کے خوب صورت افسانوں کا مجموعہ بیج سے پہلے شائع ہو گیا ہے جس میں مختلف رسائل میں چھپنے والے افسانے شامل ہیں۔ کتاب کی اشاعت علی میاں پبلی کیشنز کے حصے میں آئی اور ناشر عبدالغفار ہیں۔ نہایت متاثر کُن معاشرتی موضوعات کا احاطہ کیے یہ تفریحی اور اصلاحی تحریریں ہر عمر کے قاری کو محظوظ کرتی ہیں۔ خوب صورت سرورق اور دو سو چالیس صفحات پر مشتمل اس حسین کاوش کی قیمت صرف 1500 روپے ہے۔ کتاب میں نامور ادبی شخصیات کی قیمتی آرا بھی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ ملک کے تمام بڑے شہروں کے نمایاں بک اسٹالز اور کتب خانوں میں دستیاب ہے۔ کتاب کا انتساب مصنفہ نے تمام پڑھنے والوں کے نام کیا ہے۔ (کامیابی مبارک ہو)

☆ معروف قلم کار، صحافی، براڈ کاسٹر شاہد نقوی کے تیکھے افسانوں کا مجموعہ افسانے شاہد ہیں، علم و عرفان پبلشرز کے بینر تلے شائع ہو گیا ہے۔ کتاب کا انتساب کچھ اس طرح سے ہے "تخلیق کاروں کے تخلیق کار اللہ کے نام، میری کہانیوں کے تمام کرداروں کے نام جن کی مدد سے میں لکھ پایا اور ان کے نام جو کہانی کی اصل روح سمجھتے ہیں۔" کتاب میں بین الاقوامی شہرت یافتہ دانشور، مصنف، مقرر اور تجزیہ نگار ڈاکٹر عالیہ امام کی قیمتی اور نہایت معتبر رائے بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ بیشتر افسانوں کے موضوعات معاشرے کی تلخ حقیقتوں کے عکاس ہیں۔ لوح و قلم کی اصل طاقت سچائی کا پرچار کرنا ہے جو اپنی تحریروں میں شاہد نقوی نے بھرپور انداز سے کیا ہے۔ کتاب کی کمپوزنگ ثاقب رضا کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور دلکش سرورق جناب امتثال عباسی، ساجد عباس دمیر فرہاد خالد کی انتھک محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آر، آر پرنٹرز نے اسے بے حد خوب صورتی سے شائع کیا ہے۔ کتاب کی قیمت صرف /-1000 روپے ہے اور ملنے کا پتا علم و عرفان پبلشرز الحمد مارکیٹ، 40 اردو بازار لاہور ہے۔ کتاب کے بیک فلیپ پر انور رضوی، شکیل عادل زادہ، ناظم نقوی، مصطفیٰ آبادی اور مظہر عباس کے قیمتی و نادر خیالات بھی شامل ہیں۔

☆ گزشتہ شمارے میں کمپوزر کی غلطی تھی جس کو درست کیا جا رہا ہے۔ ماہنامہ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی، رائٹر افشاں آفریدی، جرمنی کے طویل ناولٹ کا مجموعہ کاتبِ بخت کے اشارے پر، علم و عرفان پبلشرز کے تحت شائع ہو گیا گلاب کے پھولوں کی تازگی و خوب صورتی سے مزین سرورق کتاب کو پہلے صفحے سے آخری صفحے تک پڑھنے کی دعوت دیتا نہایت بھلا معلوم ہو رہا ہے۔ اس خوب صورت تحاریر کے مجموعے کا انتساب مصنفہ نے اپنے خالقِ اکبر کی حسین تخلیق قلم کے نام کیا ہے۔ پیش لفظ میں افشاں نے دو، دو سطروں میں اس مجموعے میں شامل اپنی کہانیوں کے مغز کے بارے میں بتایا ہے۔ کتاب کی آفیشل قیمت 2500 ہے مگر خاص طور پر افشاں آفریدی کے آفیشل پیج کی جانب سے کتاب خریدنے پر قیمت 1350 ہے اور اسی کے ساتھ کتاب کے سنگ خوب صورت اسیریز بک مارک، منی بک جھنک یو کارڈ اور ہائی لائٹر بھی کتاب کے ساتھ تحفہ ہیں جو افشاں آفریدی آفیشل سے آرڈر کرنے پر ہی حاصل کر سکتے ہیں۔ کتاب خریدنے کے لیے اس نمبر سے واٹس ایپ پر رابطہ کریں۔ 0306-2468257

☆ مصنفہ قرۃ العین خرم ہاشمی اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئی ہیں الحمدللہ۔ (بہت، بہت مبارک ہو)

☆ پاکیزہ پر باقاعدگی سے تبصرہ کرنے والی مراسلہ نگار پیاری نازنین آفریدی، پشاور کی اس ماہ سالگرہ ہے۔ (بہت، بہت مبارک ہو)

☆ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی، نامور شاعرہ و مستقل قاری فریدہ جاوید فری لاہور کی کلی صحت یابی کے لیے ضرور دعا کریں۔

☆ صابہ موہڑہ چکوال سے تعلق رکھنے والی نرگس نسیم گزشتہ دنوں ایک ٹریفک حادثے کا شکار ہو کر زخمی ہوگئی ہیں، بہنیں انہیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆ ناہید نعیم، ملتان موسمی تبدیلیوں کے باعث سخت ذہنی و جسمانی پریشانی میں مبتلا ہیں، بہنیں انہیں اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی مستقل قاری، تبصرہ نگار، مراسلہ نگار نازنین آفریدی، پشاور کی مکمل صحت یابی کے لیے انہیں ضرور دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆ ہم سب کی پیاری دوست، پاکیزہ کی پرستار، شاعرہ، مصنفہ شگفتہ شفیق کی مکمل صحت یابی کے لیے تمام پاکیزہ بہنیں ضرور دعائے صحت کریں۔

☆ رائٹر حمیرا شفیع، صادق آباد کی طبیعت ان دنوں کافی ناساز ہے، بہنیں دعاؤں میں یاد رکھیں۔

انتقالِ پُرملال

☆ مصنفہ فرحی نعیم کے شوہر نامدار حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث انتقال کر گئے۔ فرحی نعیم اور اہلِ خانہ کے اس غم میں اراکینِ ادارہ برابر کے شریک ہیں اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں۔

☆ ادارہ جاسوسی کے کمپیوٹر سیکشن سے وابستہ حمیرا اقبال کی بڑی ہمشیرہ مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ مرحومہ پورے خاندان کے لیے ایک شجرِ سایہ دار تھیں، اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے اور اہلِ خانہ کو صبرِ عظیم عطا فرمائے، آمین۔

☆ مصنفہ ریما نور رضوان کی والدہ کی برسی اس ماہ ہے، بہنیں دعاؤں میں یاد رکھیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری، تبصرہ نگار، مراسلہ نگار حدیث اختر، حاصل پور کے دیور کی برسی کے سلسلے میں فاتحہ خوانی ہوئی جبکہ اس ماہ حدیث اختر کے شوہر کی برسی ہے۔ دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

☆ ماہنامہ پاکیزہ کی مستقل قاری، شاعرہ، مصنفہ فصیحہ آصف خان، ملتان کی عزیز سہیلی ثوبیہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ مرحومہ ایک نیک سیرت طبیعت کی مالک تھیں۔ دعائے مغفرت کی استدعا ہے۔

☆ ماہ جون کے پاکیزہ میں مصنفہ نگہت سیما کے ماموں زاد بھائی کے انتقال کی خبر لگی تھی جس میں ان کا نام غلطی سے افتخار احمد کتابت ہوگیا جبکہ نگہت سیما کے ماموں زاد بھائی اعجاز احمد کا انتقال ہوا تھا۔ کتابت کی اس غلطی پر ادارہ معذرت کا خواستگار ہے۔ اللہ پاک اعجاز احمد مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور بھائی افتخار احمد کو صحت و عافیت کے ساتھ طولِ حیات دے، آمین۔

بہنو اب آیئے......اپنے خطوط کی طرف......

✉ غزالہ عزیز، کراچی سے۔ ”پاکیزہ کے جون 2025ء کے شمارے پر تبصرہ حاضر ہے جو آپ کی اور آمنہ کی محنت و اعلیٰ صلاحیتوں کا منہ بولتا شاہکار نظر آتا ہے۔ (بہت شکریہ) شائستہ زریں کے بہترین موضوعات پر سروے کرنے پر میں دل سے شائستہ کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی عذرا آپی کو بھی سلام اور ان کی خیر و عافیت کی دعا گو ہوں جن کی سرپرستی میں بہترین تحریری مواد قارئین تک بخوبی پہنچ رہا ہے۔ (جزاک اللہ) ویلڈن اینڈ کیپ اٹ اپ۔ اس کے ساتھ ان قارئین کا شکریہ جنھوں نے میرے ناولٹ پر اپنی رائے دی ہے۔ بالخصوص تسنیم کوثر صاحبہ کا بے حد شکریہ۔ جو میری ہر تحریر پر حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ اب جون کے شمارے پر مکمل تبصرہ حاضر ہے۔ آغاز نزہت کے اداریے سے ہوتا ہے جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ صرف افسانوں اور ناولوں کی بہترین قطع و برید ہی نہیں حالاتِ حاضرہ پر بھی نزہت کے قلم کی مضبوطی اور گرفت قابلِ تحسین ہے۔ (بہت نوازش) قرآن و حدیث کی پُرنور ہدایت کے ساتھ سلسلے وار ناول اور ناولٹ اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ بالخصوص نگہت سیما کا ناول اِک دیا ہے ہاتھوں پر بہت پسند آ رہا ہے۔ امید ہے کہ بہترین آغاز کے ساتھ اختتام بھی بہترین ہوگا۔ اس کے ساتھ اسما اشرف کا منی ناول ساحل بھی خوب جا رہا ہے۔ بڑے دنوں بعد کوئی بہت دل

کو چھو لینے والی دل پزیر تحریر پڑھنے کو مل رہی ہے، ویلڈن اسما۔ پاکیزہ میں اب آپ نے مزید بہترین تحریروں کے ساتھ آتے رہنا ہے۔ (جی بالکل) افسانوں میں تمام افسانے ہی اچھے موضوعات پر منتخب کیے گئے تھے۔ میری طرف سے تمام رائٹرز کو مبارک باد، البتہ جون کے شمارے کی سب سے بہترین تحریر مجھے آخری سہ پہر لگی ہے۔ اگر رائٹر نئی ہیں تو اعلیٰ درجے کی تحریری صلاحیتوں کی حامل ہیں، اگر سینئر ہیں تب بھی جون کی یہ تحریر نمرہ کی بہترین کاوش ہے، ویلڈن نمرہ عبدالصمد۔ پاکیزہ میں ایسی ہی ''کلاسک'' تحریروں کے ساتھ آتی رہیے گا۔ ناولوں اور افسانوں کے بعد پاکیزہ کے مستقل سلسلے بالخصوص پکوان کی تراکیب اور شائستہ زریں کے متنوع و دلچسپ موضوعات پر مبنی سروے ہمیشہ ہی بہترین ہوتے ہیں۔ جون کا سروے بھی بے حد پسند آیا۔ پاکیزہ کے دیگر سلسلے بھی دلچسپ اور معیاری ہیں۔ حج مقدس اور بڑی عید یعنی عیدالاضحیٰ کی مبارک باد آپ سب لوگ قبول فرمائیں۔ (تمہیں بھی مبارک ہو) اگرچہ جون کے بعد جولائی میں بھی عیدالاضحیٰ کی رونقیں دعوتوں کی صورت میں جاری رہیں گی۔ بہرحال آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گی کہ آپ سب سے ہماری محبتیں، قربتیں اور تعلق داری اسی طرح قائم و دائم رہے، آمین۔'' (بہت پیارے خط اور پُرخلوص دعاؤں کے لیے جزاک اللہ، اللہ پاک آپ کو صحت و سلامتی اور ایمان کی بہترین حالت میں رکھے، آمین)

☜ سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ ''اس مرتبہ بہت جلد پاکیزہ مل گیا اور پڑھ بھی لیا مگر تبصرہ اب کر رہی ہوں، لکھنے کا موڈ رہا اور دو، تین افسانے لکھ ڈالے، آخر طویل غیر حاضری کی کسر بھی تو نکالنی ہے۔ (جی بالکل بھیجیں) آج کل اختر شجاعت بہت اچھے موضوعات کا انتخاب کر رہی ہیں جو اسلام کے علاوہ ہر مذہب میں سراہے جاتے ہیں اور پیروی کی جاتی ہے اور اس مرتبہ تو موضوع ہی [illegible] جس پر عالمِ انسانیت بے حس ہو چکی ہے بلکہ غیروں سے کیا شکوہ، اپنوں سے شکایت ہے۔ فلسطین کے مسلمانوں پر ظلم پر دنیا کا [illegible] سمجھ میں آتی ہے لیکن مسلمانوں کی بے حسی قابلِ مذمت اور ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ (اختر شجاعت انسانیت اور انسانی معاشرے کے سلگتے موضوعات کو ہی قلم بند کر رہی ہیں) ثمینہ عظمت علی کا اسلامی تاریخ، بے حد بامقصد اور حقیقت سے قریب، ہم غربت کا رونا روتے ہیں لیکن شادی بیاہ سے لے کر شاپنگ مالز اور جیولری مارکیٹ بھری ہوئی یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ہم کہیں سے بھی غریب نہیں۔ (ارے 80 فیصد عوام تو غریب ہی ہے ناں) میری عید تم ہو، سارہ عمر کا ہلکا پھلکا اچھا لگا۔ وردہ بخاری کا ہیں کو اب کچھ نظر آتے [illegible] بہت لاجواب مگر آج کل ساس، سسر کو ساتھ رکھنے کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے۔ شادی سے پہلے ہی ماں، باپ سبق پڑھاتے ہیں کہ الگ رہنا ہے پھر رشتے بھی ایسے دیکھے جاتے ہیں جو چھڑے چھانٹ ہوں، بغیر ماں، باپ کے پیدا ہو جائیں تو اور بھی اچھا ہے (واہ کیا بات کی ہے) اس لیے بچے بھی نانا، نانی اور دادا، دادی کی شفقت اور محبت سے محروم رہتے ہیں بلکہ گھاس ہی نہیں ڈالتے۔ [illegible] کا پوزیشن ہولڈر، بے حد بامقصد اور لاجواب، ڈگریوں سے سلیقہ اور ہنرمندی نہیں آتی۔ سچ تو یہ ہے کہ موبائل اور لیپ ٹاپ کی بیماری میں بچے، بڑے سب مبتلا ہیں۔ اب تو ٹی وی کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ شگفتہ بھٹی کا امتحانی پرچہ، سب پر بازی لے گیا، اینڈ زبردست رہا کہ بروقت باپ رکشا لے کر کالج پہنچ گیا۔ مجھے دکھی اینڈ برداشت ہی نہیں ہوتا، ویلڈن شگفتہ۔ قانتہ رابعہ کا ہو جس سے تیری نسبت، عقیدت اور محبت کی بے مثال رُوداد۔ خاموش محبت بھی سحر مومنہ کی اچھی لگی۔ زندگی ایک دیا، ماہ وش چودھری نے کمال کا لکھا ہے۔ بہنوئی کو شوہر کے روپ میں دیکھنا مگر شکر کہ اختتام بہت اچھا رہا اور یہ کہانیاں ہمارے معاشرے میں قدم، قدم پر بکھری ہوئی ہیں۔ (بات تو صحیح کہہ رہی ہیں) آخری سہ پہر نے اتنا مزہ نہیں دیا۔ نمرہ نور الصمد ...... اتنی طویل کہانی میں کیا بتا رہی ہیں، کیا پُراعتماد بن کر گلشن آرا، صدر الدین سے نجات پا سکے گی یا اپنے جیسا بنا لے گی، کیا ایسے ماحول کی پروردہ لڑکی کے لیے ممکن ہے۔ بہتر ہوتا کہ اپنے ساتھ، ساتھ وہ صدر الدین کو بھی اس راستے کا مسافر بناتی جس پر وہ چل رہی تھی۔ آگہی نے تو اس کی زندگی کو اور مشکل بنانا تھا۔ (بس سب اپنے، اپنے حساب سے کہانی کا نکتہ سمجھتے ہیں) سوشل میڈیا، بے شک وبالِ جان صحیح مگر ریما نور رضوان کو اندازہ نہیں کہ آج کل کی نوجوان نسل کو کتابوں کی طرف راغب کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ خیر انہوں نے کوشش اچھی کی ہے۔ ہما بیگ سے ملاقات بہت زبردست رہی اور میں ان کے حوصلے اور ہمت سے بہت متاثر ہوئی۔ اللہ کبھی کسی ماں کو اس آزمائش میں نہ ڈالے، وہ حادثہ میرے دل پر نقش ہے کیونکہ میرے بیٹے کے دوست

digest.library.com

کی فرسٹ کزن حفصہ اپنے تمام بچوں اور شوہر کے ساتھ اس حادثے کا شکار ہوئی تھی مگر وہی کہ اللہ خود ہی ہمت دے دیتا ہے ورنہ ماں کے لیے تو یہ غم ناقابلِ برداشت ہے۔ (بالکل ٹھیک کہا) تبصرہ اور بھی باقی ہے مگر اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی طویل ہوگیا، معذرت۔" (ارے معذرت کی کوئی بات نہیں، آپ کا کیا تبصرہ دوسروں کے لیے سوچ کی راہیں کھولتا ہے۔ اللہ پاک ہما بیگ سمیت سب لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحومین کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین)

شمیم فضل خالق، پشاور سے۔ "حسبِ وعدہ افسانہ بھیج رہی ہوں، پسند آجائے تو خوشی ہوگی۔ (جی آپ کی تحریر تو ہمیشہ ہی پسندیدگی کی سند پاتی ہے) امید ہے آپ اپنی فیملی سمیت ٹھیک ٹھاک ہوں گی۔ (الحمدللہ) تمام قلم قبیلے کو میرا سلام کہہ دیں۔ (جی سب بہنیں آپ کو پوچھتی ہیں) شمارہ کل ہی ملا ہے، ابھی پڑھا نہیں ورنہ تبصرہ بھی ضرور کرتی۔" (آپ کی مختصر تحریر شاملِ محفل ہے آپا)

فہمیدہ جاوید، ملتان سے۔ "سالگرہ نمبر کا پاکیزہ خوب صورت سے سرورق سے مزین میری پسندیدہ مصنفہ نگہت سیما کے ناول کی پہلی قسط کے ساتھ بہت شاندار رہا۔ سارے سلسلے ہر بار کی طرح خوب تر رہے۔ شائستہ نے شاعرہ کا بہت ہی دلکش و یادگار انٹرویو کیا۔ (چلو تم تو خوش ہوگئیں ناں) بہنوں کی محفل کی رونق اور نیا انداز سب سے نمایاں تھا وہیں اپنے بچے کی کامیابی کی خبر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی پاکیزہ نے ہمیشہ ہی ہر پاکیزہ والی کی خوشی، غمی میں ساتھ دیا ہے اور ہر ایک کو پروموٹ کیا ہے۔ (بے شک) نگہت سیما کے ناول کی پہلی قسط بہت شاندار رہی کہ نام تو دلچسپ ہے وہیں منظر کشی سے بھرپور کہانی کا دلچسپ انداز ہے اور پہلا سین کافی پیارا تھا وہیں اتنی حسین سی جگہ پر کردار رہتے ہیں واقعی ہم قارئین تو ڈائجسٹوں میں ہی سیر کر لیتے ہیں ورنہ کہاں ہر کوئی ایسی جگہ پر جا سکتا ہے۔ (یہ تو لکھاری کی مہارت اور مشاہدہ ہوتا ہے) انشال اور کزن کا کردار اور باقی سب کرداروں کا تعارف بھی عمدہ رہا اور یہ ناول آگے جا کر دلچسپ ہوگا خیر سے۔ منظر کشی خوب رہی۔ ساحل بھی دلچسپ انداز میں چل رہا ہے۔ سونیا نوید نئی رائٹر ہیں کیا۔ مکمل ناول معیاری انداز میں لکھا گیا اور عنوان بھی دلچسپ تھا (جی بالکل) جبکہ فلک تنویر اور غزالہ عزیز کی تحریریں بھی دلچسپ و تعمیری تھیں۔ عید کی مناسبت سے فصیحہ آصف کا افسانہ ٹاپ پر تھا اور عنوان سمیت پلاٹ بھی فصیحہ بھی پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی ہیں جبکہ مادر اسلمان کا افسانہ بھی معیاری تھا جو مثبت و تعمیری سوچ دے رہا تھا۔ افشاں علی کی تحریر بھی سالگرہ نمبر دو میں نمایاں رہی جو پسند آئی جبکہ نسرین اختر نینا کی تحریر میں شروع میں لکھی گئی لائن بھی خوب رہی جو کہانی کی مناسبت سے تھی۔ بشریٰ کی کہانی کے اینڈ میں خوب سسپنس نظر آرہا ہے جو ناول کو دلچسپ بنا رہا ہے۔ رفعت اور بشریٰ بھی اب جلد نزہت کی ملاقات والی بیٹھک میں حاضر ہوجائیں اور تفصیل سے اپنا انٹرویو دیں کہ ہم قاری بہنوں کو ان دونوں کا انتظار ہے کہ دونوں نے خوب سے خوب قسطیں ہر ماہ لکھیں جو سب کو پسند آئیں۔" (جی ان شاء اللہ ضرور، شکریہ تمہارے لکھے دقیق تبصرے سب کو پسند آتے ہیں)

ریما نور رضوان، کراچی سے۔ "پاکیزہ ڈائجسٹ سے جڑے ہر فردِ واحد کو دل کی گہرائیوں اور سچائیوں کے ساتھ ریما نور رضوان کا پیار و خلوص بھرا اسلام۔ بہنوں کی محفل کو نزہت آپی، عذرا آپی ہر ماہ خوب صورت انداز میں دلکش رنگوں، مہکتی دلفریب خوشبو سے سجاتی ہیں۔ کراچی میں گزشتہ تین دن سے ہیٹ ویو ہے۔ شدید حبس، کڑکتی دھوپ اللہ پاک عافیت والی بارانِ رحمت نازل فرمائے، آمین۔ (ارے یہ تو جون کا پہلا ہفتہ سے ہی، اب دیکھو اللہ کب کرم فرماتا ہے بارش کی صورت) بہنوں تھوڑی سی جگہ تو دو مانا کہ آپ ہر ماہ اس بزم میں شامل ہوتی ہو، میں بہت عرصے بعد آئی ہوں لیکن پاکیزہ سے رشتہ بہت پرانا ہے۔ (خوش آمدید) اب آتی ہوں پاکیزہ جون کے شمارے کی طرف ماہنامہ پاکیزہ نے ہمیشہ کی طرح مان و محبت دی۔ افسانہ شائع کرنے پر تہہ دل سے مشکور و ممنون ہوں۔ جون کا پاکیزہ عید الاضحیٰ خوب صورت سرورق کے ساتھ اور اداریہ مجھے کچھ کہتا ہے، دین اور دنیا میں اسلام کا تصورِ قربانی ہمیں قربانی کے حوالے سے معلومات میں اضافہ کر گیا۔ میری جانب سے بھی جو خوش قسمت مسلمان حج بیت اللہ کی ادائیگی کے سلسلے میں عازمِ سفر ہوئے۔ (دلی مبارک باد) خیر کے ساتھ ہمیں بھی سفرِ حجاز نصیب فرمائے، آمین۔ پاکیزہ میں میرا من پسند سلسلہ القرآن جس میں سورۂ کہف کا ترجمہ پڑھنے کو ملا۔ قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر جب بھی پڑھو ہمیشہ روح میں سکون اترتا ہے۔ مفاہیم احادیث میں صبر کی فضیلت پڑھنے کو ملی

میری یہی دعا ہے کہ اللہ پاک ہم سب مسلمانوں کو صبر کرنے والا بنائے، آمین۔ سلسلہ وار ناول اک دیا ہے ہاتھوں پر از قلم نگہت سیما دوسری قسط پہلی قسط سے زیادہ دلچسپ رہی۔ رب کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اسلامی تاریخ از قلم ثمینہ عظمت علی ماشاءاللہ ... کیا طرزِ تحریر ہے۔ ثمینہ جی آپ کو پہلی بار پڑھا ہے۔ آپ کی مختصر کہانی میں بہترین پیغام تھا اب شادیوں میں صرف تاریخ ہی اسلامی رہ گئی ہے افسوس۔ (ارے ثمینہ تو کافی سینئر رائٹر ہیں بس کم، کم لکھتی ہیں) میری عید تم ہو از قلم سارہ عمر ماشاءاللہ سارہ، تم تو لکھتی ہی بہت زبردست ہو زیب اور فریحہ کی دلچسپ داستان اور اختتام پر بکرے کی خریداری کہانی ہلکی پھلکی اچھی لگی۔ گرد کے منظر نامے میں صائمہ قریشی کے قلم سے نکلی بہت بہترین تحریر...... حوصلہ شرطِ وفا ٹھہرا از قلم بشریٰ مسرور ماشاءاللہ بشریٰ آپی سے پاکیزہ کے صفحات پر ملاقات بہت اچھی لگی بشریٰ آپی سے تعلق آٹھ سال پرانا ہے۔ اور یہ ساتھ بہت پیارا ہے۔ آپ لکھیں اور خاص نہ ہو ممکن نہیں چوبیسویں قسط نہایت ہی دلچسپ رہی اختتام پر اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ امتحانی پرچہ از قلم شگفتہ بھٹی حمرہ کے بدلتے تیور رنگ ڈھنگ ایک ماں کی زیرک نگاہ سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ سکینہ کی فکر و وسوسے خدشے درست نکلے۔ اللہ بخش روزی روٹی کی فکر چھوڑ کر کیسے حمرہ کی نگرانی کر سکتا تھا۔ اختتام میں تشنگی رہی۔ (اب تم ہی نتیجہ اخذ کرو تاں) سکینہ پڑھی لکھی نہ تھی لیکن اللہ پاک نے ہر ماں میں ایک الارم فٹ کیا ہے جو آنے والے وقت و حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ ہو جس سے تیری نسبت از قلم قانتہ رابعہ ثمرہ مختار کی کہانی واقعی جو بھی اللہ سوہنے کے گھر اس کے محبوب کے روضے پر حاضری دے کر آتا ہے پھر یہ نسبتیں تا قیامت یاد رہتی ہیں۔ آنکھوں میں عکس بن کر جم جاتی ہیں۔ خاموش محبت از قلم سحر مومنہ مختصر اور بہت پیاری تحریر اسد، آنسہ کی دلچسپ داستان زندگی اِک دیا از قلم ماہ وش چودھری اجیہ کی کہانی ماضی و حال میں گردش کرتی رہی شروع میں کہانی الجھی، الجھی لگی جب اجیہ کے رشتے کی بات چلی تو کہانی سمجھ میں آنے لگی اور تجسس بڑھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے پھر آگے جو ہوا دل دکھ سے بھر گیا۔ ایک حادثہ اور سب ختم ایسے حادثات اکثر سننے میں آتے رہتے ہیں جن میں پوری کی پوری فیملی دارِ فانی سے کوچ کر جاتی ہے۔ خالہ کی بے حسی کی انتہا شکر وقار علوی کو بروقت اپنے سرد رویے کا احساس ہو گیا اور اس نے اجیہ کے ساتھ اپنا رویہ نرم کر لیا، اختتام اچھا لگا۔ شمع ہدایت، اختر شجاعت دل میں گھر کر گئیں واقعی آج ظلم نہیں ہو رہا ظلم عظیم ہو رہا ہے۔ وہ آئے بزم میں نزہت آپی نے ہما بیگ آپی سے ملاقات کروائی جو کافی دلچسپ رہی۔ مع تصویر تعارف بہت اچھا لگتا ہے۔ شائستہ زریں آپی کا سروے ماؤں اور ان کی اولاد کی موسم گرما تعطیلات کی خواہشات آج اور کل میرے لیے تو ساری چھٹیاں ایک طرف اور جون، جولائی کی چھٹیاں ٹاپ آف دی ٹاپ شائستہ آپی سروے بہت اچھا لگا۔ کچھ تم بھی کہو کچھ ہم بھی سنیں نزہت آپی کے دلچسپ سوالات کے ہماری پیاری رائٹرز نے خوب صورت جوابات دیے گوشۂ ظرافت زبردست یکے بعد دیگرے قہقہے ہی قہقہے بکرے کی کنورسیشن ہاہاہاہا۔ پاکیزہ کا ایک اور میرا من پسند سلسلہ بہنوں کی محفل ہے اس میں آ کر لگتا ہے فیملی ہال روم میں آ گئے ہیں۔ کیونکہ یہاں سارے علمی ادبی سنیئر جونیئر قلم قبیلے سے وابستہ ساتھیوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں پتا چلتی رہتی ہیں سب سے بہترین رشتہ دعا کا ہے اور پاکیزہ کی اس بزم میں دعائے صحت کروائی جاتی ہے جزاک اللہ خیراً کثیراً نزہت آپی آپ نے پانچ سال قبل جب میں شدید بیمار تھی میرے لیے بھی دعائے صحت کروائی تھی۔ دعائے صحت کے بعد قارئین و مصنفین کے دکھ درد میں بھی شرکت کی جاتی ہے۔ (محفل کا یہ انداز سابقہ ایڈیٹر انجم انصار نے ترتیب دیا تھا جس نے بہت مقبولیت پائی اور الحمدللہ ایسے ہی چلتا رہے گا) آمنہ حماد آپی کا انتخاب ہمیشہ لاجواب ہوتا ہے۔ میں اکثر گنگناتی ہوں اس سیگمنٹ کو ہمارے لیے نہایت محنت و توجہ کے ساتھ ترتیب دیتی ہیں صغریٰ زیدی، خوش ذائقہ شگفتہ یاسمین آپی ایسی ریسیپی ہر ماہ دیتی ہیں کہ ہم بہ آسانی ٹرائی کر سکتے ہیں۔ بزم پاکیزہ، روحانی مشورے، حسن نکھاریے، شوابے ہومیو کلینک مستقل تمام سلسلے ہمیشہ ہی بہترین ہوتے ہیں۔ دعا ہے کہ رب العالمین آپ کے میرے ہم سب مسلمانوں کے رزق و روزی میں صحت و تندرستی میں مال و اولاد میں سکھ چین، راحت و عافیت میں علم میں عمر میں عمل، عزت و وقار میں تا دم حیات تک خیر و برکت عطا فرمائے، آمین ہمارا رازق ہمارا خالق ہمارا پاک پروردگارِ عالم ہم سب ہمیشہ راضی رہے ہماری خطاؤں کو گناہوں کو معاف فرمائے آمین، دعاؤں کی طلبگار۔" (بہت پیارے اور طویل و عریض تبصرے کے لیے جزاک اللہ اب اسی طرح آتی رہنا)

☜ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ سے۔ ”اس بار رسالہ جلدی مل گیا اور پڑھ بھی لیا عید سے پہلے ہی۔ سب سے پہلے بہنوں کی محفل میں چھلانگ لگائی۔ بہنوں کے خطوط ان کا حال احوال پڑھا، اپنا خط پڑھ کر ہنسی بھی آئی کہ جب لکھنے بیٹھو پتا ہی نہیں چلتا کہ بندہ کیا لکھ رہا ہے۔ دوسرا میں لکھ کر پڑھتی نہیں ہوں اپنا لکھا ہوا (پڑھ بھی لیا کرو پہلے)۔ عذرا آپی کی غیر حاضری اس بار بھی محسوس ہوئی۔ (بس دعاؤں میں یاد رکھا کریں وہ بھی پاکیزہ کے سب ساتھیوں کو دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں) نزہت جی، آپ نے مجھے کراچی آنے کی آفر کردی کہیں ایسا نہ ہو میرے آنے جانے کے بعد آپ میرے آنے پر کانوں پر ہاتھ اور میرے جانے پر شکرانے کے نفل ادا کریں۔ (کیوں، تم کیا کوئی ہنگامہ کرنے آؤ گی) ہما بیگ کی باتیں اچھی لگیں، اختر شجاعت صاحبہ کا مضمون بھی پسند آیا اور بیٹی کو مبارک باد۔ اسلامی تاریخ...... آج کل سب جگہ ہی ایسا ہو رہا ہے، صرف شادی بیاہ ہی نہیں دیگر معاملات میں بھی یہی حال ہے۔ امتحانی پرچہ، شگفتہ نے حساس موضوع چنا۔ نوجوانی کی ناسمجھ عمر میں والدین کو اپنے بچوں پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، خاص کر کے اس سوشل میڈیا کے دور میں۔ آخری سہ پہر اچھا ناول تھا۔ گوشۂ ظرافت، عطاالحق قاسمی کا کالم بہت پسند آیا۔ آپی میرا ایک کالم لگا تھا گوشۂ ظرافت میں، کیا میں دوبارہ لکھوں؟ میری خواہش ہے کہ اس صفحے کی زینت بنوں۔ (جی لکھ سکتی ہیں) موسم گرما کی چھٹیاں کل اور آج ارے شائستہ ذرا مجھ سے آپ سوال کرتیں پھر میں بتاتی کہ کیسی مزیدار ہماری چھٹیاں ہوا کرتی تھیں۔ (اگلی دفعہ ضرور کریں گی سوال) زندگی گلزار ہے، میں اس ماہ مصنفہ نے دونوں ہیرو، ہیروئن کی تعریفی خصوصیات ہی زیادہ تر بیان کی ہیں جب ان کی تعریف مکمل ہوجائے گی تب نرگس نسیم حاضر ہوجائے گی تبصرہ کرنے کو۔ (ہاہاہا) حوصلہ شرط وفا، چلو جی مصنفہ صاحبہ آپ کی ایک ہیروئن کے مرنے کا انتہائی افسوس۔ اللہ تعالیٰ کروٹ، کروٹ جنت نصیب فرمائے آپ کی فرضی ہیروئن کو، آمین۔ کچھ دلچسپ موڑ پر آگئی ہے۔ ساحل، ویلڈن اسماجی اور نیو ناول نگہت سیما کا۔ ارے نگہت اب ہم ایک علاقے، ایک ضلع کی اور آپ سے آپ شہر کی پڑوسی کیا یوں خط کتابت رسالے پر تبصرہ کرتی اچھی لگتی ہیں۔ مجھے نگہت سیما سے پوچھ کر ان کا ایڈریس دے دیں یا تو فون نمبر ہی دے دیں۔ (نگہت سے پوچھنا پڑے گا وہ کافی مصروف رہتی ہیں اور زیادہ تر لاہور میں ہوتی ہیں) میں ایک کتاب لکھ رہی ہوں جب مکمل ہوگی تب چکوال میں تقریب رکھوں گی تب نگہت سیما کو میں نے انوائٹ بھی کرنا ہے اور یہ کہ وہ میری کتاب پر تبصرہ بھی لکھیں، آپ ان سے پوچھ کر بتایئے گا...... اور بہنوں سب کو سلام، اس ماہ طبیعت خرابی کی بنا پر نامکمل تبصرہ ہے میرا۔ ابھی تو میری ہڈیاں بول رہی ہیں ہاتھ جوڑ کر اللہ کا واسطہ نرگس ہمیں ذرا آرام دو...... تو چلو ان پر رحم کھاتے ہوئے اینڈ کرتی ہوں، اللہ حافظ۔“ (اتنی تکلیف کے باوجود تم نے تبصرہ لکھ لیا۔ آرام کرو، اللہ پاک جلد صحت سے نوازے، آمین)

☜ تفشا لاسرور، چھنہ۔ ”آپ کا ادارہ دوسرے اداروں سے اس طرح بہتر ہے کہ جواب کے لیے مہینوں انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب سے راضی ہوں، آمین۔ میں اور کہانیاں بھیجنا چاہتی ہوں۔“ (جی ضرور بھیجیں، ہم تو کوشش کرتے ہیں کہ قابلِ اشاعت یا ناقابلِ اشاعت کا فیصلہ جلد سے جلد کر کے لکھاری کو مطمئن کیا جائے تا کہ وہ آرام سے تخلیقی کام کی انجام دہی کرے۔ اگر ناقابلِ اشاعت ہے تو بھی ہم فوراً بتا دیتے ہیں اور قابلِ اشاعت کی صورت میں بھی اطمینان دلا دیتے ہیں کہ سال کے اندر، اندر لگ جائے گی آپ کی تحریر تو آپ کہیں اور نہ بھیجیں مگر کچھ نوآموز لکھاری نادانی کر جاتی ہیں تو خود مشکل میں مبتلا ہوتے ہیں)

☜ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ”پیارا پاکیزہ 30 تاریخ کو مل گیا اور ہم نے ہمیشہ کی طرح پاکیزہ اور آپ سب کو دعاؤں سے نوازا۔ نگہت سیما کے ناول اِک دیا ہے ہاتھوں پر، اچھا اسٹارٹ ہے لیکن پھر بھی ابھی ہم اس میں گھوم پھر رہے ہیں کچھ اقساط کے بعد کہانی میں چارم آ ہی جائے گا۔ (جی بالکل) اس بار اسما اشرف کے ساحل میں تھوڑا دل لگا ہے اور حوصلہ شرط وفا ٹھہرا بے حد پسند آ رہا ہے۔ بشریٰ مسرور ماشاء اللہ دلجمعی سے لکھ رہی ہیں۔ انہیں ہماری جانب سے مبارک باد کہیے۔ (جی ضرور) اس کے علاوہ زندگی گلزار ہے، یہ ناولٹ بھی دل کو لگ رہا ہے۔ غزالہ عزیز اچھا لکھ رہی ہیں تو نمرہ نور الصمد کا ناول آخری سہ پہر بھی کامیاب رہا۔ افسانوں میں ثمینہ عظمت علی کی کہانی اسلامی تاریخ عمدہ رہی۔ یقین جانیں ہم بھی اس قسم کی شادیوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ بس اس قسم کے لوگ ظاہر و باطن الگ رکھتے ہیں اللہ ہدایت دے۔ (آمین) اور میری عید تم ہو سارہ عمر نے خوب لکھا پیارا معصوم سا افسانہ پیارا لگا۔ اس کے علاوہ وردہ بخاری کی ہیں کوا کب کچھ نظر آتے ہیں کچھ کو بھی

امتیازی نمبروں سے ہم نے پاس کر دیا تو جناب امتحانی پرچہ کو شگفتہ بھٹی نے خوب اچھا حل کیا۔ ان کی کہانی ہمیں اچھی لگی اور ریما نور رضوان کا سوشل میڈیا وبال جان بالکل درست کہانی لگی۔ آج کل پڑھنے کا رواج کم اور سوشل میڈیا میں دنیا ومافیہا سے بے خبر کھو جانے کا طریقہ ہو گیا ہے۔ وہ آئے بزم میں ہما بیگ سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ شمع ہدایت میں اختر شجاعت صاحبہ کے مضامین دل کو چھوتے ہیں، تعریف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ایک پیاری سی بات بتاؤں، ہماری پیاری ٹیچر سلمٰی غزل صاحبہ سے ملاقات ہو گئی ہے، ان سے مل کر اتنی زیادہ خوشی ہوئی ہے وہ بہت پیاری، بے حد محبت اور عزت کرنے والی ہیں۔ اللہ سلامت رکھے، آمین۔'' (ارے یہ تو بہت اچھا ہوا، دیکھیں پاکیزہ کیسے بچھڑے ہوؤں کو ملاتا ہے۔ اللہ آپ دونوں سمیت سب محبت کرنے والوں کو سلامت رکھے، آمین)

✍ مسرت عزت، شبقدر، کے پی کے سے۔ ''سب سے پہلے رفعت سراج کے ناول پلکوں سے اٹھاؤں اس کو پر بات کروں گی۔ پچھلے ماہ بے حد مصروفیات کی وجہ سے تبصرہ نہ بھیج سکی۔ رفعت جی نے آخر کیوں اتنی جلدی، جلدی سب کچھ سمیٹا، مجھے سب کرداروں سے بچھڑنے کا بہت دکھ ہوا۔ اب عرشلہ اور فری جیسی باتیں کون کرے گا اور داؤد علوی جیسے بندے کو کہاں ڈھونڈیں گے۔ رفعت جی بس جاری رکھنا تھا آپ نے اس تحریر کو، ہر تبصرے کے شروع میں پہلے آپ کے ناول پر تبصرہ کیا میں نے مگر اب مزہ نہیں آرہا۔ بہر حال آپ کو بے حد، بے حد مبارک باد۔ رفعت جی کی تصویر میں نے دیکھی، یقین ہی نہیں آتا اتنی معصوم اور سادہ سی شخصیت نے لکھا ہے یہ ناول۔ (ماشاء اللہ) آسیہ عامر نے اپنا وعدہ یاد رکھا اور پورا کیا یعنی میری تحریر علم عمل پر تبصرہ کیا۔ بہت، بہت شکریہ آسیہ عامر۔ حوصلہ شرط وفا ٹھہرا ابھی اچھی جا رہی ہے۔ آسیہ بی نے اپنے برے کرتوتوں سے اپنے ہی گھر اور اولاد کو آگ میں جھونک دیا۔ عید زہے نصیب کا آخری حصہ بہترین رہا...... بس کرداروں کے نام مجھے پسند نہیں آئے پٹھانوں کے لیے بس کچھ نام مخصوص کر دیے گئے ہیں مثلاً گلالئی، خان وغیرہ (ارے یہ تو اتنے خوب صورت اور متاثر کن نام ہیں جو اپنے علاقے کی ثقافت ظاہر کرتے ہیں) زندگی گلزار ہے کچھ خاص مزہ نہیں دے رہی بس حسین مناظر اور پرانے واقعات یعنی ہیرو اور ہیروئن کی بارش میں پہلی ملاقات وغیرہ۔ کیسا ہے یہ جیون، حقیقت سے بھر پور ایک بہترین تحریر تھی بلکہ اس تحریر میں مجھے بہت سے سوالوں کے جواب مل گئے، واقعی قسمت کے لکھے کو تدبیر اور کوشش سے نہیں ٹالا جا سکتا۔ چاند کی اوٹ سے بھی اچھی تحریر تھی، مہ جبین نے آخر میں بہت اچھا فیصلہ کیا۔ بہت ہی زبردست تحریر تھی۔ پُر رونق عید بھی مختصر سی مگر پُر اثر تحریر تھی۔ سروے ہمیشہ کی طرح اہم اور دلچسپ موضوع پر مبنی تھا۔ بہنوں کی محفل، پاکیزہ ڈائری اور پاکیزہ کے تمام سلسلے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ آخر میں خاص طور پر ذکیہ بلگرامی صاحبہ کی نعت رسول مقبول ﷺ نے دل موہ لیا۔ بہت ہی خوب صورت اور دل پر اثر کرنے والے الفاظ ہیں۔'' (بہت پیارے تبصرے کا شکریہ۔ قارئین کی رائے یکساں اہم ہے اسی سے مصنفات اپنی تحریروں کو مزید بہتر بناتی ہیں)

✍ زرینہ خانم لغاری، مظفر گڑھ سے ایک بھولا بھٹکا خط جواب پہنچا ہے۔ ''اپریل کا شمارہ ملا، دھیمی مسکراہٹ والی حسینہ سرورق پر براجمان تھی۔ آگے بڑھے، سب سے پہلے پلکوں پہ اٹھاؤں پر پہنچے۔ یہ تو سرپرائز ہو گیا، کہانی کا اینڈ آ گیا۔ اب سمجھ آیا داؤد علوی نے زین صاحب کو پلکوں پر اٹھا ہی لیا۔ کتنی بڑی پریشانی علوی صاحب نے اپنے اثر رسوخ سے کتنی جلدی حل کر لی لیکن اینڈ کچھ ادھورا رہا۔ عرشلہ کی شادی عامر سے کروا دی جاتی اور ماریہ کا کپل داؤد علوی سے فٹ کر دیا جاتا۔ (یہ تو صحیح نہیں ہوتا بھئی) اور میم ثمینہ کو بہشت بریں کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔ کھٹی میٹھی زندگی، رشا صاحبہ خواہ مخواہ دیورانی سے جیلس ہو رہی تھیں اور غلط فہمیاں پیدا کروا رہی تھیں، شکر سمعیہ کو سمجھ آ گئی۔ یہ پنجابی شعر پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔

کدی تے پیکے جا نی بیگم ...... آدے سکھ دا ساہ نی بیگم

یہ کہنے والی باتیں ہوتی ہیں، بیگم میکے چلی جائے تو شوہر حضرات بوکھلائے پھر رہے ہوتے ہیں۔ دکھاوا گڈ کہانی تھی۔ یہ شوشا اور دکھاوا ہی تو معاشرے کو خراب کر رہا ہے۔ مہنگائی، مہنگائی کا شور مچانے والے ہی زیادہ دکھاوا کرتے ہیں۔ ربیکا نے شیخی خوروں کا انجام دیکھ لیا، شکر ہے ہوش میں آ گئیں۔ ساحل آہستہ روی سے چل رہا ہے۔ ساحل کے گھر کے علاوہ کئی گھروں کی کہانیاں چل رہی ہیں۔ پادری صاحب کا دماغ خراب ہے، ٹھیک کرنا پڑے گا۔ فرات کا کردار بہت پسند ہے۔ پریشانی سو، سو

digest library.com

تحریر تھی، وہی ماؤں کے وہم بیٹے کی پسندیدہ لڑکی ہمارا بیٹا چھین لے گی۔ بیٹا تو ویسے ہی بیوی کو پیارا ہو جائے گا۔ قانونِ قدرت ہے، بعض دفعہ ماؤں کی پسندیدہ بہویں خون کے آنسو رلا دیتی ہیں۔ محبت خواب رنگ کا دوسرا حصہ پڑھا۔ زمزمہ صاحبہ کو من مانی کرنے کا خوب صلہ ملا جو ماں، باپ کا دل دکھاتے ہیں وہ کبھی سکھی نہیں رہتے۔ غفران سے شادی کرنے پر والدین راضی نہیں تھے۔ بزرگوں کے تجربے ہوتے ہیں۔ غفران کتنا بدخصلت انسان تھا۔ معصوم بچی کو اتنا ہراساں کیا اس نے۔ حوصلہ شرط وفا غضب کی کہانی ہے۔ قدم، قدم پر تجسس ہے۔ زونی پہلے خاموش تھی لیکن اب بولی ہے تو ایسا لگا ہے مردہ کفن پھاڑ کر بولے۔ سچویشن کا بھی خیال نہیں کیا۔ مرحا کے ساتھ عتیق نے کچھ برا کر لیا ہے۔ ممانی نے بڑے غضب کے گانے گائے جن سے تخریب کاری ٹپکتی تھی۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ رمضان میں صرف اپنی پیٹ پوجا نہیں کرنی چاہیے، آس پڑوس والے ہمسائیوں کا بھی خیال کرنا چاہیے۔ عیدز ہے نصیب، شکر ہے شروع کرنے سے پہلے باقی آئندہ دیکھ لیا۔ اگلے مہینے ان شاء اللہ پڑھیں گے۔ کوئی نہیں باتوں جیسا دوسروں کو نصیحت خود میاں فضیحت والا قصہ تھا۔ تربیت کی لاج جانے ساسیں، بہوؤں کو کھانا پکانے کی مشین سمجھتی ہیں۔ ایک ہی وقت میں گوشت آلو، فرائی بھنڈی، کھیر، اسپرنگ رول، کباب بنانے کا حکم جاری کر دیا جاتا ہے جیسے کہ بہویں مشین ہیں۔ اتنے کام کرنے کے باوجود شوہر صاحب نے پھوہڑ کا خطاب دے دیا۔ اب ماہا آنسوؤں سے تکیہ نہ بھگوئے تو کیا کرے۔ نامعتبر سب کہانیوں سے بہترین کہانی تھی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ فرح بخاری کے لیے دل سے دعائیں نکلیں۔ اس کہانی میں بہت بڑا سبق تھا۔ رشتے صرف خون کے ہوتے ہیں۔ سین نے سمجھداری کا ثبوت دیا۔ یہی تو ان رسالوں میں سبق ہوتا ہے۔ اگر ایسا معاملہ ہو جائے تو اسے کیسے حل کرنا ہے۔'' (بہت اچھے سے تبصرہ کیا۔ بے شک ان کہانیوں سے بہت کچھ سبق حاصل ہوتا ہے۔ رائٹرز اپنے مشاہدات سے کہانی اخذ کرتی ہیں، سراہنے کا شکریہ)

☜ نازنین آفریدی، پشاور سے۔'' آف موڈ کے ساتھ پاکیزہ اٹھایا تھا اور صفحہ نمبر 192 پر سائڈ پر نور الصباح کا ارسال کردہ میرا بہترین دوست پڑھا، یقین مانیں تب سے اب تک ہنس رہی ہوں۔ اس ماہ کا بھی پورا ہی رسالہ بہت بہترین تھا۔ کچھ تم بھی کہو میں شبینہ گل کے جوابات پسند آئے جبکہ روحانی مشورے میں پاپ رازی بن کر فوراً ہی نماز کن فیکون کی تصویر لی کیونکہ ادائیگی کا ارادہ ہے۔ ساتھ ہی دوسری تصویر کھٹا کھٹ فہمیدہ جاوید صاحبہ کی ارسال کردہ ترکیب منطو کی ہے۔ فہمیدہ صاحبہ کو بتانا چاہوں گی کہ یہاں پشاور کا ایک علاقہ ہے جسے بورڈ کہتے ہیں۔ دراصل پشاور بورڈ کی نسبت سے یہ نام پڑا ہے، تو بورڈ کو افغانیوں کی کثیر تعداد ہونے کی وجہ سے چھوٹا کابل بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں پر منطو کی شاپس ہیں جو کہ افغانیوں کی ہی ہیں اور بہت مزے کا منطو ملتا ہے۔ اس گرمی میں کہیں پہنچتے، پہنچتے خراب نہ ہو جائے ورنہ نزہت آنٹی اور فہمیدہ صاحبہ کے لیے بورڈ کا منطو بھجواتی میں پشاور سے۔ (ارے بہت شکریہ، تم نے کہا اور یہاں پہنچ بھی گیا اور ہم نے مزے بھی لے لیے) بہرحال تصویر save کر لی ہے، بنا بھی لیں گے کسی دن۔ ہما بیگ سے ملاقات اتنی اچھی لگی، وہ اتنی سچی اور اتنی اپنی، اپنی سی لگیں، یقین کریں ان کے اندر تو مجھے اپنی جھلک نظر آئی۔ بہت پیاری اور سچی باتیں کیں انہوں نے۔ ایسے لوگ کم ہی ہیں۔ (ہما بہت پیاری شخصیت کی مالک ہیں) اب ہر طرف منافقت کا راج ہے، ان کے بیٹے کو بھی اللہ غریقِ رحمت کرے، آمین۔ کہانیوں میں پہلا تبصرہ نمرہ عبدالصمد کی آخری سہ پہر پر کرنا چاہوں گی۔ بہت بہترین تحریر لیکن میں نے ایک الگ ہی نظریے سے اس کہانی کو پڑھا۔ مانا کہ بیگم صاحبہ انا پرست تھیں لیکن کم سے کم ان کی زندگی تک سب (سالم) intact تو تھا، ان کی موت کے ساتھ نوکر بھی بکھر گئے۔ ایسے انا پرست بڑے اکثر خاندانوں میں ہوتے ہیں لیکن کم سے کم انہوں نے خاندانوں کو جوڑ کر تو رکھا ہوتا ہے۔ ان کی موت کے ساتھ سب بکھر جاتا ہے۔ اِک دیا ہے ہاتھوں پر سمجھنے کی کوشش جاری ہے ابھی۔ ثمینہ عظمت علی کی تحریر آج کے معاشرے کی عکاس ہے۔ اسلام برائے نام ہی رہ گیا ہے اب تو۔ باقی سب کچھ انگریزی ہے۔ ہیں کو اک بِکھ، وردہ بخاری کی تحریر بھی مکمل دلچسپی کے ساتھ پڑھی۔ میری بھی جب کوئی تعریف کرے تو پوری بتیسی نکال کر ہنس پڑتی ہوں۔ واقعی یہ کہانیاں ہی ہوتی ہیں جو ہماری تربیت کرتی ہیں کہ ہر تعریف، تعریف نہیں ہوتی، کچھ چاپلوسی بھی ہوتی ہے اس لیے سوچ لینا چاہیے کہ واقعی یہ صفات میرے اندر موجود بھی ہیں یا مطلب نکالا جا رہا ہے۔ (بالکل صحیح کہا) ساحل بھی اچھے انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ گرد کے منظر نامے کے لیے میں یہ کہوں گی کہ جب کوئی تحریر بے دلی سے لکھی جاتی ہے تو وہ قاری کو بھی محسوس ہو جاتی ہے وہ خانہ پُری لیکن پھر ہمیں یہ کہہ کر خاموش کرا دیا جاتا ہے کہ

لکھاری کے ذہن میں پہلے سے پورا خاکہ موجود ہے (قاری کا کام تو ارائے دینا ہے، سو سنبھل کے دو اور ضرور دو) رشا عزیز کی پوزیشن ہولڈر اچھی تحریر تھی۔ پھر وہ بات کہ جو قسمت ہو وہ آپ سے کوئی نہیں چھین سکتا جو نہ ہو وہ کوئی دے نہیں سکتا۔ حوصلہ شرط وفا ٹھہرا میں ماموں کا چکر جونرس شگفتہ کے ساتھ چلنے والا ہے اس کی مجھے بڑی خوشی ہے کیونکہ ممانی کو اپنی بدنیتی کا پھل ملنا چاہیے۔ قانتہ رابعہ کی تحریر پڑھ کر تو بے ساختہ عمرہ کرنے کا دل چاہا اور یقین کریں ڈائجسٹ رکھ کر تھوڑی دیر یہی سوچتی رہی کہ کون محرم ہو سکتا ہے جس کے ساتھ عمرے پر جایا جائے۔ (ان شاء اللہ ضرور جاؤ گی) زندگی گلزار ہے، سوشل میڈیا وبال جان اور میری عید تم ہو کچھ خاص پسند نہیں آئیں۔ اس ماہ کی اچھی تحریروں میں امتحانی پرچہ بھی شامل ہے۔ میرا خیال ہے تبصرہ اچھا خاصا طویل ہو گیا ہے بلکہ بھرپور۔" (بہت شکریہ بھرپور تبصرے کا، رائٹر کو بھی تعریف، تنقید، تبصرہ اچھا لگتا ہے اور اس کا قلم مزید رواں ہو جاتا ہے)

✍ طور سینا، نامعلوم مقام سے۔ "میں ایک لکھاری ہوں، مختلف رسالوں میں کہانیاں آچکی ہیں۔ روزنامے میں بھی لکھا ہے۔ پاکیزہ کے لیے لکھنا چاہتی ہوں۔" (جی ضرور لکھیں، ماہنامہ پاکیزہ پڑھ کر اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ کس مزاج کی کہانیاں آتی ہیں۔ کوئی چھوٹی تحریر بھیجیں تاکہ آپ کی صلاحیت اور طرز تحریر کا اندازہ لگایا جا سکے)

✍ نیلوفر خان، بہارہ کہو سے۔ "آپا سب سے پہلے تو بہت شکریہ کہ میرے بھیجے گئے مراسلات اور اشعار وغیرہ پاکیزہ کی زینت بناتی ہیں۔ تبصرہ تو خیر میں کبھی، کبھی کرتی ہوں مگر گزشتہ دو ماہ سے لکھنا ضرور چاہ رہی تھی مگر پھر اگلے ماہ تک ٹل جاتا۔ پچھلے کئی ماہ سے جو اسما اشرف منہاس کی کہانی ساحل قسط وار آرہی ہے تو اس کے لیے کہنا ہے۔ شروع میں تو بہت سلو چلی، کچھ تخلک سی بھی تحریر رہی مگر اب دو ماہ سے تو بہت ہی عمدہ قسطیں دے رہی ہیں۔ یہ ان کی قابلیت اور گہرا مشاہدہ ہے اور صلاحیت تو خیر ہے ہی، بہت خوب صورت انداز میں تحریر آگے جا رہی ہے۔ ایسی ہی باشعور تحریریں ہونی چاہئیں مگر اب عالی بخت کے ماضی کا حال بھی کھول ہی دیں۔ (جی بس آئندہ قسط میں کھل ہی جائے گا) دوسرے بشریٰ مسرور کہانی در کہانی چلا رہی ہیں، اب پوری کرائم اسٹوری کر دی ہے۔ دیکھیں سب نوجوان نسل کا کیا، کیا انجام دکھاتی ہیں۔ (بس آپ پڑھتی جائیں) اس کے علاوہ افسانے اور ناولٹ بھی سب بہت دلچسپ جا رہے ہیں۔ وردہ بخاری ہمیشہ ہی بہت اچھی طرح سے گھریلو مسائل ڈسکس کرتی ہیں۔ نمرہ نور الصمد لگتا ہے نیا اضافہ ہیں، ان سے کہیں اور بھی کہانیاں لکھیں۔ سارہ عمر کی بھی ہلکی پھلکی تحریر اچھی لگی۔ شگفتہ بھٹی اور قانتہ رابعہ تو سینئر قلم کار ہیں، ہمیشہ بہت جاندار پیغام لاتی ہیں۔ دیگر سلسلے بھی اچھے ہیں۔ سب بہنوں سے محفل میں ملاقات اور ان کی سرگرمیاں جان کر خوشی ہوتی ہے۔ میری بچیوں کو بھی دعاؤں میں ضرور یاد رکھا کریں۔" (جی ان شاء اللہ۔ بہت شکریہ نیلوفر آپ نے مختصر مگر بہت اچھا تبصرہ کیا۔ اسی طرح آتی رہیے گا۔ رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ اللہ آپ کو اپنے بچوں کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے، آمین)

عزیزو...... اگلے ماہ تک کے لیے اجازت۔ جب تک آپ پورا پاکیزہ پڑھیں اور ہر ماہ کی 15، 16 تک اپنے تبصرے، خطوط بذریعہ میل۔ واٹس ایپ یا پوسٹ ارسال کر دیا کریں۔

تمام بہنوں کا شکریہ جو کسی نہ کسی سلسلے میں حصہ لیتی رہتی ہیں اور اپنی کاوشیں یا خوب صورت انتخاب بھیجتی رہتی ہیں۔

پھر سے بتا دیں کہ اگست کا شمارہ ساون نمبر ہے اور نومبر کا شمارہ دلہن نمبر ہوگا، ان شاء اللہ۔

آپ سب کے لیے پُرخلوص دعائیں ہیں۔ اللہ پاک دنیا بھر میں تمام مسلمانوں کی حفاظت فرمائے اور انہیں باطل پر سرخرو فرمائے...... الٰہی آمین۔

نصر من اللہ و فتح قریب

خیر اندیش...... نزہت اصغر

Digest Novels Lovers Group

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.C فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783, 021-35802552 EXT 110

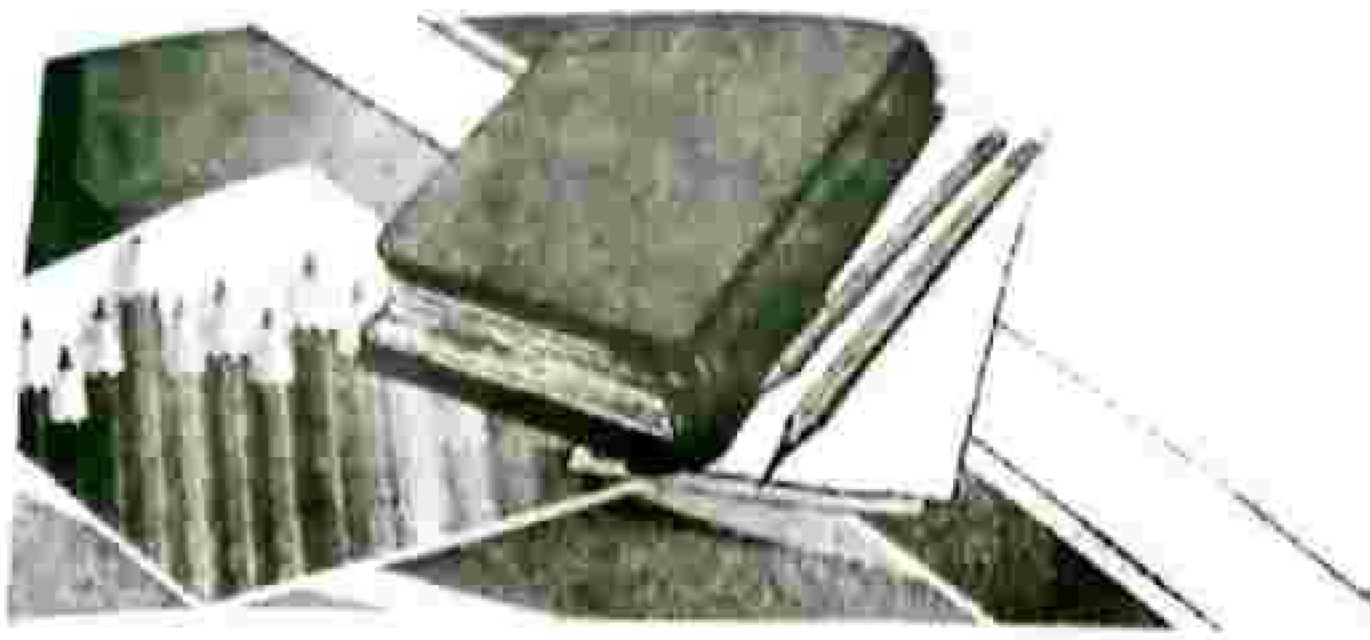

پاکیزہ ڈائری

آمنہ حماد

حمد باری تعالیٰ

جہاں کا پالنے والا خدا تو ہی تو ہے
رزق، پانی اور ہوا جس نے دیا تو ہی تو ہے
تیری رحمت بے کراں ہے تیری بخشش بے حساب
معاف کر دیتا ہے جو ساری خطا تو ہی تو ہے
ہر مصیبت ہر گھڑی میں آسرا تو نے دیا
بے بسوں کا بے نواؤں کا نوا تو ہی تو ہے
مانگنے والے نے جو مانگا اسے وہ مل گیا
اور بن مانگے بھی جو کر دے عطا تو ہی تو ہے
لہلہاتے پیڑ پودے یہ مہکتی سر زمیں
جس کی رحمت سے ہوئی ہم کو عطا تو ہی تو ہے
تُو ہے واحد تُو احد تیرے سوا کوئی نہیں
کیوں میں مانگوں غیر سے میرا خدا تو ہی تو ہے

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی

نعت رسول مقبول ﷺ

نہ کہیں سے دور ہیں منزلیں، نہ کوئی قریب کی بات ہے
جسے چاہے اس کو نواز دے، یہ در حبیب کی بات ہے
جسے چاہا در پہ بلا لیا، جسے چاہا اپنا بنا لیا
یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے، یہ بڑی نصیب کی بات ہے
وہ بھٹک کے راہ میں رہ گئی، یہ مچل کے در سے لپٹ گئی
وہ کسی امیر کی شان تھی، یہ کسی غریب کی بات ہے
وہ خدا نہیں یہ خدا نہیں، وہ مگر خدا سے جدا نہیں
وہ ہیں کیا مگر وہ ہیں کیا نہیں، یہ محب حبیب کی بات ہے
ترے حسن سے، تری شان تک، ہے نگاہ و عقل کا فاصلہ
یہ ذرا بعید کا ذکر ہے، وہ ذرا قریب کی بات ہے
تجھے اے منور بے نوا در شہ سے چاہیے اور کیا
جو نصیب ہو کبھی سامنا، تو بڑے نصیب کی بات ہے

کلام: منور بدایونی
پسند: فضہ بتول، بہارہ کہو

کرم مجھ پر کردو شہنشاہ عالی

کرم مجھ پر کردو شہنشاہِ عالی
مدینے بلالو مدینے کے والی
شہا پورا عاصی کا ارمان کردو
چلا آئے در پہ تمہارا سوالی
غم دو جہاں کا نہیں خوف اس کو
مدینے کی چھاؤں میں جس نے جگہ لی
کٹے عمر میری مدینے کے غم میں
یہی التجا ہے شہنشاہِ عالی
تڑپتے ہوئے دل کو مل جائے راحت
لگالوں جو سینے سے روضے کی جالی
ملی میرے آقا سے خیرات جس کو
کہاں جھولی رہ پائے گی اس کی خالی
سدا آپؐ کے غم میں روتا رہوں میں
عطا ہو مجھے آقا عشقِ بلالیؓ
تمہاری ہی چوکھٹ پہ مر جائے ثانی
یہی آرزو ہے شہنشاہ عالی

کلام: محمد شان عالم ثانی عطاری
پسند: ثوبیہ ظہور، ضلع اٹک

متقی اور پرہیز گار کون

حضرت عمر فاروقؓ نے ایک دن خطبہ میں برسرِ منبر فرمایا۔ ”لوگو! فروتنی اور خاکساری اختیار کرو کیونکہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جس نے اللہ کے لیے (یعنی اللہ کا حکم سمجھ کر اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے) خاکساری کا رویّہ اختیار کیا (اور بندگانِ خدا کے مقابلے میں اپنے آپ کو اونچا کرنے کے بجائے نیچا رکھنے کی کوشش کی) تو اللہ اس کو بلند کرے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے خیال اور اپنی نگاہ میں تو

Digest Library.com

چھوٹا ہوگا لیکن عام بندگانِ خدا کی نگاہوں میں اونچا ہوگا۔ اور جو کوئی تکبر اور بڑائی کا رویہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو نیچے گرا دے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ عام لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل و حقیر ہو جائے گا، اگرچہ خود اپنے خیال میں بڑا ہوگا لیکن دوسروں کی نظر میں وہ کتوں اور خنزیروں سے بھی زیادہ ذلیل اور بے وقعت ہو جائے گا۔" (معارف الحدیث بحوالہ شعب الایمان للبیہقی)

عزت نہ مال میں ہے نہ لباس کے اعلیٰ اور قیمتی ہونے میں بلکہ ایمان اور تقویٰ میں جو جتنا بڑھا ہوا ہے اس کے لیے اتنی ہی عزت اللہ نے رکھی ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقکم

بے شک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار ہے۔ (سورۂ حجرات آیت نمبر 13)

از: نازنین آفریدی، پشاور

رسول اللہ ﷺ کی شان

داؤد بن حصین کا بیان ہے کہ عرب کے لوگ عام طور پر یہ کہتے ہوئے سنے جاتے تھے کہ محمد بن عبداللہ اس شان سے جوان ہوئے کہ آپ اپنی قوم میں سب سے زیادہ با اخلاق، پڑوسیوں کی خبرگیری کرنے والے، حلیم و بردبار، صادق، امین جھگڑے سے دور رہنے والے، فحش گوئی، دشنام طرازی سے پرہیز کرنے والے تھے اسی وجہ سے آپؐ کی قوم نے آپ کا نام الامین رکھا تھا۔

از: ثمینہ کوکب، جہلم

آگہی

بے خبری بھی اِک نعمت سے ہرگز کم نہیں
آدمی کی جان لے لیتی ہے ضربِ آگہی
جو گزرتی ہے دلوں پر واقفانِ حال کے
پوچھیے ان سے کہ کیا ہوتا ہے کربِ آگہی

کلام: راؤ تہذیب

پسند: سپاس گل، رحیم یار خان

ماما ٹھگ

ہمارے قریبی گاؤں میں سالانہ میلا لگتا ہے بڑی عید سے ہفتہ بھر پہلے...... مرد حضرات پورا ہفتہ جاتے ہیں عورتیں عید اور عید کے دوسرے دن جاتی ہیں یا چاند رات کو لنگر کھانے جاتی ہیں...... ہمارے ایک عزیز تھے (نام نہیں لکھوں گی کہ مجھے جوتے نہ پڑ جائیں۔) انتہائی ٹھگ قسم کے جنہیں ہم ماما ٹھگ بولتے وہ ہم کو اکساتے کہ عیدی سنبھال کر رکھنا شام کو سب بچے میرے ساتھ میلے پر چلنا...... سیانے بچے آدھی عیدی گھر رکھ جاتے...... ماما ٹھگ ہم بچہ پارٹی کو میلے پر لے جا کر ڈراتے کہ مجھے جتنی توفیق ہو چندے کے نام پر ہر بچہ عیدی دے ورنہ میں سب کو یہیں چھوڑ جاؤں گا ہم نے میلے میں گم ہوتے بچوں کے قصے کہانیاں سن رکھی تھیں سو ہم ڈر جاتے اور ہم ماما ٹھگ کا مطالبہ پورا کر دیتے...... سب بچے اپنی پسند کی چیزوں کے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں بھی خریدتے۔ پکوڑے، سموسے، جلیبیاں، پاپڑ وغیرہ۔ خوب گھوم پھر چکے ہوتے اب واپس گھر جاتے ہوئے ماما ٹھگ ہمیں ڈراتے ہوئے سیدھے راستے نہیں جانا کوئی دیکھ لے گا تو ڈانٹ پڑے گی۔ (یاد رہے ہم گھر والوں سے چوری میلے میں آتے تھے) سو واپسی میں وہ ہمیں دور والے راستے سے جہاں ایک جنگل بھی آتا لے کر جاتے جب ہم جنگل کے قریب پہنچتے تو وہ بولتے وہ سامنے پہاڑی پر کیا ہے؟ ہم بولتے بکریاں چر رہی ہیں۔ وہ بولتے نہیں، یہ چڑیل ہے، بکری کا بھیس بدلا ہے۔ ہم ڈر جاتے وہ کچھ دیر سوچتے پھر اپنی جھولی ہمارے آگے پھیلاتے کہ سب بچے تھوڑی، تھوڑی کھانے پینے کی چیزیں میری جھولی میں ڈالو ہم بے بسی کا شکار نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی، اپنی پسندیدہ چیزوں کی قربانی دے دیتے...... ماما ٹھگ چیزیں لے کر بولتے۔ میں جا رہا ہوں چڑیل کو صدقہ دینے تا کہ وہ خوش ہو کر ہمیں کچھ نہ کہے تم لوگ مڑ کر نہیں دیکھنا ورنہ چڑیل کھا جائے گی ہم سب بچے ڈر کر ایک ساتھ بیٹھ کر کلمہ پڑھنے لگتے۔ ماما ٹھگ چڑیل کے بہانے اپنی پیٹ پوجا کر کے واپس آتے اور بولتے دیکھو چڑیل چلی گئی بہت خوش تھی اب کچھ نہیں کہے گی۔ چلو اب گھر چلیں اور ہم بچے دل ہی دل میں یہ سوچتے کہ اب اگلی بار نہیں آنا

digestlibrary.com

لیکن سب کچھ بھول بھال کر پھر سے بیوقوف بننے کے لیے ماما ٹھگ کا اعتبار کر کے دوبارہ میلے کی رونقیں دیکھنے چلے جاتے کہ بچپن اسی کو کہتے ہیں۔

تحریر: نرگس نسیم، صابہ موہڑہ

غزل

مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں
مرے نصیب میں تو لکھا نہیں
میں کیسے مان لوں بہار آئی ہے
میرے آنگن میں کوئی پھول کھلا نہیں
زرد چہرے پہ کیسے نور آتا
جس کو چاہا وہ ملا نہیں
کوئی رشتہ نہیں مرا اس سے
لیکن اجنبی کبھی وہ لگا نہیں
وہ کیسے مرا ہم سفر ہوتا
ہم نے مانگی کبھی دعا نہیں
کل بھی دل میں مرے دھڑکتا تھا وہ
آج بھی اس کے سوا کوئی بچتا نہیں

مرسلہ: شہیلا عاشی، گلشن اقبال، کراچی

معمولی بات

لڑکی والے پپو کے گھر رشتے کی بات پکی کرنے کے لیے آئے تو پپو پیاز کھا رہا تھا۔ لڑکی کی ماں نے پوچھا۔ "پپو پیاز کیوں کھا رہا ہے؟"

پپو کی ماں۔ "پپو جب شراب پی لیتا ہے تو پیاز کھاتا ہے تاکہ منہ سے شراب کی بو نہ آئے۔"

لڑکی کی ماں۔ "ہائے پپو شراب بھی پیتا ہے؟"

پپو کی ماں۔ "کبھی، کبھی مجرا دیکھنے کوٹھے پر جاتا ہے تو تھوڑی پی لیتا ہے۔"

لڑکی کی ماں۔ "ہائے پپو کوٹھے پر بھی جاتا ہے؟"

پپو کی ماں۔ "بہن وہ تو کبھی، کبھی ڈکیتی یا راہزنی میں اچھا مال مل جائے تو ذرا چکر لگا لیتا ہے۔"

لڑکی کی ماں۔ "پپو ڈکیتیاں اور راہزنیاں بھی کرتا ہے؟"

پپو کی ماں۔ "ہاں مگر آج تک پکڑا نہیں گیا جہاں کوئی اسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے اسے گولی مار کر وہیں قتل کر دیتا ہے۔"

لڑکی کی ماں۔ "بہن معاف کرنا، مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔ کیونکہ آپ کا بیٹا پیاز کھاتا ہے۔"

اس پر پپو کے گھر والوں نے شور شرابا شروع کر دیا کہ "صرف پیاز کھانے کی وجہ سے ہمیں انکار کر دیا..... یہ تو سراسر ظلم ہے۔"

از: ساجدہ ظفر، کمالیہ

غزل

کُو بہ کُو پھیل گئی بات شناسائی کی
اس نے خوشبو کی طرح میری پزیرائی کی
کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی
وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی میرے ہرجائی کی
اس نے جلتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آگئی تاثیر مسیحائی کی
تیرا پہلو تیرے دل کی طرح آباد رہے
تجھ پہ گزرے نہ قیامت شبِ تنہائی کی

شاعرہ: پروین شاکر

پسند: شبانہ جعفری، گجرات

بچے انگوٹھا کیوں چوستے ہیں

بچوں میں انگوٹھا چوسنے کی عادت کی اہمیت کے بارے میں مختلف آرا پائی جاتی ہیں لیکن ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہوا کہ انگوٹھا چوسنے کی طبعی عادت کسی بھی لحاظ سے نقصان دہ ہے۔ یہ خبر والدین کے لیے بڑی ہمت افزا ہے۔ انگوٹھا یا انگلیاں چوسنے کی عادت ایک نارمل بات ہے اور شیر خوار اور چھوٹے بچوں کے لیے یہ انتہائی بے ضرر ہے۔

بچوں کے ماہر ایک ڈاکٹر کے مطابق شیر خوار بچے کو چوسنے کی عادت ہوتی ہے وہ ماں کی چھاتی ہو یا بوتل کی نپل، یہ ایک ایسی فطری عادت ہے جو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے تاہم بعض شیر خوار بچے بھوک نہ ہونے

Digest Library.Com

کے باوجود اضافی طور پر انگوٹھا یا انگلی چوستے ہیں جو بلا ضرورت ہے۔ پانچ میں سے ایک بچہ پانچ برس یا اس سے بھی زیادہ عمر تک انگوٹھا چوستا رہتا ہے اگر بچہ یہ عمل کبھی، کبھی کرتا ہے تو قطعی بے ضرر ہے۔ لیکن اگر بڑی عمر تک انگوٹھا چوسنے کی عادت دیرینہ شکل اختیار کر لے تو والدین کو چاہیے کہ وہ رفتہ، رفتہ اس عادت کو چھڑانے کی کوشش کریں یا پھر کسی ڈینٹسٹ سے مشورہ کریں کیونکہ اس دیرینہ عادت کے باعث بچوں کے نکلنے والے پکے دانت ٹیڑھے ہو سکتے ہیں اس کے علاوہ انگوٹھے پر سوجن بھی آ سکتی ہے۔

اس عادت کے پڑ جانے کی صفائی یا طرف داری میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بچہ جوں ہی اپنی ماں سے دور ہوتا ہے وہ اس احساسِ دوری یا جدائی کو زائل کرنے کے لیے انگوٹھا بھی چوسے جاتا ہے یا منہ میں کوئی چیز چباتا رہتا ہے۔ انگوٹھا چوسنے کی اس عادت کو بطور ایک رابطہ بناتا ہے۔ بچہ اکثر اپنے دوسرے ہاتھ میں اپنا کوئی پسندیدہ کھلونا تھامے رہتا ہے اور ساتھ انگوٹھا چوستا ہے۔ انگوٹھا چوسنے کی اس عادت پر ماہرینِ اطفال نے اپنے انداز سے تحقیق کی ہے اور انہوں نے اس عادت کے مضر اثرات نشوونما کے عدم توازن، دانتوں اور مسوڑھوں پر دباؤ اور بار، بار انگوٹھا چوسنے کی عادت پر رائے زنی کی۔ ان ماہرین کا خیال ہے کہ اصولاً انگوٹھا چوسنے کی عادت بچے کے چار سال کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ختم ہو جانی چاہیے تاکہ مستقل دانت نکلیں۔ اگر یہ عادت سات سال کی عمر تک رہتی ہے تو یہ بچے کی کسی دبی ہوئی نفسیاتی کیفیت کی پختگی کی نشاندہی کرتی ہے۔

از: ڈاکٹر نفیسہ نہال، لاہور

اپنی بہن شہلا کے نام خلوص دل سے

ہم تو مقروض ہیں جاناں
تیری ان گنت عنایتوں کے
بے لوث محبتوں کے
حد درجہ نوازشوں کے
سوچتے ہیں کہ یہ قرض اتاریں کیونکر
خالی جھولی ہے، تہی داماں ہیں
دل میں پھر بھی یہی ارماں ہیں
ہم بھی کچھ تیرے لیے کر جائیں
چکن پلاؤ، شامی کباب یا کوفتہ کری
تیری خاطر فریج میں بھر جائیں
یا پھر چاہتوں کے گلاب پیش کریں
دعاؤں میں گندھی موتیے کی لڑی
تیری دہلیز پہ کہیں رکھ جائیں

کاوش: ہما علی، اسلام آباد

غزل

یوں بے رخی سے ہم کو جلایا نہ کیجیے
ہم دوست ہیں آپ کے ایسا نہ کیجیے
رشتوں کا کال پڑ گیا خوں بھی ہوا سفید
اس دکھ کو اپنے دل سے لگایا نہ کیجیے
ہو رات اگر اس کی تو ہوتی ہے سحر بھی
شکوہ بھی اپنے لب پہ کبھی لایا نہ کیجیے
جو عزت و توقیر سے نہ مل سکے کبھی
گھر اس کے کبھی بھول کر جایا نہ کیجیے
ہونٹوں پہ ہنسی روح میں آنسو بھی ہوں مگر
یہ راز کسی کو بھی بتایا نہ کیجیے
مانا بڑا غرور ہے دولت پہ آپ کو
پر دل کسی غریب کا دکھایا نہ کیجیے
دل تو خدا کا گھر ہے یہاں بغض کا کیا کام
دیوار نفرتوں کی بنایا نہ کیجیے
نظروں سے جو گر جائے وہ اٹھتا نہیں کبھی
بے وجہ اس کو دل سے لگایا نہ کیجیے
اوقات کیا ہے تیری غزل اس جہان میں
سر کو اٹھا کے رب کو منایا نہ کیجیے

کلام: سلمیٰ غزل، کراچی

☆☆☆

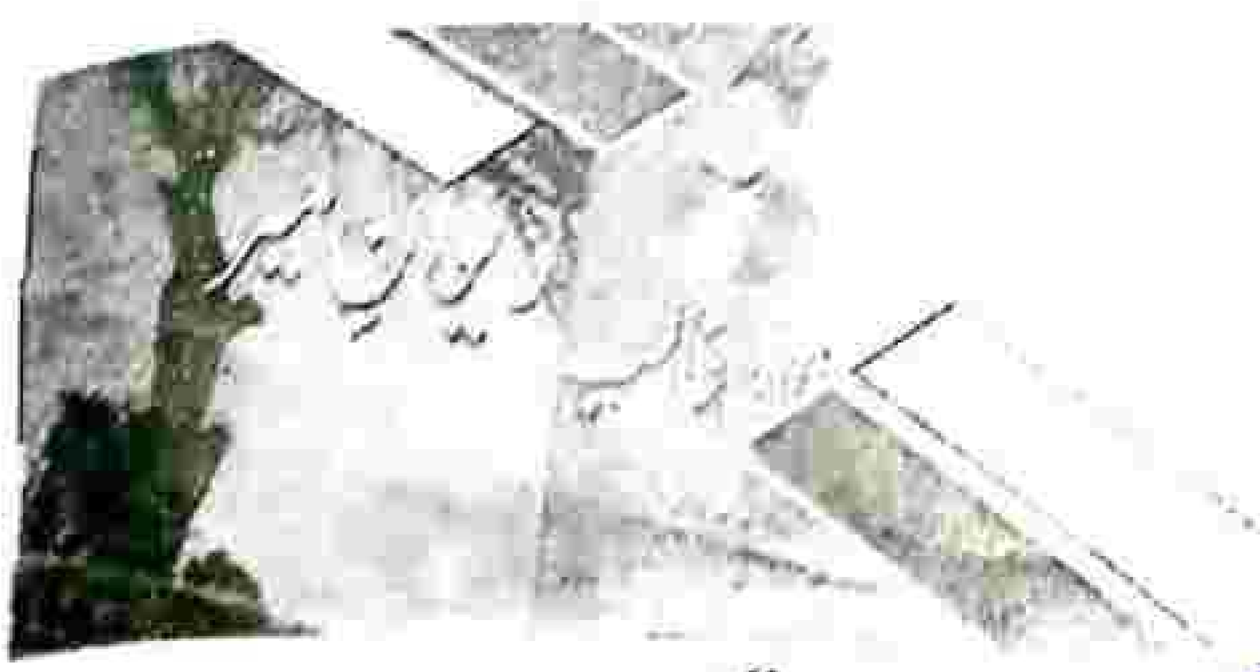

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ساجدہ پروین......فیصل آباد
راہزنوں سے تو بھاگ نکلا تھا
اب مجھے رہبروں نے گھیرا ہے

☆نسرین اختر نینا......راولپنڈی
دن گیا رات کٹی صبح ہوئی شام آئی
اسی امید میں اب وعدہ وفا ہوتا ہے
جاں نثاری بھی محبت میں بڑی بات نہیں
جان جاتی ہے تو اِک فرض ادا ہوتا ہے

☆ناہید نعیم......ملتان
امن و سکوں کی بھیک زمانہ نہ دے سکا
ہر در سے لوٹ آیا ہوں کاسہ لیے ہوئے

☆ثوبیہ ظہور......ضلع اٹک
تجھ سے ملے بچھڑ گئے، تجھ سے بچھڑ کے مل گئے
ایسی بھی قربتیں رہیں، ایسے بھی فاصلے رہے
تو بھی نہ مل سکا ہمیں، عمر بھی رائگاں گئی
تجھ سے تو خیر عشق تھا خود سے بڑے گلے رہے

☆ارم کمال......فیصل آباد
اسی کو کہتے ہیں مردِ منزل جو راہِ پُرخار میں بھی خوش ہو
وہ جانتا ہے کہ شادکامی انہی نشیب و فراز میں ہے

☆نیلوفر خان......بہارہ کہو
میری نگاہِ شوق سے آپ کو گر حجاب ہے
میرے خیال میں بھی اب آپ کبھی نہ آئیے
ان کی اگر ہے جستجو ان کی اگر ہے آرزو
قیدِ تعینات سے آگے قدم بڑھائیے

☆ثمینہ کوکب......جہلم
یہ الگ بات کہ خاموش کھڑے رہتے ہیں
پھر بھی جو لوگ بڑے ہیں، بڑے رہتے ہیں
ایسے درویشوں سے ملتا ہے ہمارا شجرہ
جن کے قدموں میں کئی تاج پڑے رہتے ہیں

☆نگینہ ضیا بنگش......کراچی
دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا دل نے تجھے یاد کیا

☆نائمہ شاہد......یو اے ای
ہم بھی وفا کریں گے جب تک ہے دم میں دم
وہ بھی جفا سے باز نہ آئے خدا کرے

☆مسز حرا جاوید......فیصل آباد
بن کر میرا وہ دوست اڑاتا رہا مذاق
ناصر وہ ایک شخص نہ لگتا تھا اس طرح کا

☆عرشیہ جنید......کراچی
بغیر مطلب کے دلاسے بھی نہیں ملتے
یہاں لوگ دل میں بھی دماغ لیے پھرتے ہیں

☆نازنین آفریدی......پشاور
تو دل پہ بوجھ لے کے ملاقات کو نہ آ
ملنا ہے اس طرح تو بچھڑنا قبول ہے
لفظوں کی آبرو کو گنواؤ نہ یوں عدیم
جو مانتا نہیں اسے کہنا فضول ہے

☆بشریٰ نور......اسلام آباد
یتیمی ساتھ لاتی ہے زمانے بھر کے سارے دکھ
سنا ہے باپ زندہ ہو تو کانٹا بھی نہیں چبھتا

☆عنبر وسیم......گوجرانوالہ
اِک چراغ اور اِک دعا کا جب سے پل، پل ساتھ رہا ہے
دھوپ میں سایہ حبس میں پُروا، پیاس میں بادل ساتھ رہا ہے

☆نگہت غفار......کراچی
قہقہے سنگِ ملامت کی طرح برسے ہیں
ہم تری بزم سے اٹھے بڑے اعزاز کے ساتھ
تو نے اِک بار پکارا تھا سرِ راہ گزر
رک گیا سارا زمانہ تری آواز کے ساتھ

Digest Novels Lovers Group

☆ ناہید......ملتان

میں زخم بھی کھاتا جاتا ہوں قاتل سے بھی کہتا جاتا ہوں
توہین ہے دست و بازو کی وہ وار کہ جو بھرپور نہیں

☆ ماریہ......میر پور خاص

غم تو ہونٹوں پہ ہنسی بن کے بھی رہ سکتا ہے
کیا ضروری ہے اسے دیدۂ تر میں رکھنا

☆ شگفتہ ناصر......فیصل آباد

ہم کو ظاہر بھی تو ہونا تھا سو روپوش ہوئے
کہیں رکنا بھی تھا واجب کہیں جانے کے لیے
سو بہت دیر تلک اس سے رہی گفت و شنید
کچھ نہ سننے کے لیے تھا نہ سنانے کے لیے

☆ اسما شاہد......لاہور

ہو آج کی تصنیف میں اِک تذکرۂ وصل
کل ہوں گے جدائی کے کسی باب میں ہم تم

☆ سعدیہ سیٹھی......یوکے

مصروفیت بہت تھی وصال و فراق میں
میں دل کو اطمینان سے فرصت میں لے گیا
آئی تھی ذہن میں جو کہانی عجیب تھی
آغاز اختتام کی دہشت میں لے گیا

☆ آسیہ عامر......کراچی

پھر بھی رہتی ہے بہت دست شناسوں کی تلاش
جانتا ہوں کہ لکیروں میں لکھا ہے کچھ اور

☆ رعنا مشتاق......سرگودھا

ایک مدت سے مرے خط نہیں ملتے اس کو
ہر لفافے پہ میں اپنا ہی پتا لکھتا ہوں

☆ مونا اشرف......بورے والا

ڈسا ہوا تھا تیری دوستی کے سانپوں کا
خود اپنے سائے کی حرکت سے ڈر گیا کوئی
بہت سکون دیا تھا مجھے اندھیروں نے
چراغ کیوں میرے کتبے پر دھر گیا کوئی

☆ غزالہ نصیر......یو ایس اے

کیجیے نہ کیونکہ اس کا تصور بھی خوب ہے
کر لیے بھی کیا کہ ان دنوں فرصت بھی بہت ہے

☆ شاہینہ مسعود......کمالیہ

یادوں کے حاشیے بھی بہت اہم ہیں محسن
دیمک لگی کتاب کو آہستہ کھولیے

☆ ثوبیہ احمد......کراچی

مانگنے کے لیے لازم تھا کہ کنگال بھی ہوں
کچھ بچانا بھی ضروری تھا گنوانے کے لیے

☆ ساجدہ ظفر......کمالیہ

پیٹ بھر دیتا ہے حاکم میرا تقدیروں سے
اس کی اس طفل تسلی پہ تو رنجور ہوں میں

☆ بیگم ظفر......ٹوبہ ٹیک سنگھ

نہ کھول میرے مکاں کے اداس دروازے
ہوا کا شور میری الجھنیں بڑھا دے گا
میں خوب واقف ہوں اس کی فطرت سے فراز
وہ دے گا تو اتنا کہ بس رُلا دے گا

☆ کنزا اسعد......بورے والا

مجھے حیرت ہے میرے پاس کچھ بھی نہیں بچتا
میں اپنی ذات سے جب بھی تمہیں تفریق کرتا ہوں

☆ ریحانہ سعدیہ ڈوگر......کمالیہ

ادب نے دل کے تقاضے اٹھائے ہیں کیا کیا
ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا
پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے
اس زمیں میں دریا سمائے ہیں کیا کیا

☆ سعدیہ......کمالیہ

یہ اشارہ ہے آفاتِ ناگہانی کا
کسی جگہ سے پرندوں کا کوچ کر جانا

☆ فہمیدہ جاوید......ملتان

گرمی کی دوپہروں میں تیرا خیال ایسا ہے
جیسے ٹھنڈی چھاؤں ہو یا کوئی بادِ نسیم آ جائے

☆ حمنیٰ طلحہ......فیصل آباد

بڑی باتوں کو خاطر میں نہ لانا اس کی عادت ہے
ذرا سی بات پہ طوفان اٹھانا اس کی عادت ہے
محبت میں وہ سنجیدہ ہے کتنا دیکھتے رہنا
محبت ہر کسی سے یوں جتانا اس کی عادت ہے

خوش ذائقہ

شگفتہ یاسمین۔

آم کی سورن چٹنی

اشیا: کچے آم (کیری) ڈھائی کلو۔ چینی، ڈیڑھ کلو۔ چھوہارے، آٹھ سے دس عدد۔ کشمش، آدھا پاؤ۔ کلونجی، آدھی چھٹانک۔ ادرک ... ایک چھٹانک، ثابت سرخ مرچ، ایک چھٹانک۔ لہسن، ایک گٹھی۔ سرکہ، ایک بوتل۔ پودینہ، آدھی گٹھی۔

ترکیب: آموں کو دھو کر چھیل لیں اور باریک، باریک کاٹ لیں اور ایک پین میں ڈال دیں۔ اسی پین میں لہسن، ادرک اور چھوہاروں کو کاٹ کر ڈالیں۔ ساتھ ہی تمام اشیا بھی ڈال دیں۔ اب سرکہ شامل کر کے چمچ سے خوب مکس کریں اور دھیمی آنچ پر پکائیں۔ جب قوام گاڑھا ہوجائے تو آنچ بند کردیں اور چٹنی کو ٹھنڈا ہونے پر صاف بوتلوں میں بھر کر رکھ لیں مختلف سالن وغیرہ کے ساتھ بہت مزہ دے گی۔ قوام کو اس طرح چیک کریں کہ جب اسے انگلیوں میں اٹھائیں تو وہ چپکے اور ایک تار بنائے۔

ٹماٹر کی اسپیشل چٹنی

اشیا: ٹماٹر، آدھا کلو۔ چینی، ایک پاؤ۔ کشمش، آدھا پاؤ۔ سرکہ آدھا پاؤ۔ پانی، ایک پاؤ۔ سبز مرچ، دو عدد۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: ٹماٹروں کو دھو کر اچھی طرح کاٹ لیں پھر ایک پین میں پاؤ بھر پانی ڈال کر ٹماٹر ڈال دیں اور چولہے پر ابلنے کو رکھ دیں۔ جب یہ کافی ابل جائیں تو انہیں باریک کپڑے سے چھان لیں اور چھنے ہوئے رس میں سرکہ، نمک، مرچ اور چینی پیس کر ملالیں۔ اس رس والی دیگچی کو چولہے پر چڑھادیں اور اتنی دیر پکائیں کہ رس گاڑھا ہوجائے۔ اب اس میں کشمش ڈال دیں اور تھوڑا دم دے کر دیگچی چولہے سے اتارلیں۔ نہایت لذیز چٹنی تیار ہے جسے بچے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

ہمیشہ یاد رکھیں امی کی ریسیپی کیونکہ یہی ہے راز ہوم شیف بننے کا۔

بیف بروتہ کو تگی (جرمن ڈش)

اشیا: چاول، ایک پاؤ۔ پھول گوبھی، ایک عدد۔ کھیرا، تین سے چار قاشیں۔ درمیانی پیاز، ایک عدد۔ گوشت کے پارچے، ایک پاؤ۔ سویا ساس، دو کھانے کے چمچ۔ چینی، ایک چائے کا چمچ۔ سرخ مرچوں کی چٹنی، حسبِ ضرورت۔ گھی یا آئل، چار کھانے کے چمچ۔ گوشت کی یخنی، آدھا کپ۔ نمک اور کالی مرچ، حسبِ ضرورت۔ ادرک، ایک انچ کا ٹکڑا۔

ترکیب: چاولوں کو دھو کر ابال لیں اتنا کہ ایک کنی رہ جائے۔ پھول گوبھی کی ایک، ایک کلی توڑیں اور کھیرے کی تین قاشیں بنالیں۔ ہر قاش کے چار ٹکڑے کرلیں پیاز کو باریک کاٹیں۔ گوشت کے پارچے سویا ساس، چینی، لال مرچوں کی چٹنی اور تیل کے ہمراہ رکھ دیں تاکہ مسالا گوشت میں رچ بس جائے۔ گائے کی یخنی چاولوں میں شامل کر کے جوش دلائیں۔ نمک اور کالی مرچ کے ساتھ پھول گوبھی ڈال کر دس منٹ پکائیں اب کھیرا شامل کرلیں۔ اسی دوران تیل میں ادرک، پیاز گرم کریں اور چاولوں میں ڈال دیں اور گوشت اور کالی مرچ ملادیں تیز آنچ پر بیس منٹ پکائیں اور اتارلیں۔

از: اُمّ حنظلہ، گوادر بلوچستان

کانسومی (چین کی ڈش)

اشیا: بکرے کا گوشت، آدھا کلو۔ پسا ہوا لہسن، ایک گٹھی۔ آئل، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، ایک چائے کا چمچ۔ کالی مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ دار چینی، ایک ٹکڑا۔ پانی، دو کپ۔ اجوائن، حسبِ پسند۔

ترکیب: گوشت اور پانی ساس پین میں ڈال کر تیز آنچ پر جوش دیں۔ جب پانی آدھا رہ جائے تو اتارلیں۔ یخنی سے بوٹیاں نکال لیں۔ یخنی کو کسی پیالے میں ڈال

Digital library.com

دیں۔ فرائی پین میں آئل گرم کریں۔ لہسن، دارچینی، اجوائن اس میں ڈال کر فرائی کریں۔ لہسن براؤن ہوجائے تو پین کو آگ سے اتارلیں۔ یخنی اس میں ڈال دیں اب لہسن اور آئل وغیرہ اس میں ڈالیں۔ ایک جوش دیں۔ سوپ تیار ہے۔ (چینی اس سوپ کو کانسومی کہتے ہیں۔ یہ سوپ تمام ممالک میں بڑے شوق سے پیا جاتا ہے۔

از: عائشہ، ملتان

بریڈ پڈنگ (برطانیہ کی ڈش)

اشیا: دودھ، ایک کلو۔ انڈے، چار عدد۔ توس، چار عدد۔ چینی، حسب پسند۔ کیوڑا ونیلا ایسنس چند قطرے (خوشبو کے لیے)

ترکیب: انڈوں کی سفیدی اور زردی الگ، الگ کرکے بہت اچھی طرح پھینٹیں۔ دودھ کو تیز گرم کریں اور اس میں توس کو تکون کاٹ کر بھگودیں۔ جب دیکھیں کہ توس اچھی طرح بھیگ گئے ہیں تو ان میں چینی کی آمیزش کردیں اور ساتھ ہی انڈے کے آمیزے کو اس میں ملادیں۔ ان ساری اشیا کو کسی ایسے برتن میں ڈالیں جس کا ڈھکنا بالکل برابر ہو کہیں سے ڈھیلا نہ ہو۔ پھر اس برتن کو چولہے کی دھیمی آنچ پر رکھ کر اس کے ڈھکنے پر دہکتے کوئلے رکھ دیں۔ پندرہ بیس منٹ بعد کوئلے ہٹاکر ڈھکنا کھولیں اور دیکھیں کہ پڈنگ پر سرخی آنے لگی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پڈنگ درست طریقے سے تیار ہورہی ہے۔ اگر پڈنگ پر سرخی نہ آئی تو ڈھکنے کو دوبارہ دباکر بند کردیں اور اس پر دوبارہ دہکتے کوئلے رکھ دیں۔ آنچ ہمیشہ دھیمی رکھیں تاکہ جلنے کا امکان نہ ہو۔ کچھ دیر بعد جب دیکھیں کہ اس پر سرخی آرہی ہے تو چولہے سے اتارلیں۔

اس پڈنگ کو اوون میں تیار کیا جائے تو بہت جلد تیار ہوجائے گی۔ انڈے وغیرہ پھینٹنے سے قبل اوون 250 تک کھول دیں تاکہ گرم ہوجائے۔ پھر اس کے اندر پڈنگ کا برتن رکھ لیں۔ اگر اوون خوب گرم ہو تو پڈنگ کو تیار ہونے میں صرف دس منٹ لگتے ہیں۔

از: فضہ بتول، بہارہ کہو

زرشک

زرشک پلو با مرغ ایران کی روایتی اور مقبول ترین ڈشز میں سے ایک ہے۔

''زرشک'' کہتے ہیں خشک سرخ بیر، چھوٹی کشمش کو (Barberries) ''پلو'' یعنی چاول، اور ''مرغ'' یعنی مرغی۔

یہ ڈش عموماً خاص مواقع جیسے مہمانوں کی آمد، شادیوں یا تہواروں پر بنائی جاتی ہے۔ اس کی خاص بات زرشک کی کھٹاس، مرغی کا مسالے دار ذائقہ اور چاولوں کی نرمی ہے جو اسے ایک شاہی پکوان بناتے ہیں۔

اشیا: چاول کے لیے: باسمتی چاول۔ دو کپ۔ زرشک (Barberries)۔ آدھا کپ۔ چینی، ایک کھانے کا چمچ۔ زعفران، آدھا چائے کا چمچ۔ (پانی میں گھولا ہوا) تیل، چار کھانے کے چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔

مرغی کے لیے: مرغی (چکن پیسز)، آدھا کلو۔ پیاز، دو عدد (باریک کٹی ہوئی)۔ لہسن، دو جوئے (باریک کٹے ہوئے)۔ ٹماٹر، دو عدد (پسے ہوئے)۔ ٹماٹر پیوری، دو کھانے کے چمچ۔ ہلدی، آدھا چائے کا چمچ۔ لال مرچ پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ کالی مرچ، آدھا چائے کا چمچ۔ تیل، چار کھانے کے چمچ۔ پانی، ایک کپ۔

ترکیب: چاول: چاولوں کو دھوکر 30 منٹ کے لیے بھگودیں۔ ایک دیگچی میں پانی گرم کریں، نمک ڈالیں اور چاولوں کو 80% پکنے تک ابال لیں پھر چھان لیں۔ ایک پین میں زرشک، چینی اور تھوڑا سا تیل ڈال کر دو منٹ ہلکی آنچ پر فرائی کریں (زرشک جلنے نہیں)۔ ایک الگ پتیلی میں تھوڑا تیل ڈال کر تھوڑے سے چاول پھر زرشک اور زعفران کی تہ دیں، یہ تہ در تہ ڈالیں۔ ڈھک کر دم پر رکھ دیں۔

مرغی: ایک دیگچی میں تیل گرم کریں اور پیاز سنہری ہونے تک بھونیں۔ لہسن، ٹماٹر، ٹماٹر پیوری، ہلدی، لال مرچ، نمک اور کالی مرچ شامل کریں اور اچھی طرح بھونیں۔ اب مرغی شامل کریں اور مسالے میں اچھی طرح فرائی کریں۔ ایک کپ پانی شامل کریں، ڈھک کر درمیانی آنچ پر 20-25 منٹ پکائیں تاکہ مرغی گل جائے اور گریوی بن جائے۔ چاول کو پلیٹ میں نکالیں، اوپر سے زرشک اور زعفران والے چاول کی تہ دیں، اور سائڈ میں مرغی رکھیں۔ ایرانی لوگ اس کے ساتھ دہی یا سلاد بھی پیش کرتے ہیں۔

از: فہمیدہ جاوید، ملتان

☆☆☆

بزمِ پاکیزہ

پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ کنز اسعد.....بورے والا

سوال: ایٹمی جنگ میں فتح کس کی ہوتی ہے؟

جواب: ایٹم کے نیوکلیس کی۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ فہمیدہ جاوید.....ملتان

س: شدید گرمی میں اُن کا باؤلا دماغ ٹھنڈا کرنے کا نسخہ بتائیں؟

جواب: برف کی ٹوپی بنا کر پہنا دو۔

☆ زرینہ خانم.....مظفر گڑھ

سوال: کہاوت ہے مرد کو اپنا بچہ اور دوسرے کی بیوی خوب صورت لگتی ہے، کیا یہ سچ ہے؟

جواب: دوسرے کی بیوی سے پالا جو نہیں پڑا ہوتا۔

سوال: بغل میں چھری منہ میں رام، رام چھری کافی نہیں ہے رام، رام ضرور کرنا ہے؟

جواب: چھری کو تو چھپانا ہے۔

سوال: عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا کیا یہ سچ ہے پہلے باپ کا گھر پھر سسر اور خاوند کا گھر پھر بیٹے کا گھر؟

جواب: ہر گھر ہی عورت کا ہوتا ہے۔ بات سمجھنے کی ہے۔

☆ سحرا جاوید.....فیصل آباد

سوال: میاں بیوی زندگی میں لازم وملزوم ہوتے ہیں بعد میں ظالم ومظلوم کیسے بن جاتے ہیں؟

جواب: مزے کی بات ہے دونوں اپنے آپ کو مظلوم ہی سمجھتے ہیں تو پھر ظالم کون......

سوال: کون اونچائی زیادہ حاصل کرتا ہے باز یا دھوکے باز؟

جواب: جس کو بھی کھلا آسمان مل جائے۔

☆ حسنیٰ طلحہ.....فیصل آباد

سوال: کہتے ہیں فتح خرگوش کے پاؤں میں، مرد کے دماغ میں اور عورت کی زبان میں ہوتی ہے اگر عورت گونگی ہو تو کیا کرے؟

جواب.....پھر تو فتح اشاروں میں ہی ہوگی ناں۔

سوال: اپنی غلطی پر ہنسنے سے زندگی پر کیا اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: مثبت اثرات.....وہ بھی سب کی زندگیوں پر۔

☆ ثمینہ کوکب.....جہلم

سوال: بس میں بیٹھ کر اکثر لوگ بے حس کیوں ہو جاتے ہیں؟

جواب: ہاتھ پاؤں بلکہ پورا جسم ہی سکیڑنا جو پڑتا ہے۔

☆ تسنیم کوثر.....کراچی

سوال: دل تو انمول ہے اس کی کوئی قیمت نہیں لیکن پھر بھی میٹھے لہجے کے دو بول دل کو خرید لیتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: یہی تو قیمت ہے اصل۔

سوال: وہ بھی کیا دن تھے جب ہم بہن، بھائی صبح عید کی خوشی میں ساری رات سو نہیں سکتے تھے مگر اب پتا نہیں کیوں لگتا ہے نہ وہ عیدیں ہیں نہ دل خوش ہوتا ہے کیوں؟

جواب: بچوں کی عیدیں تھیں اب بھی ویسی ہی

digest library.com

ہیں ہم بڑے ہوگئے ہیں تو محسوس زیادہ کرتے ہیں۔

سوال ﷺ اکثر نوٹ کیا ہے کچھ لوگ منہ پر بولنے کی جسارت تو نہیں کرتے ہیں مگر ماشاءاللہ status لگا کر بھرپور طریقے سے طعنہ بازی کرتے ہیں، آپ نے محسوس کیا ہے؟

جواب ﷺ ہماری نہ تو داڑھی ہے نہ ہی تنکا...... اسٹیٹس لگانے دو انہیں۔

سوال ﷺ آج کل جو حالات چل رہے ہیں جیسے مہنگائی کا طوفان، مسلسل زلزلوں کا خوف عجیب و غریب قسم کی فکریں بتائیے اچھا ساحل کہ دل کو سکون ملے؟

جواب ﷺ یادِ الٰہی اور بس۔

☆ نازنین آفریدی...... پشاور

سوال ﷺ رات کو نیند بڑی مشکل سے آتی ہے کہیں مجھے عشق تو نہیں ہوگیا یا دوپہر کو سونے کا کمال ہے؟

جواب ﷺ عشق کا ڈھنڈورا نہ پیٹو دوپہر کی نیند کو ہی الزام دے ڈالو۔

☆ شاہینہ مسعود...... کمالیہ

سوال ﷺ وہ تو بکرا ہے عید پر قربان ہوجائے گا
مسئلہ پیسے کا ہے، پیسہ کہاں سے آئے گا؟
شعر کا جواب شعر میں دیں

جواب ﷺ پیسہ ہوگا تو تبھی بکرا آئے گا
ورنہ پھر ہمسائے سے گوشت تو آ ہی جائے گا

سوال ﷺ جس کاپی کی ذمے داری تمام مضامین کے مسائل حل کرنا ہو وہ رف کاپی بن جاتی ہے تو کیا اس اصول کا اطلاق میاں جانی پر بھی ہوتا ہے؟

جواب ﷺ ہائے بیچارہ رف اینڈ ٹف۔

☆ ساجدہ ظفر...... کمالیہ

سوال ﷺ حاجی بننے کے لیے پندرہ لاکھ خرچ آتا ہے اور انسان بننے پر ایک روپیہ خرچ نہیں آتا۔ مگر ہم نے حاجی ہی بننا ہے کیوں؟

جواب ﷺ کیا مطلب اپنے نام کی تختی پر حاجی نہ لکھوائیں کیا کیسی باتیں کرتی ہو۔

سوال ﷺ اون کے سوئیٹر کا نمونہ غلط ہوجائے تو اسے اُدھیڑ کر پھر بُن لیا جاتا۔ زندگی کا نمونہ غلط ہوجائے تو کیا کرنا چاہیے؟

جواب ﷺ تو سامنے والے کو اُدھیڑ دو۔

☆ ریحانہ سعدیہ ڈوگر...... کمالیہ

سوال ﷺ میں جب بھی اپنے میاں سے قربانی کا بکرا لانے کی فرمائش کرتی ہوں تو وہ بکرے جیسی بھیں بھیں کی آوازیں نکالنی شروع کردیتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب ﷺ میاں تمہارے...... وجہ بھی تمہیں ہی معلوم ہوگی...... اب شرمانا گھبرانا نہیں۔

سوال ﷺ کہتے ہیں میٹھا آم، اچھی پھپو، خاموش شوہر اور لال تربوز قسمت والوں کو ملتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے اس میں کتنا سچ ہے؟

جواب ﷺ دوسو فیصد...... پر بیچارے شوہر کو خاموش مت کرواؤ۔ پھر تمہاری حمایت کون کرے گا۔

☆ مونا اشرف...... بورے والا

سوال ﷺ عید پر سالم روسٹ بکرا کھانا چاہتی ہوں۔ ہضم کرنے کا طریقہ بتادیں؟

جواب ﷺ ہمارا تعلق جنات کے خاندان سے ہرگز نہیں ہے۔

سوال ﷺ اگر گرمی کا یہی حال رہا تو خواتین کی شکلیں شناختی کارڈ سے مل جانے کا ڈر ہے کیا کریں خواتین بیچاری......؟

جواب ﷺ صبر کریں اور گھر ہی میں رہیں۔

☆ کنزا سعد...... بورے والا

سوال ﷺ بیروزگاری سے تنگ آکر جو شخص پیر بنتا ہے لوگ اس کے پاس روزگار کے لیے تعویذ لینے پہنچ جاتے ہیں، یہ کیسا معاملہ ہے؟

جواب ﷺ عقل کے اندھوں کا معاملہ ہے بھئی تمہارا اس میں کیا کام......

☆ فہمیدہ جاوید...... ملتان

س: شادی سے پہلے میرے محبوب کا آیا ہے محبت نامہ شادی کے بعد؟

جواب ﷺ تعزیت نامہ۔

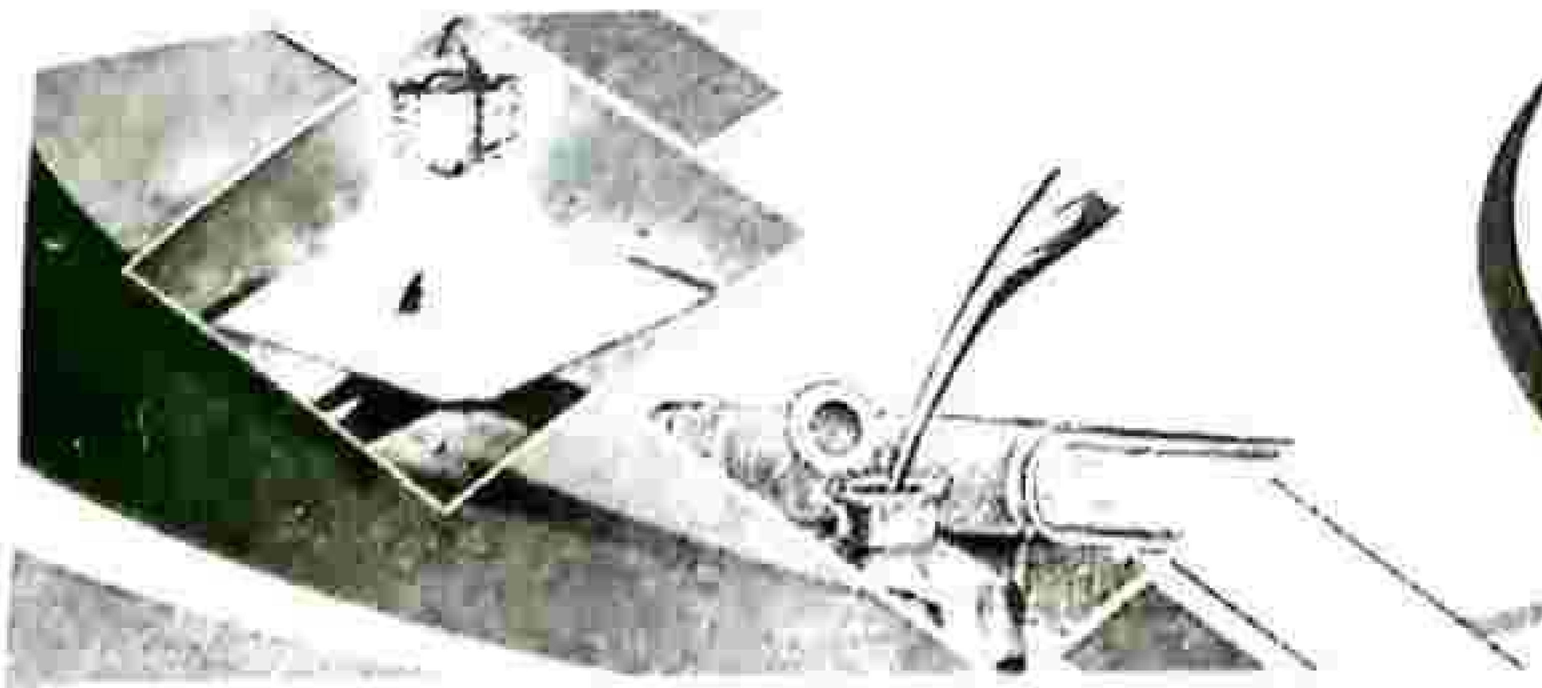

روحانی مشورے

ادارہ

نظرِ بد سے بچنے کی دعا

۱۔ نظر بد سے بچنے کے لیے تین مرتبہ مندرجہ ذیل آیت کی تلاوت کر کے دم کرے ان شاء اللہ نظرِ بد سے محفوظ رہے گا۔

مَاشَاءَ اللّٰهُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ......

وسعتِ رزق

۲۔ وسعت رزق کے لیے ۴۵۹ مرتبہ بعد نماز فجر تلاوت کرے۔ "یَا عَلِیُّ، یَا سَلَامُ، یَا مُنْعِمُ... یَا حَیُّ، یَا قَیُّوْمُ"

دردو الم سے نجات

۳۔ ہر درد و الم سے نجات پانے کے لیے ہر نماز فجر کے بعد تین مرتبہ مندرجہ ذیل دعا کی تلاوت کرے۔ پریشانی سے نجات پائے گا۔

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْعٰلَمِيْنَ تَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ وَ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔"

۴۔ دشمن کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے۔

"سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ" نماز فجر کے بعد دس مرتبہ تلاوت کرے تلاوت سے پہلے بارہ مرتبہ اور آخر محمد وآل محمد علیہ السلام پر درود ضرور پڑھے۔

وسعت رزق

وسعت رزق کے لیے مندرجہ ذیل اسمائے گرامی باری تعالیٰ ۳۲۱ مرتبہ پڑھے۔ خاطر خواہ فائدہ ہوگا۔ ان میں سے کوئی بھی عمل اپنایا جاسکتا ہے۔ شرط ۳۲۱ مرتبہ پڑھنے کی ہے۔

۱۔ یَا اللّٰهُ۔ یَا عَلِیُّ۔ یَا حَیُّ۔ یَا اَبَدُ۔ یَا رَحِیْمُ

۲۔ یَا عَلِیُّ۔ یَا نُوْرُ۔ یَا وَلِیُّ۔ یَا وَدُوْدُ یَا وَاحِدُ۔ یَا اَبَدُ

۳۔ یَا عَلِیُّ۔ یَا قُدُّوْسُ۔ یَا عَزِیْزُ یَا وَالِیُّ یَا وَدُوْدُ۔ یَا حَیُّ

۴۔ یَا عَلِیُّ۔ یَا قَاسِمُ۔ یَا مُحْیِ۔

۵۔ یَا اللّٰهُ۔ یَا عَلِیُّ۔ یَا مُطَهِّرُ یَا حَیُّ۔ یَا هُوَ

کسی بھی فرض نماز کے بعد کوئی ایک عمل منتخب کریں۔

دعا کی قبولیت

اکثر خواتین و حضرات بارگاہِ الٰہی میں دعا قبول نہ ہونے کا شکوہ کرتے ہیں۔ اگر وہ ان سطور کو پڑھ کر دعا کریں تو شاید ان کا شکوہ دور ہو جائے۔

خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ کہ مجھ سے مانگو میں قبول کروں گا۔

دوسرا فرمان ہے اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ قبول کرتا ہوں میں دعا جب وہ مجھ سے مانگے۔

تیسرا ارشاد ہے۔ اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ کہ جب کوئی پریشان مجھ سے دعا مانگے قبول کرتا ہوں۔ ان آیات سے ثابت ہوا کہ اپنی ضروریات میں خدا سے دعا کرے ضرور قبول ہوگی لیکن جیسے ہر کام کے طریقے، انجام اور ترکیبیں ہیں ایسے ہی اس کے لیے

Digest Library.com

بھی شرطیں ہیں۔
۱۔کھانا ایسا کھائے جو ناجائز طریقے سے حاصل نہ کیا ہو۔
۲۔گڑگڑا کر نہایت عاجزی سے رو، رو کر اور چپکے، چپکے دعا مانگے۔آہستہ آواز سے اس کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے۔ادْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً مانگو اپنے رب سے گڑگڑا کر چپکے، چپکے۔
۳۔پاک وصاف ہو کر دعا مانگے۔
۴۔دونوں ہاتھ پھیلا کر بار، بار دعا کرے۔
۵۔حضور سردار دو جہاں محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور انبیائے پاک ،صحابہ، آئمہ، شہدا، اولیا اللہ کے وسیلے سے مانگے۔
۶۔درود شریف پڑھ کر، میلاد شریف، وعظ شریف،ان وقتوں میں دعا مانگے ضرور قبول ہوتی ہے۔
۱۔جمعہ کی رات،۲، جمعہ کے دن،۳۔جمعہ کی نماز کے وقت ۔۴۔آدھی رات۔۵۔ ہر نماز خشوع وخضوع سے پڑھنے کے بعد۔۶۔اذان اور اقامت کے درمیان میں۔۷۔قرآن شریف پڑھنے میں۔ ۸مسجد میں۔ ۹۔آب زم زم پینے کے بعد۔۱۰۔جس وقت فجر میں مرغ اذان دیتا ہے۔۱۱۔شب قدر۔۱۲۔عرفہ کے دن۔ ۱۳۔رمضان شریف میں۔

ان لوگوں کی دعا جلد قبول ہوتی ہے

۱۔جو شخص مظلوم اور نہایت پریشان ہو، خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان۔۲۔ماں، باپ کی اولاد کے واسطے۔ ۳۔نیک اولاد کی اپنے ماں، باپ کے واسطے۔۴۔سفر کرنے والے کی۔۵۔ روزے دار کی۔۶۔مسلمان کی مسلمان کے واسطے۔۷۔توبہ کرنے والے کی۔ ۸۔سونے والا آنکھ کھلتے ہی آواز سے دعا مانگے اور کلمہ شریف پڑھے۔

☆☆☆

موت کا وقت مقرر ہے

دوسری جنگ عظیم کے دوران ایک روسی سپاہی چھٹی پر گھر جارہا تھا۔ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو ایک فوجی ٹرک دیکھا جو لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ سمجھ گیا کہ گاؤں پر بمباری ہوئی ہے۔ٹرک لاشوں کو اجتماعی قبر میں دفن کرنے کے لیے قبرستان لے کر جارہا تھا۔سپاہی نے لاشوں پر نظر ڈالی تو اس کو ایک عورت کے پاؤں میں ایک جوتا نظر آیا جو اس جوتے کی طرح تھا جو اس نے اپنی بیوی کے لیے خریدا تھا۔ گھر جا کر دیکھا کہ گھر تباہ ہے۔ واپس بھاگ کر لاشوں کے پاس آیا اور اپنی بیوی کی لاش یہ کہہ کر لی کہ وہ اس کو اجتماعی قبر میں نہیں اکیلے دفن کرنا چاہتا ہے۔ جب لاش کو اٹھایا تو محسوس ہوا کہ اس کی سانسیں ابھی چل رہی ہیں۔فوراً اسے اسپتال پہنچایا اور وہ بچ گئی۔اس کے کئی سال بعد وہ امید سے ہوگئی اور اس کا ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ولادی میر پیوٹن رکھا گیا جو کہ روس کا موجودہ صدر ہے۔ اس واقعے کا سابق امریکی سیکرٹری خارجہ ہیلری کلنٹن نے اپنی کتاب ''مشکل انتخاب'' میں ذکر کیا۔''

از: نازنین آفریدی، پشاور

مخلصی

کچھ لوگوں کو ہماری مخلصی اس لیے بھی راس نہیں آتی ...کیونکہ وہ اپنے جیسے لوگوں میں ہی رہنا پسند کرتے ہیں انہیں کہاں مخلص لوگوں کی قدر ہوتی ہے وہ تو بس اپنا وقت اور دل بہلانے کے لیے مخلص لوگوں کے ساتھ اچھا ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور وقت آنے پر دل بھر جائے تو مخلص لوگوں کی مخلص محبت کو ٹھکرا کر اپنے جیسے لوگوں میں خوش رہتے ہیں۔

انتخاب: نگہت غفار، کراچی

حسن نکھار کے لیے

مہ جبیں

چہرے اور ہاتھوں کی حفاظت

☆ آج کل چہرے پر خشکی اور روکھے پن کی شکایات عام ہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ رات میں منہ اچھی طرح کسی بھی فیس واش سے دھوکر نرم کپڑے سے تھپک، تھپک کر خشک کریں اور زیتون کا تیل یا تل یا بادام کا تیل تھوڑا سا ہتھیلی پر ڈال کر اسے اپنے چہرے اور ہاتھ کا مساج کریں۔ کوشش کریں کہ انگلیوں کی موومنٹ ٹھوڑی سے لے کر کنپٹیوں کی جانب ہو مگر نرمی سے جیسے فیشل میں باقاعدہ مساج کیا جاتا ہے آپ گھر پر بھی کر سکتی ہیں۔

☆ پپیتا اور کیلا میش کر کے چہرے پر ماسک کی صورت لگا سکتی ہیں۔

☆ صبا ناز...... چکوال

میرے بالوں میں خشکی بھی ہے اور گرتے بھی ہیں پہلے کافی گھنے تھے اب پتلے ہوتے جا رہے ہیں۔ ان مسائل کا حل بتا دیں؟

جواب: آپ نے اپنی عمر نہیں لکھی اس کے علاوہ یہ بتائیں کہ آپ بہت زیادہ دماغی کام کرتی ہیں؟ بال گرنے کا جہاں تک تعلق ہے آپ ہر ہفتے زیتون کے تیل کی سر پر مالش کیجیے اور کافی دیر بعد نیم گرم پانی کے ساتھ کسی بھی شیمپو سے دھو لیں۔

دوسرا طریقہ آملے ریٹھے کا ہے۔ جنہیں رات میں تیز گرم پانی میں بھگو دیں اور صبح نتھار کر اس سے سر دھوئیں۔ اب تو یہ صاف کیے ہوئے بھی مل جاتے ہیں۔ پندرہ دن میں ایک مرتبہ بالوں کے گھنے ہونے کے حساب سے دہی اور ایک انڈا ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں پھر بالوں میں لگائیں اور گھنٹا بھر کے لیے چھوڑ دیں۔ بعد میں کسی بھی شیمپو سے نیم گرم پانی سے دھو لیں۔ ان شاء اللہ ضرور فرق پڑے گا۔

خشکی دور کرنے کی ایک اور ترکیب بھی ہے مگر ذرا احتیاط ضروری ہے بال دھونے کے بعد ایک ڈونگے پانی میں دو قطرے ڈیٹول ڈال کر بالوں میں ڈالیں کہ پانی جڑوں تک پہنچے اس کے لیے ضروری ہے کہ آنکھوں کی حفاظت کی جائے۔

☆ رابعہ اسلم وڑائچ...... رحیم یار خان

سوال: میرے چہرے پر پچھلے چار سال سے مسلسل دانے نکل رہے ہیں جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتے لاکھ دوائیاں استعمال کر لیں کوئی حل نہیں...... آپ کچھ علاج بتا دیں نیز میرے پیروں پر جوتوں کے نشان ہیں ختم نہیں ہونے پا رہے ویسے تو آپ کے بتائے ہوئے تمام ٹوٹکے بہت زبردست ہوتے ہیں۔

جواب: بی بی دانوں کے لیے عرض ہے کہ یہ کس قسم کے اور کس رنگ کے دانے ہیں اسی حساب سے علاج ہوگا۔ دن میں تین چار مرتبہ چہرہ دھوئیں۔ چکنی اور تلی ہوئی اشیا سے پرہیز کریں اور کسی اسکن اسپیشلسٹ سے ضرور رجوع کریں۔ اِدھر اُدھر سے سن کر نسخے استعمال مت کریں۔ پیر پر چپل یا جوتے کے نشانات کے لیے نیم گرم پانی میں ذرا سا شیمپو ڈال کر پاؤں رگڑیں۔ بعد ازاں خشک کر کے کوئی کولڈ کریم لگا لیں۔ پاؤں میں تنگ چپلیں پھنسائے نہ رکھیں۔ پانی کے کام اسفنج کی چپل پہن کر کریں۔ لیموں کے نچوڑے ہوئے ٹکڑے نشانات پر ملیں چہرے کی حفاظت کے ساتھ، ساتھ پیروں کا بھی خیال رکھیں۔

Digest Library.com

شوابے ہومیو کلینک

SCHWABE

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔(اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

جب برسات کا موسم آتا ہے!

برسات کا موسم بڑے انتظار کے بعد آتا ہے اور جب آتا ہے تو ہر بڑے چھوٹے کا چہرہ دمکنے لگتا ہے۔ جھولے لگنے لگتے ہیں، پکنک کے پروگرام بنتے ہیں مختلف پکوان بننے لگتے ہیں، جن میں گل گلے اندرسے کی گولیاں، جلیبی، سموسے، پکوڑیاں وغیرہ۔ کچھ لوگ تو برسات کے انتظار میں آم کھاتے نہیں کہ جب برسات ہوگی تو کھائیں گے۔ ادھر برسات کے ساتھ آم ناپید یا مہنگے ہوجاتے ہیں (شومئی قسمت)

اردو ادب سے جن لوگوں کو لگاؤ ہے ان کو معلوم ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے گھنگور گھٹا، برسات، برکھا رُت، ابرِ کرم پر کتنی نظمیں، غزلیں، اور مضامین وافسانے لکھے جن کو پڑھنے کے بعد اس موسم کے لطف کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جولائی اور اگست کے مہینے برسات کے مہینے کہلاتے ہیں۔ کیونکہ ان مہینوں میں برسات ہوا کرتی ہے۔ بارش کے دو بڑے اہم فائدے ہیں فصلوں کو پانی مل جاتا ہے دوسرا ڈیموں میں پانی بڑھ جاتا ہے جو سارا سال ہمارے استعمال میں آتا ہے اور اس سے بجلی بھی بناتے ہیں۔ یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ جب برسات کا یہ موسم آتا ہے تو ہماری کام چور انتظامیہ کی وجہ سے شہر او گاؤں جل تھل ہوجاتے ہیں ندیاں نالے اور گٹر ابل پڑتے ہیں سڑکیں بیٹھ جاتی ہیں۔ لوگ ڈوبتے ہیں، گاڑیاں ڈوبتی ہیں، گھر ڈوب جاتے ہیں۔ مالی نقصان کے ساتھ جانی نقصان بھی ہوتا ہے۔ صحت کے مسائل

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

اگست 2025ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ______________

پتا: ______________

____

الگ کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(1) پیٹ کے امراض دست، ہیضہ ٹائیفائیڈ پھیلتے ہیں۔

(2) جلد کے امراض خارش، داد وغیرہ میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ پانی جب کئی کئی دن کھڑا رہتا ہے یا گٹر کا پانی بہتا رہتا ہے اور کچرا اٹھتا نہیں ہے تو مچھر، مکھیوں کی بہتات ہوتی ہے اس سے ہیضہ، ملیریا، ڈینگی، چکن گونیا کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

باسی، گلی سڑی چیزیں اور صفائی کے فقدان کی وجہ سے بدہضمی، گیس، دست، متلی، قے جیسی بیماریاں پھیلتی ہیں۔

کیا احتیاط کریں؟

(1) صاف پانی کا متبادل انتظام رکھیں اور انڈر گراؤنڈ ٹینک کا ڈھکن اتنا اونچا رکھیں تاکہ باہر کا پانی اس تک نہ پہنچے۔

(2) 8 سے 10 گلاس پانی ہر موسم میں پییں چاہے پیاس لگے یا نہ لگے۔

(3) چونکہ بارش کی وجہ سے ہماری حرارت معدوم ہو جاتی ہے اس لیے کھانا یا کھانے کی کوئی چیز بار بار نہ کھائیں، جلد ہضم ہونے والی غذا لیں۔

(4) باہر کی چیزیں کھانے سے پرہیز کریں۔

(5) زیادہ پکی ہوئی اور باسی اشیا سے پرہیز کریں، سڑی گلی ہوئی اشیا تو کبھی بھی استعمال نہ کریں۔

(6) اگر چاہتے ہیں کہ ان بیماریوں سے جلد از جلد نجات مل جائے تو ماہر و مستند ہومیو پیتھک معالج سے علاج کرائیں۔

پتے کی پتھری

اقلیم......راولپنڈی

عرض یہ ہے کہ مجھے تقریباً 1 سال سے گیس کا مسئلہ ہے۔ پیٹ پھول جاتا ہے اور گیس خارج ہوتی ہے۔ کوئی بھاری کھانا کھا لوں تو پیٹ میں شدید درد ہوتا ہے۔ میں نے الٹرا ساؤنڈ کرایا تو ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ پتے میں پتھری ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہومیو پیتھی میں پتے کی پتھری کا علاج ہے۔ پلیز آپ میری مدد کریں۔ مجھے کوئی اچھی دوا تجویز کریں۔

جواب: کھانا اچھی طرح چبا کر کھائیں اور کھانے کے ساتھ پانی، شربت یا کولڈ ڈرنک کا استعمال نہ کریں۔ اگر دانتوں کا مسئلہ ہے تو روٹی کو سالن میں ڈبو کر یا اگر بُھنا سالن ہے تو اس میں پانی یا دہی شامل کر کے روٹی کو بھگو کر نرم کر لیں۔ پھر اس کو میش کر کے کھائیں، گیس نہیں ہوگی۔ الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ بھیجنی چاہیے تھی تاکہ پتا چلتا کہ پتھری ہے کتنی بڑی۔ آئندہ 3 ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں پھر الٹرا ساؤنڈ کرا کر دوبارہ اپنا حال بتائیں۔ Lycopodium-30، CarboVeg30 کے 5-5 قطرے جبکہ Chelidonium-Ø کے 10 قطرے آدھے گلاس پانی ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پییں۔

پیٹ بڑھ رہا ہے

ذرین......حیدرآباد

میرا پیٹ بڑھ رہا ہے اس کے لیے... کوئی دوا تجویز کریں۔ میری عمر 50 سال ہے۔

جواب: آپ کے پیٹ بڑھنے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ وزن، قد بھی آپ نے نہیں لکھا۔ اپنے بارے بھی تفصیل سے لکھیں۔

ایام کی زیادتی

رمشا......ٹنڈو الہ یار

یہ مسئلہ میری امی کا ہے۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ چھوٹے بھائی کی پیدائش چودہ سال پہلے بڑے آپریشن سے ہوئی تھی تب سے ان کا ماہواری کا نظام خراب ہے۔ 4 سال پہلے چیک اپ کے بعد پتا چلا کہ یوٹیرس میں رسولی ہے۔ کچھ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ رسولی نہیں ہے۔ لیکن ان کے پیریڈ کا دورانیہ ڈیڑھ ڈیڑھ ماہ تک چلتا ہے تب

digest library.com

From Nature. For Health.

کچھ دوائیں لیں، تو دو سال گزر گئے مگر اب چھ ماہ سے پھر وہی حال ہے۔ اب دوا لینے سے بھی فرق نہیں پڑتا جس دن دوائی کا ناغہ ہو جائے اسی دن طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ ان کا بلڈ پریشر کبھی بہت لو تو کبھی بہت ہائی ہو جاتا ہے اور ان کا معدہ جلتا رہتا ہے۔

جواب: تازہ الٹراساؤنڈ کرا کر رپورٹ بھیجیں U/S (Pelvis) پھر صحیح پتا چلے گا بہرحال اس وقت تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Magnesium phos Pentarkan Ptk 60 ,Bismutum Pentarkan Ptk 16 کی ایک، ایک گولی سادہ پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ لیں۔ مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں، صبح کی تازہ ہوا اور دھوپ لیں، متوازن غذا لیں۔

نسوانی خوبصورتی

صائمہ......اسلام آباد

میری عمر 20 سال ہے لیکن لگتی نہیں ہوں۔ میری ڈائٹ بھی اچھی ہے بس جسم کو نہیں لگتی۔ نسوانی کمزوری بہت ہے۔ مطلب ہے جس طرح اس عمر کی لڑکیوں کے بریسٹ ہوتے ہیں ویسے نہیں ہیں۔ آپ پلیز کوئی دوا تجویز کریں۔ ہر مہینے پاکیزہ شوق سے پڑھتی ہوں۔

جواب: عمر لکھ دی قد لکھ دیا وزن نہیں لکھا کہ کتنا ہے؟ ماہواری کے متعلق بھی نہیں لکھا کہ اس کی کیا حالت ہے؟ ویسے جتنا آپ نے بیان کیا ہے اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جن میں ہارمونز کی خرابی، ڈپریشن، گھریلو ماحول، خوف یا بہت زیادہ ذمہ داریاں یا کوئی بیماری جسمانی تو نہیں۔ تفصیلات تک پہنچنے کے دوران آپ متوازن غذا لیں، اچھا ماحول بنانے کی کوشش کریں، صبح سویرے ورزش کریں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Iodium-30 ،Natr. mur-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ ایک ماہ بعد تفصیل سے کیفیات لکھیں۔

بالوں کا گرنا اور چہرے پر دانے

قدسیہ......میر پور

عرض یہ ہے کہ میں نے پاکیزہ میں آپ کا کالم پڑھا تو مجھے اپنا مسئلہ پیش کرنے کا خیال آیا۔ ایک سال پہلے میرے چہرے پر لال لال موٹے موٹے دانے نکلنے شروع ہوئے اور ساتھ ہی بالوں نے بھی گرنا شروع کر دیا۔ جبکہ میرے بال جو بالکل سیاہ کالے اور گھنے نیچے تک چٹیا لٹکتی تھی اب گر کر بالکل شانوں تک آ گئے ہیں۔ دانوں کی وجہ سے چہرہ بدنما لگتا ہے۔ بالوں اور چہرے کی وجہ سے خوبصورتی متاثر ہو رہی ہے۔ میں نے پشاور میں اسکن اسپیشلسٹ ڈاکٹروں سے علاج کروایا ہے لیکن فرق نہیں آیا ہے۔ دانے چہرے پر لال لال اور ان میں پیپ بھی ہوتی ہے جو پہلے چھوٹا اور بعد میں بڑا ہو کر چہرے پر بدنما گڑھا چھوڑ دیتا ہے۔ ان دونوں مسئلوں کا علاج بتائیں۔ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔

جواب: صبح سویرے سورج نکلتے ہوئے 15 منٹ کے لیے دھوپ میں بیٹھیں۔ اس طرح کہ جسم کا زیادہ سے زیادہ حصہ دھوپ کے اثر میں آئے۔ تازہ ہوا میں چہل قدمی کریں۔ اللہ سے دعا بھی کریں۔ مدد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کرتا ہے اور کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک دن چھوڑ کر بالوں کو ہمارے والے شیمپو سے دھوئیں اور ہمارے والے فیس واش سے منہ روزانہ 5 مرتبہ دھوئیں۔ دانوں کو کھجائیں نہ بلکہ کاٹن کے کپڑے سے ہلکے ہلکے سہلایا کریں۔ کھانے میں تیز مرچ مصالحوں اور مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔ شوربہ چپاتی بہتر رہے گا۔ سبزیوں اور پھلوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ مرغی بالکل بھی استعمال نہیں کرنی خصوصاً فارم کی۔ کولڈ ڈرنک اور کسی بھی قسم کا کوئی شربت استعمال نہ کریں۔ ستو لسّی اور تازہ پھلوں کا جوس لے سکتی ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیں۔ Calc.sulph-30 ،Belladona-30 اور Graphites-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی

میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

ذہنی خلفشار

مدیحہ......شیخوپورہ

حافظہ بہت کمزور ہو چکا ہے۔ بات کرتے ہوئے بھول جاتی ہوں۔ چارٹرڈ اکاؤنٹ کی طالبہ ہوں اور پڑھائی پر ٹھیک سے دھیان نہیں دے پاتی جو یاد کرتی ہوں بھول جاتی ہوں۔ گھٹنوں میں درد ہوتا ہے۔ نماز پڑھتے وقت ٹانگیں فولڈ کر کے دوبارہ سیدھی کرنے پر کڑاکے نکلتے ہیں۔ معدے میں تیزابیت بھی ہو جاتی ہے۔ اکثر سر سُن ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کانوں میں سیٹی کی سی آواز ہوتی ہے۔ بات کرتے کرتے بھول جاتی ہوں۔

جواب: ذہن پر بہت بوجھ ہے۔ گھر کا ماحول کیسا ہے؟ سہیلیاں کیسی ہیں؟ متوازن غذا لیں۔ غذا کو چبا کر کھائیں اور کھانے کے ڈھائی گھنٹے بعد تک پانی یا مشروب کا استعمال نہ کریں۔ دودھ [illegible] کا استعمال بڑھائیں۔ بالوں کے لیے ہمارا شیمپو استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ادویات ایک ماہ استعمال کے بعد دوبارہ کیفیت سے مطلع کریں۔ Ancardium-30، Kali.phos-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ اور Cratex کی ایک، ایک گولی صبح و شام تھوڑے پانی کے ساتھ نگلیں۔

جلد کی گلٹیاں

فائزہ......سکھر

میرے بہت سے مسئلے ہیں۔ پچھلے کچھ مہینوں سے میرے بائیں بازو پر گلٹی بن گئی اور اس وقت وہ آہستہ آہستہ اوپر کو ابھر آئی ہے۔ اب بائیں کے ساتھ دائیں بازو میں بھی چھوٹی چھوٹی مزید گلٹیاں بن رہی ہیں۔ برائے کرم مجھے ان کے متعلق بتائیے۔ ان کے بننے کی وجہ آخر کیا ہے؟ اور ان کا علاج بھی تجویز کر دیں۔ دوسرا مسئلہ مجھے لیکوریا کا ہے جو کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ تقریباً 5 سال سے ہے۔ اس کے علاوہ میرے ہاتھ اور پیر اور باقی جسم بہت جلدی سُن ہو جاتا ہے۔ اگر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہوں تو۔ 2 سال پہلے تک میری جلد بہت فریش ہوا کرتی تھی لیکن اب ہر وقت خشک رہتی ہے اور عجیب سی الرجی سی رہتی ہے چہرے پر۔ بال بھی بہت خشک رہتے ہیں اور خشکی کی وجہ سے گرتے بھی ہیں۔ برائے کرم مجھے تفصیلاً علاج بھی بتائیں اور غذا کے بارے میں بھی رہنمائی کریں۔

جواب: ہمارے جسم میں چربی بعض اوقات گلٹیوں کی صورت میں جمع ہونے لگتی ہے جسے Adipose Tissue کہتے ہیں۔ اگر ان میں درد نہیں ہے تو ایک اچھی بات ہے۔ یہ سائز اور تعداد میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ چکن خصوصاً فارم کی نہ ہونے کے برابر استعمال کریں جبکہ گائے، بکرے اور مچھلی کا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔ سبزیوں اور فروٹ کا استعمال زیادہ کریں۔ کھانے میں پہاڑی نمک ضرور استعمال کیا کریں۔ لیکوریا کے متعلق یہ نہیں لکھا کہ وہ کب زیادہ ہوتا ہے اور اس کی حالت کیسی ہوتی ہے؟ تفصیلات لکھئے تاکہ صحیح دوا تجویز کی جاسکے۔ البتہ گلٹیوں کے لیے آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc.iod-3X کے 5-5 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھے کپ پانی میں ڈال کر پئیں۔

پتھریاں اور معدے و جگر کی خرابی

امارہ......لاہور

میں عرصہ دراز سے ماہنامہ پاکیزہ کی قاری ہوں۔ آپ ہر ماہ مریضوں کو مشورے دیتے رہتے ہیں اور لوگ شفایاب بھی ہو رہے ہیں۔ میرے والد بھی ضعیف ہیں۔ عمر 76 سال ہے۔ مثانہ میں پتھریاں ہیں۔ آج سے سات آٹھ سال پہلے چھوٹی چھوٹی تھیں مگر اب بڑی ہو گئی ہیں۔ ایلوپیتھی میں علاج آپریشن ہی ہے۔ کئی دفعہ کئی سول اور فوجی ہسپتالوں میں گئے ہیں مگر دل کی کمزوری کی وجہ سے آپریشن نہیں ہو سکا۔ یونانی علاج کرایا تھا مگر اس

digestlibrary.com

سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو ہومیوپیتھک علاج شروع کرایا ہے۔ دو سال سے ہومیو علاج کروا رہے ہیں۔ پتھریاں نہ نکلتی ہیں اور نہ رکتی ہیں، بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں لہٰذا بہت متفکر ہیں۔ کوئی ایسی دوا تجویز فرمائیں جس سے پتھریاں ریت بن کر نکل جائیں۔ اگر یہ نہ ہو تو رک جائیں زیادہ بڑی نہ ہوں۔ سردی میں تکالیف بڑھتی ہیں، گرمی میں ٹھیک رہتے ہیں۔ خوراک میں میٹھی اور نمکین دونوں غذائیں پسند کرتے ہیں۔ مہربانی فرما کر کوئی مناسب دوا بذریعہ ماہ نامہ پاکیزہ تحریر فرمائیں۔ عین نوازش ہوگی۔

جواب: تمام قارئین نوٹ کریں کہ رپورٹس ہسٹری کے ساتھ بھیجیں کیونکہ یہ تشخیص میں مددگار ہوتی ہیں۔ آپ نے صرف مثانہ کی پتھریوں کا ذکر کیا تھا جبکہ رپورٹ کے مطابق انہیں جگر و گردے کا بھی مسئلہ ہے۔ پراسٹیٹ بھی بڑھا ہوا ہے اور صرف مثانہ میں نہیں پتے و گردے میں بھی پتھریاں ہیں۔ علاج ان کا آپریشن قطعاً نہیں بلکہ ہو بھی نہیں سکتا۔ علاج کی ترتیب بھی صحیح نہیں ہے۔ اب آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ادویات ایک ماہ تک استعمال کریں پھر الٹراساؤنڈ اور Urine D/R کی رپورٹ کے ساتھ مریض کا حال تفصیل کے ساتھ لکھ کر بھیجیں۔ Berberis Vulg-Ø، Chelidonium-Ø کے 10-10 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ اور Merc cor-30 کے 5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔ پانی کم از کم 12 گلاس بشمول دوا کے ساتھ پلائیں۔ پیشاب فوراً کریں۔ روکیں نہیں۔ پتھریوں کی وجہ سے گردے و مثانہ خراب ہو رہے ہیں۔ یہ معاملہ کنٹرول ہو تو پھر پراسٹیٹ و جگر کو بھی دیکھیں گے۔ پالک، چاول، ٹماٹر، مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔

نظر کی کمزوری

عطیہ...... فیصل آباد

گزشتہ دو سال سے 6 نمبر کے گلاسز استعمال کر رہی ہوں۔ ہومیوپیتھک علاج سے نمبر میں کمی یا عینک سے چھٹکارا ممکن ہے تو پلیز تجویز کر دیجیے۔ میرے ہونٹ سیاہی مائل ہیں اور کبھی تو بالکل کالے نظر آتے ہیں۔ جبکہ خوراک نارمل لیتی ہوں۔ پیٹ بھر کر کھانا میسر ہے مگر روزانہ پھل کھانا ممکن نہیں۔ رنگت گندمی اور چہرے پر دانے ہیں۔ میرا بنیادی مسئلہ چہرے پر اضافی بالوں کا ہونا ہے۔ ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کی طرح زیادہ اور موٹے بال ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹھوڑی پر بھی موٹے بال ہیں اور قلمیں لمبی ہیں اور سر میں کچھ سفید بال ہیں جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ اپر لپس کے لیے اسکن اسپیشلسٹ کے پاس گئی تھی۔ انہوں نے رپورٹ کروانے کے بعد ٹریٹمنٹ کے لیے کہا تھا جو کہ نہیں کروایا اور انہوں نے کوئی دوا نہیں دی تھی۔ رپورٹس بھیج رہی ہوں۔ نظر میں بھی اضافہ ہو چکا ہے۔ میری صحت مجموعی طور پر اچھی ہے مگر قبض رہتا ہے۔

جواب: متوازن غذا استعمال کریں، ورزش کیا کریں، ذہنی دباؤ سے نجات حاصل کریں، خون کا ٹیسٹ Blood HB% کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیں یا آ کر ملیں۔ Natr mur-30، Calc phos-30، Calc.flour-30، Physostigma-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

Dr.Willmar Schwabe Germany
Available at All Medical & Homoeopathic Stores
شوابے سنگل ریمیڈیز گھر بھر کی صحت کے لیے کلاسیکل ہومیوپیتھی
digestlibrary.com